إن الله وملائكته يصلون على النبي يا أيها الذين آمنوا صلوا عليه وسلموا تسليما

کتاب مستطاب

سیرۃ النبی ﷺ

یعنی

سوانح اقدس حضرت سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

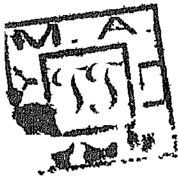
جلد پنجم

مشتمل بر منصبِ نبوت حصۂ عبادات،

جس میں پہلے عبادت کا مفہوم بتایا گیا ہے، پھر نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد، تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر، اور شکر وغیرہ جانی ومالی وقلبی عبادات کی تشریح، اور انکے احکام ومصالح کی توضیح کی گئی ہے،

تالیف

سید سلیمان ندوی،



باہتمام مسعود علی ندوی

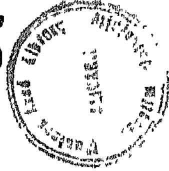
طبع دوم در مطبع معارف شہر اعظم گڈھ مطبوع گردید

۱۳۵۷ھ

۱۹۳۸ء



فہرست مضامین سیرۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم جلد پنجم



بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع دوم

سیرۃ النبیؐ کی یہ پانچوین جلد جب ۱۳۵۴ھ مین بڑی تقطیع پر چھپی تھی، اس وقت سے لوگون کا تقاضا تھا کہ اس کی چھوٹی تقطیع بھی جلد شائع ہو، مگر نظر ثانی کے لئے مجھے وقت نہین ملتا تھا اس لئے یہ کام جلد انجام نہ پاسکا، اب جب اس سے فرصت ملی اور بعض دوستون نے اس کام مین میرا ہاتھ بٹایا، تو تین برس مین یہ کام انجام کو پہنچا، بعض فروگذاشتین جو طبع اول مین ہوگئی تھین ان کی اصلاح کردی گئی ہے، پھر بھی عصمت کا دعوی کون کرسکتا ہے، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ میری لغزشون سے درگذر فرمائے، اور میری لغزشون کو دوسرے کی لغزشون کا سبب نہ بنائے، رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا،

داعی

سید سلیمان ندوی
دار المصنفین اعظم گڈھ
۲۴ جمادی الاولی ۱۳۵۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

دیباچہ

سیرۃ النبی صلعم کی چوتھی جلد ربیع الاول ۱۳۴۵ھ مین شائع ہوئی تھی، آج تین ۳ سال کے بعد اُس کی پانچوین جلد آپ کی خدمت مین پیش کیجا رہی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہ اپنے ایک گنہگار بندہ سے اپنے دین کا ایک کام لے رہا ہے، اور اپنے بندون کے دلون کو اُس کے حسنِ قبول کے لئے کھول دیا ہے،

موضوع اس جلد کا موضوع عبادت ہے، اس مین عبادت کی وہ حقیقت، اور اسلام مین اُس کے وہ اقسام و انواع اور اُن مین سے ہر ایک کی وہ مصلحت و حکمت اور اس باب مین گذشتہ مذاہب کے اسباق کی وہ تکمیل جو ذاتِ پاکِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا پر ظاہر ہوئی، ایک خطاکار قلم نے لکھی اور بیان کی ہے، اپنی کوشش تو یہی رہی ہے کہ قدم اس راستہ سے نہ ہٹے، جو صراطِ مستقیم ہے، اور وہ سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے جو ہر مسلمان کا عروۃ الوثقیٰ

ہی، تاہم وہی کہتا ہون جو بعض صحابہؓ اور اکابر کہتے (خدا اُن سے راضی ہو) فرمایا، کہ جو بات کہی گئی ہی اگر صحیح ہے تو وہ خدا کی طرف سے ہے، اور غلط ہے تو نفس خطا کار کا قصور ہی؛

ان جلدون کا سیرت سے تعلق

ہر چند کہ اس کتاب کے ضمن مین یہ بات کئی دفعہ دہرائی گئی ہی کہ اس سلسلہ کا تعلق صرف مغازی اور سیر کے واقعات سے نہین جن کو عام طور سے سیرت کہتے ہین، بلکہ اسلام کے پیغام اور اسلام کے پیغام لانے والے دونون سے یکسان ہے، صاف لفظون مین یون کہنا چاہیئے کہ اس سلسلہ کا مقصد ان دو سوالون کا جواب ہی، اسلام کا پیغمبر کون تھا، اور وہ کیا لایا تھا سیرت کی شروع کی تین جلدین پہلے سوال کا جواب تھین، اور باقی جلدین دوسرے سوال کا جواب ہین،

اس سلسلہ کی ترتیب اور تکمیل مین مین نے امکان بھر اُس خاکہ کی پیروی کی ہے جس کا خیال حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو تھا، اُن زبانی بیانون اور تلقینون کے علاوہ جو اپنی مجلس کی گفتگو مین فرمایا کرتے تھے، وہ خود اپنے مکتوبات مین لکھتے ہین،

> چاہتا ہون کہ ہر قسم کے مباحث سیرت مین آجائین یعنی تمام مہمات مسائل پر ریویو، قرآن مجید پر پوری نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلو پیڈیا، اور نام بھی دائرۃ المعارف النبویہ موزون ہوگا گو لمبا ہے، اور ابھی مین نے فیصلہ نہین کیا، (بنام مولٰنا حبیب الرحمان خان شروانی ۱۹۱۲ء)

سیرۃ جلد اول کے مقدمہ مین انھون نے ان حصون کا عنوان منصب نبوت رکھا تھا، اور لکھا

> دوسرا حصہ منصب نبوت سے متعلق ہے، نبوت کا فرض تعلیم عقائد، اوامر و نواہی، اصلاح اعمال، اور اخلاق ہے، اس بنا پر منصب نبوت کے کامون کی تفصیل اس حصہ مین کی گئی ہے، اس حصہ

مین فرائضِ خمسہ، اور تمام اوامر و نواہی کی ابتدا، اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ، اور اُن کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ اور موازنہ ہے، اسی حصہ مین نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہو کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے، اور ان مین کیا کیا اصلاحین عمل مین آئین، نیز یہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا، اور کیونکر وہ تمام عالم کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔" (جلد اوّل طبع اوّل ص۸۷ و طبع دوم ص۹۷)

گذشتہ چوتھی جلد، یہ پانچوین جلد اور آیندہ دو جلدین درحقیقت اسی منصب نبوت کے مباحث کی تفصیل و تشریح ہین، منصبِ نبوت، عرب کی گذشتہ حالت، اور تعلیم عقائد، چوتھی جلد کا موضوع تھی، اور فرائضِ خمسہ، ان کی مصلحتین اور حکمتین اس جلد کا عنوان ہے، اخلاق و معاشرت کے تکنون کے لئے چھٹی جلد، اور بقیہ اوامر و نواہی کے لئے جو معاملات سے متعلق ہین، ساتوین جلد ہوگی، ان مین سے ہر موضوع کی تفصیل و تشریح مین مصنفِ اوّل کے ایما کے مطابق قرآنِ مجید پر پوری نظر رکھی جاتی ہے، ان کی تدریجی تاریخ پیشِ نظر رہتی ہے، اُن کی مصلحتون اور حکمتون سے پردہ اٹھایا جاتا ہے، دوسرے مذہبون سے مناظرانہ پہلو کو بچا بچا کر مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے، اور ہر ایک بحث کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسلام نے اس باب مین کیا تعلیم پیش کی ہے، اور وہ کیونکر تمام عالم کی اصلاح کے لئے کافی ہے،

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاد "مرا" گفت ہماں می گویم

حسنِ قبول — اللہ پاک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے اُس سلسلہ کو حسنِ قبول کی سند عطا فرمائی،

قبولِ خاطر دلہا خداداد ست می دانم

اس کتاب کی پہلی ہی جلد شائع ہوئی تھی کہ ایک مقدس بزرگ نے جن کے ساتھ مجھے پوری عقیدت تھی، اور جن کی زبان سے استحقاق کے باوجود کبھی مدعیانہ فقرہ نہین نکلا، مجھ سے فرمایا "یہ کتاب وہان قبول ہوگئی" اُن کے اس ارشاد کی تصدیق زمانہ کے واقعات سے ہوگئی وہ علاوہ اس کے کہ اس کی ہر جلد کے کئی کئی اڈیشن شائع ہوچکے، ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے مسلمانون مین اس کے ساتھ خاص شیفتگی اور عقیدت پیدا ہوگئی، ترکی مین اس کی تین جلدون کا ترجمہ قسطنطنیہ سے شائع ہوا، فارسی مین اس کی چند جلدین کابل مین ترجمہ کی گئین، اور اب تک منتظرِ طبع ہین، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عربی مین مکہ معظمہ مین اس کے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا ہے،

اس کی قبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے، کہ اس کی پہلی اشاعت کے وقت سے لیکر آج تک اُس زبان مین جس مین اس موضوع پر کوئی قابلِ توجہ کتاب نہ تھی چھوٹی بڑی سینکڑون کتابین نئے نئے دعوون کے ساتھ اس کو سامنے رکھ رکھ کر لوگ لکھ رہے ہین، اور سیرت کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہماری زبان مین بحمد اللہ پیدا ہوگیا ہے، اور اس کی تعلیم و مطالعہ اور اشاعت کی طرف مسلمانون کا عام رجحان ہوگیا ہے،

امراے اسلام کی امداد

اس کتاب کے حسنِ قبول کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ مصنفِ مرحوم نے اس کی [illegible] تصنیف کا خاکہ جونہی شائع کیا اس کی خدمت کے لئے لبیک کی سب سے پہلی آواز اس محترمہ کی زبان سے نکلی جس کا ہر تارِ نفس محبتِ رسول صلعم کے دامن سے وابستہ تھا، ملّتِ محمدی کی خادمہ، اور اُمّتِ محمدی کی مخدومہ تاج الہند نواب سلطان جہان بیگم [illegible]

فرمانروائے کشور بھوپال (خدا اُن پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے) نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنف کی وفات پر خیال گذرا کہ شاید یہ توجہ ہمایونی باقی نہ رہے، مگر فرمایا کہ یہ کام اس مصنف کے لئے نہ تھا جو مرچکا، بلکہ اس خدا کے لئے تھا جس کو موت نہیں، اس لئے اپنی شاہانہ ماہوار امداد برابر جاری رکھی مصنف نے سیرت کی تصنیف کے متعلق ایک قطعہ لکھا تھا،

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت ۔۔۔ کہ ابر فیض سلطان جہان بیگم زر افشان ہے
رہی تالیف و تنقید روایتہائے تاریخی ۔۔۔ تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جان ہے

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جن میں اک فقیر بینوا ہے ایک سلطان ہے

جب اس "فقیر بے نوا" کی وفات ہوئی، تو سرکار عالیہ نے بڑے درد سے فرمایا تھا کہ "فقیر بینوا تو چل بسا، اب سلطان کی باری ہے" آخر یہ سلطان بھی چل بسی، اور تالیف و تنقید تیہوا کے ساتھ ساتھ "زر افشانی" کے کام کی ناتمامی کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا، مگر خدا کا شکر ہے کہ فردوس مکانی نے اپنا سچا جانشین یادگار چھوڑا، وہ تاج و تخت ایک ایسے جوان بخت کے سپرد کر گئیں جس نے فرائض حکومت کی گرانباری کے ساتھ ساتھ اُن کے ناتمام کارناموں کی تکمیل کا بوجھ بھی اٹھالیا، اور سیرۃ النبی صلعم کی تالیف کی امداد میں وہی توجہ مبذول رکھی، سکندر صولت افتخار الملک حضور نواب حاجی حمید اللہ خان بہادر فرمانروائے بھوپال کی عمر و دولت و اقبال میں اللہ تبارک و تعالیٰ شانہ برکت عطا فرمائے کہ اُن کے زیر سایہ امت و ملت کی سینکڑوں آرزوئیں پرورش پا رہی ہیں، خلد اللہ ملکہ،

۱۳۳۶ھ ۱۹۱۸ء مین سیرت کی پہلی جلد جب چھپکر شائع ہوئی، تو جامع نے اس کا ایک نسخہ اعلیٰحضرت آصفجاہ سابع مظفر الملک والممالک نظام الدولہ نظام الملک سلطانِ دکن خلد اللہ ملکہ کی پیشگاہِ خسروی مین پیش کیا حضور ممدوح کو اپنے مولیٰ و آقا حضرت سرور کائنات، فخرِ موجودات سید المرسلین محبوبِ رب العالمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ علیہ الوف التحیات والصلوٰۃ کی ذات قدسی آیات سے والہانہ عقیدت ہی، سیرت کی پہلی جلد پڑھ کر بہت مسرور و محظوظ ہوئے اور دوسری جلدون کے جلد چھپ جانے کی غرض سے دو دو برس کے لئے تین دفعہ اور تین برس کیلئے ایک دفعہ دو سو ماہوار جاری فرمائے، جن سے پچھلے برسون مین جب ملک کی اقتصادی حالت نے ہم کو خطرہ مین پھنسا دیا تھا بیحد مدد ملی،

اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہِ بے نیاز مین التجا ہے کہ وہ باقی جلدون کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے، عمر کا رہوار زندگی کی پچاس سے زیادہ منزلین طے کر چکا، جو کچھ باقی ہے، دعا ہے کہ وہ بھی اسی سفر مین گذر جائے، اور آخر مین خوش قسمت سعدی کی طرح ہمین بھی یہ کہنے کا موقع ملے

منزل تمام گشت و بپایان رسید عمر ... ما ہمچنان در اولِ وصفِ تو ماندہ ایم

مؤلف

سید سلیمان ندوی

شبلی منزل، اعظم گڈھ

۲۳ رجب ۱۳۵۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عملِ صالح

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم جس تعلیم کو لے کر آئے، اُس کا بنیادی مسئلہ یہ ہی کہ انسان کی نجات و فلاح دو چیزون پر موقوف ہے، ایک ایمان، اور دوسری عملِ صالح، کتاب سیرۃ النبی کی گذشتہ چوتھی جلد ایمان کی شرح و توضیح مین تھی، اب یہ پیشِ نظر حصہ عملِ صالح کی تشریح و بیان مین ہے، ایمان بنیادی اصولون پر یقینِ کامل رکھنے کا نام ہے، اور عملِ صالح ان اصولون کے مطابق عمل کا، کسی بات کا تنہا علم و یقین کامیابی کیلئے کافی نہین، جب تک اُس علم و یقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو،

اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو ان ہی دو چیزون یعنی ایمان و عملِ صالح پر مبنی

قرار دیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ عوام میں ایمان کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ عمل صالح کو نہیں
حالانکہ یہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت سے عملاً یکساں اہمیت رکھتے ہیں، فرق صرف اتنا
کہ ایمان بنیاد ہے، اور عمل صالح اس پر قائم شدہ دیوار یا ستون، جس طرح کوئی عمارت بنیاد کے
بغیر قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح وہ دیوار یا ستون کے بغیر کھڑی بھی نہیں ہوسکتی،

ان دونوں کی بہترین مثال اقلیدس کے اصول اور اشکال کی ہے، ایمان کی حیثیت اصول
موضوعہ اور اصول متعارفہ کی ہے جن کو صحیح مانے بغیر اقلیدس کی شکلوں کا ثبوت محال ہے لیکن اگر
صرف اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کو تسلیم کر لیا جائے اور ان کے مطابق شکلوں کا عمل نہ
جائے، تو فن تعمیر و ہندسہ اور مساحت و پیمائش میں اقلیدس کا فن ایک ذرہ کارآمد نہیں ہو
اور نہ اس سے انسان کو وہ فائدے حاصل ہوسکتے ہیں، جو اس فن سے اصل مقصود ہیں،

عوام کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس بارہ میں قرآن پاک کی تعلیم
کو تفصیلاً پیش کیا جائے، قرآن پاک نے انسان کی فلاح و کامیابی کے ذریعہ کو بیسیوں آیتوں
میں بیان کیا ہے، مگر ہر جگہ بلا استثناء ایمان اور عمل صالح دونوں پر اس کو مبنی قرار دیا ہے، اور
ہر جگہ ایمان کو پہلی اور عمل صالح کو دوسری مگر ضروری حیثیت دی ہے، فرمایا،

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ	زمانہ (مع اپنی پوری انسانی تاریخ کے)
اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	گواہ ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے لیکن
(عصر - ۱)	جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے،

زمانہ کی پوری انسانی تاریخ اس حقیقت پر شاہد عادل ہے کہ ان ہی افراد اور قوموں

و فلاح اور کامیابی کے دروازے کھلے ہیں جنھیں ربانی حقائق کا یقین تھا، اور اس یقین کی
ق اُن کے عمل بھی نیک ہوتے رہے، ایک دوسری آیت میں فرمایا،

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ	بیشک ہم نے انسان کو بہترین حالت
تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ أَسْفَلَ سَافِلِيْنَ	درستی میں پیدا کیا، پھر اس کو سب سے نیچون
إِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	کے نیچے لوٹا دیا، لیکن جو ایمان لائے اور
فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝	اچھے کام کئے تو اُن کے لیے نہ ختم ہونے والی
(والتین - ۱)	مزدوری ہے،

اس آیت میں انسانی فطرت کی بہترین صلاحیت کو پھر خود انسانوں کے ہاتھوں سے
کی بدترین منزل تک پہنچ جانے کو بیان کیا گیا ہے، لیکن اس بدترین منزل کی پستی سے کون
ے جاتے ہیں، وہ جن میں ایمان کی رفعت اور عمل صالح کی بلندی ہے، یہو وسے جن کو دعویٰ
بہشت ان ہی کے ٹھیکہ میں ہے یہ فرمایا،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے
أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۔ (بقرۃ ۹)	وہی جنت والے ہیں،

یعنی جنت کا حصول نسل اور قومیت پر موقوف نہیں، بلکہ ایمان اور عمل صالح پر ہے، جو شخص
ت کی یہ قیمت ادا کرے گا، وہ اُسی کی ملکیت ہی، فرمایا،

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا	بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں
وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ	اور صابئین اور نصاریٰ جو کوئی اللہ

بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (مائدہ ۔ ۱۰)

اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے، نہ تو اُن پر ڈر ہے، نہ وہ غم کھائیں گے،

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ فلاح ونجات کا حصول کسی نسل و قومیت پر موقوف نہ کسی مذہب وملت کی طرف رسمی نسبت پر ہے، بلکہ احکام الٰہی پر یقین لانے، اور اُن پر عمل کرنے پر ہے، عدم ایمان اور بدکاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی، اور ایمان اور نیکی کا نتیجہ دین و دنیا کی بہتری، اللہ تعالیٰ کا وہ طبعی قانون ہے جس میں نہ کبھی بال برابر فرق نہ ہوگا، چنانچہ ذوالقرنین کی زبانی یہ فرمایا،

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُہٗ ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی رَبِّہٖ فَیُعَذِّبُہٗ عَذَابًا نُّکْرًا، وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَہٗ جَزَآءَ نِ الْحُسْنٰی (کہف ۔ ۱۱)

اس نے کہا جو کوئی گناہ کا کام کرے گا تو ہم اس کو (دنیا میں) سزا دینگے، پھر وہ اپنے رب کے پاس لوٹا کر جائیگا تو اس کو بری طرح سزا دے گا، اور جو کوئی ایمان لایا اور نیک عمل کئے تو اس کے لئے بدلہ کے طور پر بھلائی ہے،

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا کُفْرَانَ لِسَعْیِہٖ ج وَاِنَّا لَہٗ کَاتِبُوْنَ، (انبیاء ۔ ۷)

تو جو کوئی نیک عمل کرے، اور وہ مومن بھی ہو تو اس کی کوشش اکارت نہ ہوگی، اور ہم اُسکے (نیک عمل) لکھتے جاتے ہیں،

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ	تو ان کے بعد اُن کے ایسے جانشین ہوئے
اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا	جنھون نے نماز کو برباد کیا، اور نفسانی
الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ	خواہشون کی پیروی کی، تو وہ گمراہی
غَيًّا اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَ	سے ملین گے لیکن جس نے توبہ کی اور ایمان
عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ	لایا، اور نیک کام کئے تو وہی لوگ جنت
الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا،	مین داخل ہون گے، اور اُن کا ذرا سا
(مریم - ۴)	حق بھی مارا نہ جائے گا،

اس سے اور اسی قسم کی دوسری آیتون سے یہ بات ثابت ہے کہ جنت کا استحقاق دراصل ان ہی کو ہے، جو ایمان اور پھر ایمان کے مطابق عمل سے بھی آراستہ ہین، اور جو عمل سے محروم ہین وہ اس استحقاق سے بھی محروم ہین، الایہ کہ اللہ تعالیٰ بخشش فرمائے،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اور جو ایمان لائے اور نیک کام کئے وہ
فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ لَهُمْ مَّا	جنت کے باغون مین ہون گے اُن کیلئے
يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ	اُن کے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ
هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ، ذٰلِكَ	چاہین یہی بڑی مہربانی ہے، یہی وہ ہے
الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ	جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندون
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ط	کو دیتا ہے جو ایمان لائے اور نیک
(شوریٰ - ۳)	عمل کئے،

دوسری جگہ فرمایا،

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	بے شک جو ایمان لائے اور نیک
کَانَتْ لَھُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ	عمل کئے، اُن کی مہمانی کے لئے باغ
نُزُلًا (کہف-۱۲)	فردوس ہین،

پھر آگے چل کر فرمایا،

فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّہٖ	تو جس کو اپنے پروردگار سے ملنے کی اُمید
فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشْرِکْ	ہو تو چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور
بِعِبَادَةِ رَبِّہٖٓ اَحَدًا ، (کہف-۱۲)	کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ بنائے،

ایمان کے ہوتے عمل سے محرومی تو محض فرض ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہان عمل کی کمی ہے، اسی کے بقدر ایمان مین بھی کمزوری ہے، کسی چیز پر پورا پورا یقین آجانے کے بعد اس کے برخلاف عمل کرنا، انسانی فطرت کے خلاف ہے، آگ کو جلانے والی آگ یقین کر لینے کے بعد کون اس مین اپنے ہاتھ کو ڈالنے کی جرأت کرسکتا ہے لیکن نادان بچہ جو ابھی آگ کو جلانے والی آگ نہین جانتا وہ بارہا اس مین ہاتھ ڈالنے کو آمادہ ہو ہو جاتا ہے، اس لئے عمل کا قصور ایمان کی کمزوری کا راز فاش کرتا ہے،

یہی سبب ہے کہ تنہا ایمان، یا تنہا عمل کو نہین، بلکہ ہر جگہ دونون کو ملا کر نجات و فلاح کا ذر[یعہ]

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیْ	تو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے
جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۔ (حج-۷)	وہ آرام کے باغون مین ہونگے۔

اسی طرح قرآن پاک میں تھوڑے تھوڑے تغیر سے ۵۰ موقعوں پر یہ آیت ہے،

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ — جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے

اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایمان اور عمل باہم ایسے لازم و ملزوم ہیں، جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوسکتے، اور نجات اور فوز و فلاح کا مدار ان دونوں پر یکسان ہے، البتہ اس قدر فرق ہے کہ رتبہ میں پہلے کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے،

جن مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے دنیاوی حکومت و سلطنت کا وعدہ فرمایا ہے وہ بھی وہی ہیں جن میں ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ — تم میں سے اُن سے جو ایمان لائے اور
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ — نیک کام کئے خدا نے وعدہ کیا کہ اُن کو
فِى الْاَرْضِ، (نور - ۷) — زمین کا مالک بنائے گا،

آخرت کی مغفرت اور روزی کا وعدہ بھی ان ہی سے تھا،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا — اللہ نے ان میں سے اُن سے جو ایمان
الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا — لائے اور نیک کام کئے بخشایش اور
عَظِيْمًا، (فتح - ۴) — بڑی روزی کا وعدہ کیا،

بعض آیتوں میں ایمان کے بجائے اسلام یعنی اطاعت مندی، اور عمل صالح کی جگہ احسان یعنی نیکوکاری کو جگہ دی گئی ہے، مثلاً ایک آیت میں یہود و نصاریٰ کے اس دعوےٰ کی تردید میں کہ بہشت میں صرف وہی جائیں گے، فرمایا،

بَلٰی مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ	کیون نہین، جس نے اپنے کو اللہ کے تابع
مُحۡسِنٌ فَلَهٗۤ اَجۡرُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ	کیا، اور وہ نیکوکار رہی، تو اُس کی مزدوری
وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ	اس کے پروردگار کے پاس ہے، نہ
يَحۡزَنُوۡنَ ، (بقرہ - ۱۳)	ڈر ہے اُن کو اور نہ غم،

ان تمام آیتون سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے، کہ نجات کا مدار صرف ایمان پر نہین، بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح پر ہے، اور یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے جس سے اسلام سے پیشتر مذاہب مین افراط اور تفریط نمایان تھی، عیسائیون مین جیسا کہ پال کے خطوط[1] مین ہے صرف ایمان پر نجات کا مدار ہے، اور بودھ دھرم مین صرف نیکوکاری سے نروان کا درجہ ملتا ہے اور کہین صرف گیان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے، مگر پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام نے انسان کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عمل صالح) دونون اعمال کو ملا کر قرار دیا ہے یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہو، اس کو ایمان کہتے ہین، پھر یہ کہ ان اصولون کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو، یہ عمل صالح ہے، اور ہر قسم کی کامیابیون کا مدار انہی دو باتون پر ہے، کوئی مریض صرف کسی اصول طبی کو صحیح ماننے سے بیماریون سے نجات نہین پا سکتا جب تک وہ اُن اصولون کے مطابق عمل بھی نہ کرے، اسی طرح صرف اصول ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کے لئے کافی نہین، جب تک اُن اصولون کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے،

---

[1] رومیون کے نام ۳ و ۴،

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ	وہ ایمان والے مراد کو پہنچے، جو نماز مین
فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ، وَالَّذِيْنَ	عاجزی کرتے ہین، جو نکمی باتون کی طرف
هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ، وَالَّذِيْنَ	رُخ نہین کرتے، جو زکوٰۃ دیتے ہین،
هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ، وَالَّذِيْنَ	جو اپنی شرمگاہون کی حفاظت کرتے
هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ......	ہین،.........
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ	اور جو اپنی امانتون اور اپنے عہد کا پاس
رَاعُوْنَ، وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ	کرتے ہین، جو اپنی نمازون کے پابند
يُحَافِظُوْنَ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ (مومنون-۱)	ہین، یہی بہشت کے وارث ہین،

اس دنیا مین اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ہمارے مادّی عمل و اسباب کے تابع فرمایا ہے، یہان کی کامیابی اور فوز و فلاح بھی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہین ہو سکتی، جب تک اس عقیدہ کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے، صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی علاج ہے، ہماری بھوک دفع نہین ہو سکتی، بلکہ اس کے لئے ہم کو جد و جہد کرکے روٹی حاصل کرنا اور اس کو چبا کر اپنے پیٹ مین نگلنا بھی پڑے گا، اس عقیدہ سے کہ ہم کو ہماری ٹانگین ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتی ہین، ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ نہین سکتے، جب تک اس یقین کے ساتھ ہم اپنی ٹانگون کو بھی خاص طور سے حرکت نہ دین، یہی صورت ہمارے دوسرے دنیاوی اعمال کی ہے، اسی طرح اس دنیا مین عمل کے بغیر تنہا ایمان کامیابی کے حصول کے لئے بیکار ہے، البتہ اس قدر صحیح ہے کہ جو ان اصولون کو صرف صحیح باور کرتا ہے،

وہ اُس سے بہر حال بہتر ہے، جو اُن کو سرے سے نہیں مانتا، کیونکہ اوّل الذکر کے کبھی نہ کبھی راہِ راست پر آجانے اور نیک عمل بجانے کی اُمید ہو سکتی ہے، اور دوسرے کے لئے تو اوّل پہلی ہی منزل باقی ہے، اس لئے آخرت میں بھی وہ منکر کے مقابلہ میں شاید اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا زیادہ مستحق قرار پائے کہ کم از کم وہ اس کے فرمان کو صحیح باور تو کرتا تھا،

اعمالِ صالحہ کی قسمیں | "عملِ صالح" کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس کے اندر انسانی اعمالِ خیر کے تمام جزئیات داخل ہیں، تاہم اُن کی عملی تقسیمات حسبِ ذیل ہیں، عبادات، اخلاق، معاملات

اسلام میں لفظ **عبادت** کو بڑی وسعت حاصل ہے، اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے جس کی غرض خدا کی خوشنودی ہو، اس لئے اخلاق و معاملات بھی اگر اس خوش نیتی کے ساتھ کئے جائیں تو وہ عبادات میں داخل ہیں، مگر فقہاء نے اصطلاحاً یہ تین الگ الگ اور مستقل ابواب قرار دیئے ہیں جن کی تفصیل یوں کیجاسکتی ہو کہ اوّلاً اعمالِ صالحہ کی دو قسمیں ہیں، ایک جس کا تعلق خاص خدا سے ہو اُس کو عبادت کہتے ہیں، دوسری وہ جس کا تعلق بندوں سے ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسانی فرض کی ہوتی ہے، اور دوسری وہ جس میں قانونی ذمہ داری کی حیثیت ملحوظ ہوتی ہے، پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا معاملات ہے،

اعمالِ صالحہ کی ان ہی تینوں قسموں کی تفصیل و تشریح سیرۃ النبیؐ کی موجودہ اور آیندہ جلدوں کا موضوع ہے،

عبادات

یَا اَیُّہَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ (بقرہ ۳)

عبادات کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص اعمال سمجھے جاتے ہین جن کو انسان خدا کی عظمت اور کبریائی کی بارگاہ مین بجالاتا ہے، لیکن یہ عبادات کا نہایت تنگ مفہوم ہے۔ اس سلسلہ مین اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے انسانون پر جو حقیقت ظاہر فرمائی، اس کا اصل جوہر یہ نہین ہے کہ گذشتہ مذاہب کی عبادت کے طریقون کے بجائے اسلام مین عبادت کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے، بلکہ یہ ہے کہ انسانون کو یہ بتایا گیا کہ عبادت کی حقیقت اور غایت کیا ہے، ساتھ ہی عبادات کے گذشتہ ناقص طریقون کی تکمیل، مبہم بیانات کی تشریح، اور مجمل تعلیمات کی تفصیل کیگئی۔

اہل عرب جہان آسمانی مذہب کی دوسری حقیقتون سے بیخبر تھے، وہان عبادت کے مفہوم و معنی اور اُس کے صحیح طریقون سے بھی ناواقف تھے، عرب مین جو یہود اور عیسائی تھے، وہ بھی اس کے متعلق اپنے عمل اور تعلیم سے کوئی واضح حقیقت اُن کے سامنے پیش نہ کر سکے

تھے، اس عہد میں جو عیسائی فرقے عرب میں تھے، عقائد میں اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ حضرت مسیح کی الوہیت کو تسلیم کرتے تھے، اور عبادات میں یہ تھا کہ تمام دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر کے عرب کے سنسان بیابانوں اور پہاڑوں میں انھوں نے اپنی تنگ عبادت گاہیں اور خانقاہیں بنالی تھیں، اور اُن میں بیٹھکر تمام دنیا کی جدّ و جہد اور سعی و کوشش کے میدانوں سے ہٹ کر مجرّد اور متقشفانہ زندگی بسر کرتے تھے، اسی لئے عربوں کی شاعری میں عیسائیت کا تخیل ایک "راہب متبتّل" کی صورت میں تھا، عرب کا سب سے بڑا شاعر امرء القیس کہتا ہے،

منارةُ ممسی راهبٍ متبتّلِ — دنیا سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنے والے راہب کا شام کا چراغ،

عرب میں یہود اپنی اخلاقی اور مذہبی بدعملیوں کے سبب سے سخت بدنام تھے، ان میں روحانی خلوص و ایثار اور خدا پرستی نام کو نہ تھی، وہ صرف سبت (سنیچر) کے دن تورات کے حکم کے مطابق تعطیل منانا اور اُس دن کوئی کام نہ کرنا بڑی عبادت سمجھتے تھے، قرآن پاک نے ان دونوں فرقوں کی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے، یہودیوں پر اُس نے بے حکمی، نافرمانی، اکل حرام اور طاغوت کی پرستش کا اور عیسائیوں پر غلو فی الدین کا صحیح الزام قائم کیا ہے[1]،

یہودی جادو، ٹوٹکے اور عملیات کے توہمات میں گرفتار تھے اور جب کبھی موقع ملتا غیر قوموں کے بتوں کے سامنے بھی سر جھکا لیتے تھے، عیسائی حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰ مسیحؑ اور اولیاء اور شہیدوں کی تصویروں، مجسموں، یادگاروں اور مقبروں کو پوجتے تھے، انھوں نے راہبانہ عبادت کے نئے نئے اور جسم کو سخت تکلیف اور آزار پہنچانے والے طریقے ایجاد کئے تھے

[1] دیکھو سورۂ مائدہ رکوع ۹ و ۱۰، ۱۱، اور سورۂ حدید رکوع ۴۔

اوران کا نام انھون نے دینداری رکھا تھا سورۂ حدید مین قرآن پاک نے یہود اور نصاری دونون کو فاسق کہا ہے، لیکن ان دونون کے فسق مین نہایت نازک فرق ہے، یہود کا فسق دین مین کمی اور سستی کرنا، اور نصاری کا فسق، دین مین زیادتی اور غلو کرنا تھا، اور خدا کے مشروع دین مین کمی اور زیادتی دونون گناہ ہین، اسی لئے قرآن نے دونون کو برابر کا فسق قرار دیا،

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ
وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ
وَالْكِتَابَ فَمِنْهُم مُّهْتَدٍ وَكَثِيرٌ
مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ۝ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ
آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى
ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ
وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ
رَأْفَةً وَرَحْمَةً ۚ وَرَهْبَانِيَّةً
ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ
إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا
حَقَّ رِعَايَتِهَا ۖ فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا
مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ
فَاسِقُونَ ۝ (حدید-۴)

اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا، اور اُن کی
نسل مین نبوت اور کتاب رکھی تو اُن مین
سے کچھ راہ پر ہین، اور اکثر نافرمان ہین، پھر
اُن کے بعد اُنکے پیچھے ہم نے اپنے اور پیغمبر
بھیجے، اور مریم کے بیٹے عیسی کو بھیجا، اور اُنکو
انجیل عنایت فرمائی، اور جنھون نے عیسی
کی پیروی کی اُن کے دل مین نرمی اور
رحمدلی بنائی، اور ایک رہبانیت انھون
نے نئی چیز نکالی، جو ہم نے اُن پر نہین لکھی
تھی لیکن خدا کی خوشنودی حاصل کرنا تو
انھون نے اس رہبانیت کو بھی جیسا نباہنا
چاہئے تھا نہین نباہا، تو ان مین جو ایماندار
تھے اُن کو ہم نے ان کی مزدوری دی اور
ان مین بہت سے نافرمان ہین،

ان آیتون سے معلوم ہوا کہ عیسائی دین مین اضافہ اور افراط کے مرتکب ہوئے، اسی لئے
قرآن نے اُن کو بار بار کہا،

لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ (نساء-۲۳ و مائدہ-۱۰) اپنے دین مین غلو نہ کرو،

اُن کا سب سے بڑا غلو یہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کو جن کو صرف رسول اللہ ماننے کا حکم دیا گیا تھا اُ
ابن اللہ ماننے لگے، اور یہود کا یہ حال تھا کہ وہ خدا کے رسولون کو رسول بھی ماننا نہین چاہتے
تھے، بلکہ اُن کو قتل کرتے تھے، وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیِّیْنَ (بقرہ و آل عمران) ساتھ ہی وہ خدا ئے برحق
کو چھوڑ کر بُت پرست ہمسایہ قومون کے بتون کو پوجنے لگے تھے، چنانچہ توراۃ مین یہودیون
کی بت پرستی اور غیر خداؤن کے آگے سر جھکانے کا بار بار تذکرہ ہے، اور قرآن مین اُنکے متعلق ہے

وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ، (مائدہ-۹) اور جنھون نے شیطان کو (یا بتون کو) پوجا

آنحضرت صلعم نے عیسائیون کو تبلیغ کی،

مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ	مریم کا بیٹا مسیح ایک پیغمبر ہے اور بس اس سے
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ ۭ	پہلے اور پیغمبر گذر چکے، اور اسکی ماں ولی
وَاُمُّہٗ صِدِّیْقَۃٌ ۭ کَانَا یَاْکُلٰنِ	تھی، دونون (انسان تھے) کھانا کھاتے
الطَّعَامَ ۭ اُنْظُرْ کَیْفَ نُبَیِّنُ لَھُمُ	تھے (خدا نہ تھے) دیکھ ہم ان (عیسائیون)
الْاٰیٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ	کے لئے اس طرح کھول کر دلیلین بیان
قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ	کرتے ہین، پھر بھی دیکھ وہ کدھر اُلٹے
مَا لَا یَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّلَا	جاتے ہین، (اُن سے) کہہ کہ کیا تم خدا

نَفْعًا، وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ	کو چھوڑ کر ان (انسانون) کو پوجتے ہو
قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ	جن کے ہاتھ مین نہ نقصان ہی نہ نفع،
دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْا	اللہ ہی سننے والا اور جاننے والا ہی،
اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ	جو نفع نقصان پہنچا سکتا ہی، اے کتاب
وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ	والو! اپنے دین مین ناحق زیادتی نہ کرو
السَّبِيْلِ۔ (مائدہ - ۱۰)	اور اُن لوگون کے خیال پر نہ چلو، جو بہک گئے اور بہتون کو بہکایا اور سیدھے راستہ

اُن کی حالت یہ تھی،

اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ	خدا کو چھوڑ کر اپنے عالمون اور درویشون
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ، (توبہ ۵)	کو خدا بنا لیا تھا،

اس زمانہ مین عیسائیون کے جو گرجے اور پرستشگاہین عرب مین اور خصوصاً ملک حبش مین تھین، ان مین حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ، اور حواریون، ولیون اور شہیدون کی تصویرین، اور مجسمے نصب تھے، عبادت گذار اُن کے آگے دھیان اور مراقبہ مین سربسجود رہتے تھے، صحابہ مین سے جن لوگون کو حبشہ کی ہجرت کے اثنا مین ان معبدون کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اُن مین سے بعض بی بیون کی نگاہ مین ان بزرگون کی تعظیم و تکریم کی یہ مناسب صورت معلوم ہوتی تھی چنانچہ آنحضرت صلعم کے مرض الموت مین بعض ازواجِ مطہرات نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا، اور اُن کی تصویرون اور مجسّمون کے حسن و خوبی کو بیان کیا، آنحضرت صلعم نے فرمایا "خدا یہود و نصاریٰ کو

لعنت بھیجے، انھون نے اپنے پیغمبرون کی قبرون کو عبادت گاہ بنالیا، تم ایسا نہ کرنا، ان مین جب کوئی نیک آدمی مرجاتا تھا، تو وہ اس کی قبر کو عبادت گاہ بنالیتے تھے، اور اس مین اسکی تصویرین کھڑی کردیتے تھے[1]"

اڈورڈگبن نے تاریخ ترقی وزوال روم کی متعدد جلدون کے خاص ابواب مین عیسوی مذہب کے عبادات کے جو حالات بیان کئے ہین وہ تمام تر حدیث مذکور کی تصدیق و تائید مین ہین، خصوصاً تیسری اور پانچوین جلد مین حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ، سینٹ پال، اور متعدد ولیون اور شہیدون کی پرستش کی جو کیفیت درج ہے وہ بالکل اس کے مطابق ہے، اور آج تک رومن کیتھولک اور قدیم مسیحی فرقون کی پرستش گاہون کے در و دیوار سے قرآن پاک کی صداقت کی آوازین آرہی ہین، اور آج بھی دیندار عیسائی دن رات مومی بتیون کی روشنی مین اُن کے آگے مراقبون اور تسبیحون مین سرنگون نظر آتے ہین، روم (اٹلی) کے تاریخی گرجاؤن مین منظر مین نے خود اپنی آنکھون سے دیکھا ہے، اور اُس وقت محمد رسول اللہ صلعم کی اس حدیث کی عملی تشریح میری آنکھون کے سامنے تھی،

یہودیون اور عیسائیون کو چھوڑ کر خاص عرب کے لوگ، اللہ نام ایک ہستی سے واقف ضرور تھے، مگر اس کی عبادت اور پرستش کے مفہوم سے بیخبر تھے، لات، عزیٰ، ہبل، اور اپنے اپنے قبیلہ کے جن بتون کو حاجت روا اور پرستش کے قابل سمجھتے تھے، اُن پر جانور قربانی کرتے، اپنی اولادون کو بھینٹ چڑھاتے تھے، سال کے مختلف اوقات مین مختلف بتخانون کے بہانے

[1] صحیح مسلم کتاب المساجد،

مین شریک ہوتے تھے، اور پتھرون کے ڈھیرون کے سامنے بعض مشرکانہ رسوم ادا کرتے تھے خانہ کعبہ یعنی خلیل بت شکن کا معبد تین سو ساٹھ بتون کا مرکز تھا، اور اُن کی نماز یہ تھی کہ خانہ کعبہ کے صحن مین جمع ہو کر سیٹی اور تالی بجا بجا کر بتون کو خوش اور راضی رکھین، قریش کا موحد زید بن عمرو جو آنحضرت صلعم کی نبوت سے پہلے بت پرستی سے تائب ہو چکا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ "اے خدا مجھے نہین معلوم کہ مین تجھکو کس طرح پوجون اگر جانتا تو اُسی طرح عبادت کرتا[1]"

ایک صحابی شاعر عامر بن اکوع خیبر کے سفر مین یہ ترانہ گا رہے تھے اور آنحضرت صلعم سُن رہے تھے[2]

وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا	وَاللّٰهِ لَوْلَا أَنْتَ مَا اهْتَدَيْنَا
نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے،	خدا کی قسم اگر تو نہ ہوتا تو نہ ہم راستہ پاتے

اس شعر مین اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ محمد رسول اللہ ہی کی تعلیم تھی جس نے اہل عرب کو عبادت کے صحیح طریقون سے آشنا کیا،

عرب سے باہر بھی کہین خدائے واحد کی پرستش نہ تھی، بت پرست یونانی اپنے بادشاہون اور ہیرؤن کے مجسمے اور ستارون کے ہیکل پوجتے تھے، روم، ایشیائے کوچک، یورپ، افریقہ، مصر، بربر، حبشہ وغیرہ عیسائی ملکون مین حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ اور سینکڑون ولیون اور شہیدون کی مورتیان، اور ہڈیان، اور اُن کی مصنوعی یادگارین پوجی جارہی تھین، زردشت کی مملکت مین آگ کی پرستش جاری تھی، ہندوستان سے لیکر کابل و ترکستان اور چین اور جزائر ہند تک بودھ کی مورتون ہمادھون اور اس کی جلی ہوئی ہڈیون کی راکھ کی پوجا ہو رہی تھی، چین

[1] سیرۃ ابن ہشام ذکر زید بن عمرو، [2] صحیح مسلم باب خیبر، شعر کا پہلا لفظ مختلف روایتون مین مختلف ہے،

کے کنفوشس اپنے باپ دادون کی مورتون کے آگے خم تھے، خاص ہندوستان مین سورج دیوتا، گنگا مائی، اور اوتارون کی پوجا ہو رہی تھی، عراق کے صابی سبع سیارہ کی پرستش کی تاریکی مین مبتلا تھے. باقی تمام دنیا درختون، پتھرون، جانورون، بھوتون اور دیوتاؤن کی پرستش کر رہی تھی، غرض مین اس وقت جب تمام دنیا خداے واحد کو چھوڑ کر آسمان سے زمین تک کی مخلوقات کی پرستش مین مصروف تھی، ایک بے آب و گیاہ ملک کے ایک گوشہ سے آواز آئی،

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ	لوگو! اپنے اُس پروردگار کی پرستش
الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ	کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلون
قَبْلِكُمْ، (بقرہ-۳)	کو پیدا کیا،

سابق کتب الٰہی کے امانت دارون کو آواز دی گئی،

يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ	اے کتاب والو! آؤ ہم تم اس بات پر عملاً
سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا	متحد ہو جائین جسمین ہم تم عقیدۃً متفق ہین،
نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ،	کہ ہم خداے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش
(آل عمران-۷)	نہ کرین،

مگر یہ آواز ریگستانِ عرب کے صرف چند حق پرستون نے سُنی، اور پکار اُٹھے،

رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي	خداوندا! ہم نے ایمان کی منادی کی آواز
لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ (آل عمران-۲۰)	سُنی، کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، تو
فَآمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا،	ہم ایمان لے آئے، تو اے پروردگار

ان واقعات کو سامنے رکھکر آنحضرت صلعم کی اس دعا کی صداقت کا اندازہ کرو جو بدر کے امتحان گاہ مین آپ کی زبانِ عبودیت ترجمان سے بارگاہِ الٰہی مین کیگئی تھی،

"خداوندا! تیرے پوجنے والون کی یہ مٹھی بھر جماعت آج تیرے لئے لڑنے پر آمادہ ہے خداوندا! آج اگر یہ مٹ گئی تو پھر زمین مین تیری کبھی پرستش نہ ہوگی"

خدا نے اپنے نبیؐ کی دعا سُنی، اور قبول فرمائی، کیونکہ خاتم الانبیاء کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا، جو غافل دنیا کو خدا کی یاد دلاتا، اور خدا کی سچی اور مخلصانہ عبادت کی تعلیم دیتا،

صرف ایک خدا کی عبادت

مذہب کی تکمیل اور اصلاح کے سلسلہ مین نبوتِ محمدی کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کے معبدون سے تمام باطل معبودون کو باہر نکال کر پھینکدیا، باطل معبودون کی عبادت اور پرستش یکقلم محو کردی، اور صرف اس ایک خدا کے سامنے خدا کی تمام مخلوقات کی گردنین جھکا دین، اور صاف اعلان کر دیا کہ

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمان و زمین کی تمام مخلوق اس مہربان
اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۔ (مریم-۶)	خدا کے سامنے غلام ہی بنکر آنے والی ہے

خدا کے سوا نہ تو آسمان مین، نہ زمین مین، نہ آسمان کے اوپر، اور نہ زمین کے نیچے، کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے سجدہ، اور رکوع و قیام کی مستحق ہے، اور نہ اس کے سوا کسی اور کے نام پر کسی جاندار کا خون بہایا جاسکتا ہے، اور نہ اس کی پرستش کے لئے گھر کی کوئی دیوار اٹھائی جاسکتی ہے، اور نہ اسکی نذر مانی جاسکتی ہے، اور نہ اس سے دعا مانگی جاسکتی ہے، ہر عبادت صرف اسی کیلئے اور ہر پرستش صرف اسی کی خاطر ہے،

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ	بے شبہہ میری نماز اور میری قربانی، اور
وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ	میری زندگی اور میری موت سب اُسی
(انعام - ۲۰)	ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لئے ہے

کفار کو بتون، دیوتاؤن، ستارون، اور دوسری مخلوقات کی پرستش سے ہر طرح منع کیا، اور انھین ہر دلیل سے سمجھایا گیا کہ خداے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہین لیکن جب ان پر اس سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا، تو اسلام کے پیغمبر کو اس انقطاع کے اعلان کا حکم ہوا،

قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ لَاۤ اَعْبُدُ مَا	اے کافرو! جس کو تم پوجتے ہو اس کو مین
تَعْبُدُوْنَ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ	نہین پوجتا، اور نہ تم اُس کو پوجنے والے ہو
مَاۤ اَعْبُدُ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا	جس کو مین پوجتا ہون اور نہ مین اس کو
عَبَدْتُّمْ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ	پوجنے والا ہون جس کو تم نے پوجا اور نہ
مَاۤ اَعْبُدُ، لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ	تم اس کو پوجنے والے ہو جس کو مین پوجتا
دِیْنِ ٥ (کٰفِرون - ۱)	ہون تمھارے لئے تمھارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین

خارجی رسوم کا وجود نہین | خدا کی عبادت اور پرستش کے وقت جسم و جان سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہین، نہ سورج کے نکلنے اور اس کی طرف دیکھنے کی حاجت، نہ دریا مین جا کر اس کا پانی اچھالنے سے مطلب[1]، نہ سامنے آگ کا الاؤ جلانے کی ضرورت[2]، نہ دیوتاؤن، دیبیون، بزرگون اور ولیون کے مجسمون کو پیش نظر رکھنے کی اجازت[3]، نہ سامنے موم بتیون کے روشن کرنے کا حکم[4]، نہ

---

[1] جیسا کہ ہندوؤن مین ہے، [2] جیسا کہ پارسیون مین ہے، [3] جیسا کہ ہندوؤن، عام بت پرستون اور رومن کیتھولک مین ہے، [4] جیسا کہ رومن کیتھولک عیسائیون مین ہے،

گھنٹون اور ناقوسون کی ضرورت، نہ لوبان اور دوسرے بخورات جلانے کی رسم، نہ سونے چاندی کے خاص خاص ظروف اور برتنون کے رکھنے کا طریقہ، نہ کسی خاص قسم کے کپڑون کی قید[1]، ان تمام بیرونی رسوم اور قیود سے اسلام کی عبادت پاک اور آزاد ہے، اس کے لئے صرف ایک پاک ستر پوش لباس، پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے، اگر جسم و لباس کی پاکی سے کبھی مجبوری ہو جائے تو یہ بھی معاف ہے،

درمیانی آدمی کی ضرورت نہین

اسلام مین عبادت کے لئے خدا اور بندہ کے درمیان کسی خاص خاندان اور کسی خاص شخصیت کی وساطت اور درمیانگی کی حاجت نہین، محمد رسول اللہ صلعم کے دین مین ہندون کی طرح نہ برہمن ہین، نہ پروہت ہین، نہ پجاری ہین، نہ یہودیون کی طرح کاہن ہین، نہ ربی ہین، نہ حاخام ہین، نہ حضرت ہارونؑ کے خاندان کی وساطت کی قید ہے، نہ عیسائیون کی طرح عبادتون کی بجا آوری کے لئے پادریون اور مختلف مذہبی عہدہ دارون کی ضرورت ہے، اور نہ پارسیون کی طرح دستورون اور موبدون کی حاجت، یہان ہر بندہ اپنے خدا سے آپ مخاطب ہوتا ہے، آپ باتین کرتا ہے، آپ عرض حال کرتا ہے، ہر مسلمان اپنا آپ برہمن، اپنا آپ کاہن، اپنا آپ پادری اور اپنا آپ دستور ہے، یہان یہ حکم ہے کہ تم مجھے براہ راست پکارو، مین جواب دونگا

ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ (مومن-۶) تم مجھے پکارو مین تم کو جواب دونگا،

خارجی کشش کی کوئی چیز نہین

اکثر مذاہب نے اپنی عبادتون کو دلکش، دلفریب، مؤثر اور بارعب بنانے کیلئے خارجی تاثیرات سے کام لیا تھا، کہین ناقوس اور قرنا کی پر رعب آوازین تھین، کہین ساز و ترنم، اور

[1] یہ چیزین یہودیون کے ہان ہین، پارسیون مین سپید کپڑون کی اکثر ضرورت ہے،

نغمہ و بربط کی دلکش صدائین تھین کہین جرس اور گھنٹے کا غلغلہ انداز شور، لیکن دینِ محمدیؐ کی سادگی نے اُن مین سے ہر ایک سے احتراز کیا، اور انسانی قلوب کو متاثر کرنے کیلئے دل کے ساز، اور روح کی صدا کے سوا کسی اور خارجی اور بناوٹی تدبیرون کا سہارا نہین لیا، تاکہ خدا اور بندہ کا راز و نیاز اپنی اصلی اور فطری سادگی کے ساتھ خلوص و اثر کے مناظر پیدا کرے،

مکان کی قید نہین ہر مذہب نے اپنی عبادت کو اینٹ اور چونے کی چار دیواری مین محدود کیا ہے بُت خانون سے باہر پوجا نہین، آتش خانون سے الگ کوئی نماز نہین، گرجون کے سوا کہین عبادت نہین، اور صومعون سے نکل کر کوئی پرستش نہین لیکن محمد رسول اللہ صلعم کے طریقہ مین نہ کسی در و دیوار کی ضرورت، نہ محراب و منبر کی حاجت، وہ دیر و حرم، معبد و صومعہ، اور مسجد و کنیسہ سب سے بے نیاز ہے، زمین کا ہر گوشہ، بلکہ پہنائے کائنات کا ہر حصہ اُس کا معبد اور عبادت خانہ ہے، آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا "مجھے اللہ تعالی نے بعض ایسی خصوصیتین عنایت کین جو مجھ سے پہلے پیغمبرون کو نہین دی گئین منجملہ اُن کے ایک یہ ہے،

وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا[1]، اور میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنادی گئی،

تم سوار ہو کہ پیادہ، گلگشتِ چمن مین ہو کہ ہنگامۂ کارزار مین، خشکی مین ہو کہ تری مین، ہوا مین ہو کہ زمین پر، جہاز مین ہو کہ ریل پر، ہر جگہ خدا کی عبادت کر سکتے ہو، اور اس کے سامنے سجدۂ نیاز بجا لا سکتے ہو، یہان تک کہ اگر تم کسی غیر مذہب کے ایسے معبد مین ہو جس مین سامنے بُت اور مجسمے نہ ہون تو وہان بھی اپنا فریضۂ عبادت ادا کر سکتے ہو،[2]

---

[1] بخاری کتاب الصلوۃ باب قول النبی صلعم جعلت لی الارض مسجدا وطہورا، [2] صحیح بخاری کتاب الصلوۃ باب الصلوۃ فی البیعۃ

خاص خاص عبادتون کے وقت مختلف سمتون اور چیزون کی طرف رُخ کرنا بھی ہر مذہب مین ضروری سمجھا جاتا ہے، چنانچہ تمام مسلمانون کو ایک واحد رُخ پر مجتمع کرنے کے لئے تاکہ اُن مین وحدت کی شان نمایان ہو مسلمانون کے لیے بھی کسی ایک سمت خاص کی حاجت تھی، اور اسکیلئے اسلام مین مسجد ابراہیمی کی تخصیص کیگئی ہے، کہ وہ دنیا مین خداے واحد کی پرستش کا پہلا مقام ہے، لیکن اس کی حیثیت وہ نہین قائم کی گئی جو دوسرے مذاہب کے قبلون کی ہے، اسلام کا قبلہ شمال وجنوب اور مشرق ومغرب کے حدود سے پاک ہے، وہ ستارون کے رُخ یا چاند اور سورج کے مواجہ کا قائل نہین، دنیا کے مختلف ملکون کے مسلمان ہر سمت اور ہر جہت سے اس کی طرف رُخ کرتے ہین، مغرب سے بھی، مشرق سے بھی، شمال سے بھی، اور جنوب سے بھی، کسی ایک سمت کی تخصیص نہین، اور خود خانہ کعبہ کے صحن مین بیک وقت ہر جہت اور ہر سمت سے اُس کی طرف رُخ کیا جاتا ہے، اگر کسی سبب سے اُس رُخ کا بھی پتہ نہ لگ سکے تو جدھر بھی رُخ کرو اودھر ہی خدا ہے، چنانچہ کسی چلتی ہوئی سواری پر سفر کرنے کی حالت مین عام نفل نمازون کی درستی کے لئے قبلہ کی بھی تخصیص نہین، جدھر سواری کا رُخ ہو اُدھر ہی سجدہ کیا جاسکتا ہے، لڑائیون مین ہر رُخ پر نماز برابر ادا کیجاسکتی ہے، اگر خدانخواستہ کعبہ کی عمارت باقی نہ رہے، تب بھی اُس رُخ کھڑا ہو جانا کافی ہے کعبہ کے اندر کھڑے ہو کر جدھر چاہو سر جھکادو،

انسانی قربانی کی ممانعت | بعض مذاہب مین خدا کی سب سے مرغوب عبادت یہ سمجھی جاتی تھی، کہ انسان اپنی یا اپنی اولاد کی جان کو خواہ گلا کاٹ کر، یا دریا مین ڈبا کر یا آگ مین جلا کر یا کسی اور طرح بھینٹ چڑھا دے، اسلام نے اس عبادت کا قطعی استیصال کردیا، اور بتایا کہ خدا کی راہ مین اپنی جان قربان کرنا اصل مین یہ ہے کہ کسی سچائی کی حمایت مین، یا کمزورون کی مدد کی خاطر اپنی جان کی پروا

نہ کیجائے اور مارا جائے، یہ نہین ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ لیا جائے، یا دریا مین ڈوب جائے یا آگ مین اپنے کو جلا دیا جائے، آپنے فرمایا کہ "جو شخص جس چیز سے اپنے آپ کو قتل کرے گا اُس کو جہنم مین اسی چیز سے سزا دیجائے گی"[1]

حیوانی قربانی مین اصلاح کسی حیوان کی قربانی کرکے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ اکثر مذاہب مین رائج تھا، عرب مین اُس کا طریقہ یہ تھا کہ لوگ جانور ذبح کرکے بتون پر چڑھا دیتے تھے، کبھی کرتے تھے کہ مردہ کی قبر پر کوئی جانور لاکر باندھ دیتے تھے، اور اُس کو چارہ گھاس نہین دیتے تھے، وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرجاتا تھا، اہلِ عرب یہ سمجھتے تھے کہ خدا خون کے نذرانہ سے خوش ہوتا ہے، چنانچہ قربانی ذبح کرکے معبد کی دیوار پر اُس کے خون کا چھاپا دیتے تھے، یہودیون مین یہ طریقہ تھا کہ جانور قربانی کرکے اس کا گوشت جلا دیتے تھے، اور اُس کے متعلق وہ جو رسوم ادا کرتے تھے، اُن کی تفصیل صفحون مین بھی نہین سما سکتی، اُن کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ قربانی خدا کی غذا ہے[2] بعض مذاہب مین یہ تھا کہ اُس کا گوشت چیل اور کوّون کو کھلا دیتے تھے، محمدؐ نے اِن سب طریقون کو مٹا دیا، اُس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ اس قربانی سے مقصود خون اور گوشت کی نہین، بلکہ تمھارے دل کی نذر مطلوب ہے، فرمایا،

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا	اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور
وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ط	خون نہین پہنچتا، بلکہ تمھارے دل کی پرہیزگاری
(حج - ۵)	پہنچتی ہے،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب من اکفر اخاہ، [2] احبار - ۲۱ - ۶،

اسلام نے تمام عبادات مین صرف ایک حج کے موقع پر قربانی واجب کی ہے، اور اہل استطاعت کے لئے جو موقع حج پر نہ گئے ہون، مقام حج کی یاد کے لئے قربانی مسنون کیگئی ہے، تاکہ اُس واقعہ کی یاد تازہ ہو جب ملت حنیفی کے سب سے پہلے داعی نے اپنے خواب کی تعبیر مین اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کے سامنے قربان کرنا چاہا تھا، اور خدا نے اُس کو آزمایش مین پورا ہوتا دیکھ کر اُس کی چھری کے نیچے بیٹے کی بجائے دنبے کی گردن رکھدی، اور اس کے پیرودن مین اس عظیم الشان واقعہ کی سالانہ یادگار قائم ہوگئی،

اسی کے ساتھ پیامِ محمدیؐ نے یہ تعلیم دی کہ اس قربانی کا منشا ارواح کو خوش کرنا، مصیبتون کو دور کرنا، جان کا فدیہ دینا، یا صرف خون کا بہانا اور گردن کا کاٹنا نہین ہے، بلکہ اس سے مقصد دو ہین، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کیا جائے کہ اُس نے جانورون کو ہماری ضرورتون مین لگایا اور اُن کو ہماری غذا کے لئے مہیا کیا، اور دوسرا یہ کہ اُن کا گوشت، غریبون، مسکینون اور فقیرون کو کھلا کر خدا کی خوشنودی حاصل کیجائے، چنانچہ فرمایا،

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا	ہم نے ہر قوم کے لئے قربانی مقرر کی، تاکہ
لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم	وہ ان جانورون پر خدا کے نام کی یاد
مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ	کرین جو ہم نے اُن کو روزی کی، تو تمھارا
إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَ	خدا ایک خدا ہی ہے اسی کے آگے سر جھکاؤ،
بَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ،	اور عاجزی کرنے والے بندون کو
(حج - ۵)	خوشخبری سنادے،

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ	اور قربانی کے جانورون کو خدا کی نشانیان
شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ	بنایا ہے، تمہارے لئے اُن مین بہت فائدے
فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ	ہین، اُن کو قطار مین کھڑا کر کے تم اُن پر
فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا	خدا کا نام لو، تو جب وہ پہلو کے بھل گر پڑین
مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ	(یعنی ذبح ہو چکین) تو اُن مین سے کچھ خود
كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ	کھاؤ، اور باقی قناعت پسند فقیرون اور
	محتاجون کو کھلا دو، اسی طرح ہم نے اُن
(حج - ۵)	جانورون کو تمہارے کام مین لگایا ہے کہ خدا کا شکر ادا کرو

یہی وجہ ہے کہ خدا کے نام کے سوا کسی اور کے نام پر اگر جانور کو ذبح کیا جائے تو محمد رسول اللہ صلعم کی شریعت مین یہ فعل شرک اور ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے، وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ، عرب مین دستور تھا کہ خاص رجب کے مہینہ مین قربانی کرتے تھے، اسلام کے بعد لوگون نے اسکے متعلق آپ سے پوچھا، آپ نے فرمایا "خدا کے نام سے جس مہینہ مین چاہو ذبح کرو، نیک کام خدا کے لئے کرو، اور (غریبون کو) کھلاؤ"[1]، غرض قربانی کی یہی دو حقیقتین ہین، صرف خون بہانے کیلئے خون بہانا قربانی کی حقیقت نہین، اور نہ یہ خون بہانا مشرکون کی دیبیون اور دیوتاؤن کی طرح اسلام کے خدا کو خوش آتا ہے،

مشرکانہ قربانیون کی مخالفت

اسی لئے وہ تمام مشرکانہ قربانیان جو عرب مین جاری تھین بند کر دی گئین، عرب مین جانورون کے قربانی کرنے، اور اُن کو بتون پر چڑھانے کے

[1] ابو داؤد، باب فی العتیرہ، جلد دوم ص ۵،

مختلف طریقے تھے، اونٹنی کا پہلا بچہ جو پیدا ہوتا تھا بتون کے نام پر عموماً اسکی قربانی کر دیتے تھے، اور اُسکی کھال کو درخت پر لٹکا دیتے تھے، اس قسم کے بچے کو فرع کہتے تھے، رجب کے پہلے عشرہ مین ایک قسم کی قربانی کی جاتی تھی جس کا نام عتیرہ تھا، اسلام نے ان دونون قربانیون کو ناجائز قرار دیا، اور رجب کی تخصیص باطل کر دی،

قال لا فرع ولا عتيرة[1]، آپنے فرمایا کہ فرع اور عتیرہ جائز نہین ہے

بتون کے نام پر مختلف نامون سے زندہ جانور چھوڑے جاتے تھے، اور اُن کو کوئی شخص کسی دوسرے کام مین استعمال نہین کر سکتا تھا، چنانچہ قرآن مجید مین اس کے متعلق خاص طور پر ایک آیت نازل ہوئی،

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيلَةٍ وَّلَا حَامٍ (مائدہ-۱۴) نہ تو خدا نے بحیرہ، نہ سائبہ، نہ وصیلہ اور نہ حام بنایا،

مردون کی قبر کے پاس گائے یا بکری ذبح کرتے تھے لیکن اسلام نے مراسم ماتم کی جو اصلاحین کین، اُس کے سلسلہ مین اس کو بھی ناجائز قرار دیا، فرمایا،

لا عقر في الاسلام[2]، اسلام مین قبر کے پاس جانورون کا ذبح کرنا جائز نہین،

عرب جاہلیت مین یہ بھی دستور تھا کہ لوگ اپنی فیاضی و سخاوت کی نمائش اس طرح کرتے تھے کہ دو آدمی مقابل ہو کر جانورون کے ذبح کی بازی لگاتے تھے، اپنا ایک اونٹ یہ ذبح

---

[1] ابوداؤد کتاب الاضاحی جلد ۲ ص ۵، [2] ابوداؤد کتاب الجنائز، باب کراہیۃ الذبح عند القبر جلد ۲ ص ۱۴۳،

کرتا، پھر اُس کے مقابل مین دوسرا ذبح کرتا، اسی طرح یہ مقابلہ قائم رہتا جس کے اونٹ ختم ہو جاتے یا ذبح کرنے سے انکار کر دیتا، وہ ہار جاتا، اسلام نے اس جان و مال کے اتلاف کو روک دیا[1]،

تجرد، ترکِ لذائذ، ریاضات اور تکالیفِ شاقہ عبادت نہین،

عام خیال یہ تھا کہ بندہ جس قدر اپنے اوپر تکلیف اٹھاتا ہے، اسی قدر خدا خوش ہوتا ہے اور وہ اُس کی بڑی عبادت شمار ہوتی ہے اسی لئے لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی تکلیفین دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جس قدر جسم کو آزار زیادہ دیا جائے گا، اسی قدر روح مین زیادہ صفائی اور پاکیزگی آئے گی، چنانچہ یونانی فلسفیون مین اشراقیت، عیسائیون مین رہبانیت اور ہندوون مین جوگ اس اعتقاد کا نتیجہ تھا، کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کر لیتا، کوئی ہفتہ مین یا چالیس دن مین ایک دفعہ غذا کرتا تھا، کوئی سرتا پا برہنہ رہتا، اور ہر قسم کے لباس کو تقدس کا ننگ سمجھتا تھا، کوئی چلہ کی سردی مین اپنے بدن کو ننگا رکھتا تھا، کوئی عمر بھر یا سالہا سال تک اپنے کو کھڑا رکھتا تھا، یا بیٹھا رہتا تھا، اور سونے اور لیٹنے سے قطعاً پرہیز کرتا تھا، کوئی اپنا ایک ہاتھ کھڑا رکھتا تھا کہ سوکھ جائے، کوئی عمر بھر تاریک تہ خانون اور غارون مین چھپ کر خدا کی روشنی تلاش کرتا تھا، کوئی تجرد، اور ترکِ دنیا کرکے اہل و عیال اور زن و فرزند کے تعلق سے نفرت رکھ کر خدا کی محبت کا غلط مدعی بنتا تھا، لیکن نبوتِ محمدیؐ نے یہ راز آشکارا کیا، کہ ان مین سے کوئی چیز عبادت نہین، نہ ترکِ لذائذ سے حق کی لذت ملتی ہے، نہ ہماری غمگینی خدا کی خوشنودی کا باعث ہے، اور نہ بندون کی اس غیر معمولی تکلیف سے خدا کو آرام ملتا ہے، نہ زن و فرزند کی نفرت سے خدا کی محبت نصیب ہوتی ہے، نہ ترکِ دنیا سے دین کی دولت ملتی ہے، خدا کا دین اتنا ہی

---

[1] ابو داؤد کتاب الاضاحی جلد ۲ ص ۵،

ہے جو بندہ کی استطاعت کے اندر ہے، اُس نے کہا،

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۔ (بقرہ - آخر)

خدا کسی کو اس کی گنجایش سے زیادہ کی تکلیف (حکم) نہین دیتا،

اسلام مین روزہ ایک ایسی چیز تھی جس کو بعضون کے لئے غیر معمولی تکلیف کہہ سکتے ہین، اسلام نے اس مین متعدد آسانیان پیدا کرکے کہا،

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ - ۲۳)

خدا تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہین،

حج بھی سب لوگون پر مشکل تھا، تو ساتھ ہی فرمادیا،

مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا، (آل عمران - ۱۰)

جس کو (زاد راہ اور چلنے کی) استطاعت ہو اسی پر حج فرض ہے،

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ، (حج - ۱۰)

اور تمھارے لئے دین مین اس نے (خدا نے) تنگی نہین کی،

آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا،

اِنَّ هٰذَا الدِّيْنَ يُسْرٌ وَلَنْ يُشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهُ[1]

یہ دین آسان ہے، جو کوئی شخص دین سے سختی مین مقابلہ کرے گا، تو دین اُس کو [illegible]

اور فرمایا

[1] جمع الفوائد طبع میرٹھ جلد اول صفحہ ۲۰ باب الاقتصاد فی الاعمال بحوالہ صحیح بخاری وسنن نسائی،

اِنّما انا بعثت بالملۃ السمحۃ	مین تو سہل اور آسان روشن حنیفی دین
او السہلۃ الحنیفیۃ البیضاء[1]	دے کر بھیجا گیا ہون،

مذہب مین رہبانیت اور جوگ کا جو طریقہ ایجاد کیا گیا، خواہ وہ کتنی ہی خوش نیتی سے کیا گیا ہو، تاہم وہ دینِ حق کی اصلی تعلیم نہ تھی، اسی لئے اسلام کے صحیفہ نے اُس کو بدعت سے تعبیر کیا، اور کہا؛

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا	اور عیسائیون نے ایک رہبانیت کی بدعت
كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ	نکالی اور ہم نے اُن کو خدا کی خوشنودی
رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ	حاصل کرنے کے سوا اس کا حکم نہین دیا تھا
رِعَايَتِهَا، (حدید - ۴)	تو جیسا چاہئے اس رہبانیت کا حق ادا نہ کیا

ان لوگون سے جنھون نے اچھے کھانون اور زیب و زینت کی جائز چیزون کو بھی اس لئے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا کہ اس سے خدا خوش ہوگا، یہ سوال کیا،

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي	پوچھ اے پیغمبر کہ اس زیب و زینت اور
أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ	رزق کی اچھی چیزون کو جن کو خدا نے
الرِّزْقِ، (اعراف - ۴)	اپنے بندون کے لئے بنایا کس نے حرام کیا

اسلام نے اس مسئلہ مین یہانتک سختی کی کہ ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے بعض بی بیون کی خوشنودیِ مزاج کے لئے شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی، اس پر عتاب آیا، خدا نے فرمایا،

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۵ ص ۲۶۶،

يَآيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ	اے پیغمبر، خدا نے جس چیز کو تیرے لئے
اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ	حلال کیا، تو اس کو اپنی بی بیون کی خوشی
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	کی خاطر اپنے اوپر حرام کیون کرتا ہے،
(تحریم-۱)	اور خدا بخشنے والا مہربان ہے،

صحابہؓ مین بعض ایسے لوگ تھے جو عیسائی راہبون کے اثر، یا ذاتی میلانِ طبع کے سبب سے تجرّد، ترکِ لذائذ، اور ریاضاتِ شاقہ کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے، آنحضرت صلعم نے اُن کو اس سے باز رکھا، اور فرمایا کہ مین یہ شریعت لیکر نہین آیا، قدامہؓ بن مظعون اور اُنکے ایک رفیق نے دربارِ رسالت مین حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ! ہم مین سے ایک نے عمر بھر مجرد رہنے اور شادی نہ کرنے کا، اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے، آپ نے فرمایا "مین تو دونون باتین کرتا ہون" یہ سُن کر دونون صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے،[۱]

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے جو ایک نہایت عابد و زاہد صحابی تھے، یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن کو روزہ رکھین گے، اور رات بھر عبادت کرین گے، آنحضرت صلعم کو خبر ہوئی تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ "اے عبداللہ! تم پر تمھارے جسم کا بھی حق ہے، تمھاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی حق ہے، مہینہ مین تین دن روزے رکھ لینا کافی ہے[۲]" اسی قسم کی نصیحت آپ نے ایک دوسرے تقشف پسند صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعون کو فرمائی، آپ کو اُن کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ شب و روز عبادت مین مصروف رہتے ہین، بیوی سے کوئی

[۱] صحیح بخاری کتاب الصوم، [۲] ایضاً،

تعلق نہین رکھتے، دن کو روزے رکھتے ہین، رات کو سوتے نہین، آپنے اُن کو بلا کر پوچھا کہ "کیون عثمان! تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے" عرض کی "خدا کی قسم مین نہین ہٹا ہون مین آپ ہی کے طریقہ کا طلبگار ہون" فرمایا "مین سوتا بھی ہون اور نماز بھی پڑھتا ہون، روزہ بھی رکھتا ہون اور افطار بھی کرتا ہون، اور عورتون سے نکاح بھی کرتا ہون، اے عثمان خدا سے ڈرو کہ تمھارے اہل وعیال کا بھی تم پر حق ہے، تمھارے مہمان کا بھی حق ہے، تمھاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تو روزے بھی رکھو افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی"[1]

قبیلۂ باہلہ کے ایک صحابی جب اسلام لاکر اپنے قبیلہ مین واپس گئے، تو انھون نے دن کا کھانا چھوڑ دیا اور مسلسل روزے رکھنے لگے، ایک سال کے بعد جب وہ پھر خدمتِ اقدس مین حاضر ہوئے تو اُن کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ آپ ان کو پہچان نہ سکے، انھون نے اپنا نام بتایا، تو فرمایا "تم خوشرو تھے، تمھاری صورت کیون ایسی ہوگئی" عرض کی "یارسول اللہ صلعم جب سے آپ سے مل کر گیا ہون متصل روزے رکھتا ہون" فرمایا "تم نے اپنی جان کو کیون عذاب مین ڈالا، رمضان کے علاوہ ہر مہینہ مین ایک روزہ کافی ہے" انھون نے اس سے زیادہ کی طاقت ظاہر کی، تو آپنے مہینہ مین دو روزون کی اجازت دی، انھون نے اس سے زیادہ کی اجازت چاہی تو آپنے مہینہ مین تین روزے کر دیئے، انھون نے اس سے بھی زیادہ اضافہ کی درخواست کی، تو آپنے ماہ حرام کے روزون کی اجازت دی[2]، ایک دفعہ چند صحابہؓ نے ازواج مطہراتؓ کی خدمت مین حاضر ہو کر آپ کی دن رات کی عبادت وریاضت کا حال دریافت

[1] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب مایومر بہ من القصد فی الصلوٰۃ [2] ابوداؤد باب صوم اشہر الحرم،

کیا، وہ سمجھتے تھے کہ رسولِ خدا صلعم کو دن رات سوا عبادت کے اور کوئی کام نہ ہوگا، انھوں نے آپ کی عبادت کا حال سنا تو بولے ہم کو رسول اللہ صلعم سے کیا نسبت؟ آپ تو معصوم ہین ان مین سے ایک صاحب نے کہا مین تو رات بھر نمازین پڑھون گا، دوسرے صاحب بولے مین عمر بھر روزے رکھون گا، تیسرے صاحب نے اپنا ارادہ یہ ظاہر کیا کہ مین عمر بھر مجرد رہون گا، کبھی نکاح نہ کرون گا، آنحضرت صلعم اُن کی یہ گفتگو سُن رہے تھے، ان کو خطاب کرکے فرمایا "خدا کی قسم مین تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہون تاہم مین روزہ رکھتا ہون، اور افطار بھی کرتا ہون، رات کو نماز بھی پڑھتا ہون، اور سوتا بھی ہون، اور عورتون سے نکاح بھی کرتا ہون، جو میرے طریقہ پر نہین چلتا وہ میری جماعت مین نہین"[1]

بعض صحابہؓ نے جو افلاس اور غربت کی وجہ سے شادی نہین کرسکتے تھے اور ضبطِ نفس پر بھی قادر نہ تھے، چاہا کہ اپنا عضو قطع کرا دین، انھون نے آنحضرت صلعم سے اس رہبانیّت کی اجازت چاہی، تو آپ نے سخت برہمی ظاہر فرمائی، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ وغیرہ صحابہ کہتے ہین اگر حضور اس کی اجازت دیتے تو بہت سے لوگ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار تھے[2]،

ان واقعات سے اندازہ ہوگا کہ آپ نے کس اہتمامِ بلیغ کے ساتھ لوگون کو عبادت کا صحیح مفہوم و مقصود تعلیم فرمایا،

آپ نے کبھی کبھی بذاتِ خاص کئی کئی دن تک متصل روزے رکھے، صحابہ نے بھی آپ کی پیروی مین اس قسم کے روزے رکھنے چاہے، آپ نے منع فرمایا، لیکن وہ یہ سمجھے کہ آپ صرف

[1] صحیح بخاری کتاب النکاح [2] صحیح بخاری و ابوداؤد کتاب النکاح ،

اپنی شفقت کی بنا پر منع فرماتے ہین، اس لئے انھون نے افطار نہ کیا، آپنے دو دن روزہ رکھے تھے، کہ اتفاق سے چاند نکل آیا، آپنے افطار کر لیا، اور فرمایا کہ اگر مہینہ بڑھ سکتا تو مین اتنے روزے رکھتا کہ ان مذہب مین غلو کرنے والون کا سارا غلو رہجاتا، صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! پھر آپ کیون کئی کئی دن کے روزے رکھتے ہین، فرمایا "تم مین سے کون میری طرح ہے، مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا رہتا ہے[1]" اسی لئے اسلام مین عام اُمت کے لئے یہ روزے نہین ہین،

ایک دفعہ ایک مسجد مین آپ کا گذر ہوا، دیکھا تو ایک کھمبے مین ایک رسی لٹک رہی ہے، دریافت کیا تو لوگون نے کہا، یہ زینبؓ نے باندھی ہے، رات کو نماز مین جب وہ کھڑی کھڑی تھک جاتی ہین تو اسی کے سہارے کھڑی ہوتی ہین، یہ سن کر آپنے فرمایا "یہ رسی کھول دو، لوگو! تم اُسی وقت تک نماز پڑھو جب تک تم مین نشاط باقی رہے، جب کوئی تھک جائے تو بیٹھ جائے[2]"

ایک دفعہ ایک عورت سامنے سے گذری، حضرت عائشہؓ نے کہا "یہ خولاؔ ہے، لوگ کہتے ہین کہ یہ رات بھر نہین سوتی اور عبادت مین مصروف رہتی ہے" فرمایا کہ "یہ رات بھر نہین سوتی! لوگو! اسی قدر کرو جتنی طاقت ہو[3]"

جو لوگ اپنی قوت اور استطاعت سے زیادہ رات بھر نمازون مین مشغول رہتے تھے ان کو مخاطب کر کے فرمایا،

اکلفوا من العمل ما تطیقون | اتنے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ جس کو کر سکو،

---

[1] صحیح مسلم کتاب الصوم، [2] جمع الفوائد بحوالہ معجم کبیر و اوسط للطبرانی و ابوداؤد عن انس جلد اول صفحہ ۹۰ طبع میرٹھ، باب الاقتصاد فی الاعمال، [3] جمع الفوائد بحوالہ صحیحین و موطا و نسائی،

فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَمَلُّ حَتّٰی تَمَلُّوا	کیونکہ جب تک تم نہ اکتا جاؤ، خدا نہیں اکتاتا،
فَاِنَّ اَحَبَّ الْعَمَلِ اِلَی اللّٰہِ	خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ وہی کام ہے
اَدْوَمُهٗ وَاِنْ قَلَّ[1]،	جس کو تم ہمیشہ کر سکو اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو،

حج میں رہبانیت کی بہت سی باتیں عرب میں جاری تھیں بعض حاجی یہ عہد کر لیتے تھے کہ وہ اس سفر میں زبان سے کچھ نہ بولیں گے، یا سواری کی استطاعت کے باوجود وہ پیادہ سفر کریں گے، اور کسی سواری پر نہ چڑھیں گے، یا اس سفر میں کسی سایہ کے بغیر دھوپ ہی میں چلیں گے، بعض لوگ اپنی گنہگاری کے اظہار کے لئے اپنی ناک میں نکیل ڈال کر طواف کرتے تھے، اور اُس کو ثواب جانتے تھے، اسلام نے ان تمام طریقوں کو منسوخ کر دیا، کہ خواہ مخواہ کی تکلیف خدا کی خوشنودی کا باعث نہیں، حضرت عقبہ بن عامرؓ کی بہن نے یہ نذر مانی تھی، کہ وہ پیدل حج کریں گی، عقبہ نے آکر آنحضرت صلعم سے فتویٰ پوچھا، آپ نے جواب دیا خدا کو تمہاری بہن کی اس نذر کی حاجت نہیں، اُن سے کہو کہ وہ سوار ہو کر حج کریں[2]، اسی طرح آپ نے ایک اور شخص کو دیکھا کہ قربانی کے اونٹ ساتھ ہونے کے باوجود پیدل چل رہا ہے، آپ نے اس کو سوار ہونے کا حکم دیا، اس نے معذرت کی کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، آپ نے فرمایا "میں یہ جانتا ہوں کہ یہ قربانی کا جانور ہے لیکن تم اس پر سوار ہو لو[3]" ایک دفعہ حج کے سفر میں آپ نے ایک بڈھے کو دیکھا جو خود چل نہیں سکتا تھا، اس کے بیٹے اس کو دونوں طرف سے پکڑ کر چلا رہے تھے، آپ نے دریافت فرمایا تو

---

[1] ابوداؤد باب القصد فی الصلوٰۃ، [2] ابوداؤد و مسند ابن جارود کتاب الایمان والنذور، [3] صحیح بخاری جلد ۱، صفحہ ۱۸۲،

معلوم ہوا کہ اس نے پیدل حج کی نیت کی ہے، فرمایا "خدا کو اس کی حاجت نہین کہ یہ اپنی جان کو اس طرح عذاب مین ڈالے، اس کو سوار کر دو[۱]"

ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے، دیکھا کہ ایک شخص چلچلاتی ہوئی دھوپ مین ننگے سر کھڑا ہے، آپنے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے اور اس کی یہ کیا حالت ہے، لوگون نے بتایا کہ اس کا نام ابو اسرائیل ہے، اس نے نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہیگا، بیٹھے گا نہین، اور نہ سایہ مین آرام کرے گا اور نہ بات کرے گا، اور برابر روزے رکھیگا، آپنے فرمایا کہ "اس سے کہو کہ باتین کرے، بیٹھے سایہ مین آرام لے اور اپنا روزہ پورا کرے[۲]"

حج مین دیکھا کہ ایک شخص اپنی ناک مین نکیل ڈالے ہوئے ہے اور دوسرا اس کو جانور کی طرح اس کی نکیل پکڑ کر کھینچ رہا ہے، آپنے جا کر نکیل کاٹ دی، اور فرمایا کہ "اگر ضرورت ہو تو ہاتھ پکڑ کر اس کو طواف کراؤ[۳]"

اسی قسم کی غیر ضروری ریاضتون کے متعلق عیسائی راہبون کی ناگفتہ بہ حالت دکھا کر آپنے فرمایا،

لاتشددوا علی انفسکم فانما	اپنی جانون پر سختی نہ کرو، کہ تم سے پہلے قومین
هلک من کان قبلکم بتشددهم	اپنی جانون پر سختی کرنے سے تباہ ہوئین، اور
علی انفسهم وستجدون بقایاهم	ان کی بقیہ نسلین آج بھی گرجون اور دیرون
فی الصوامع والدیارات[۴]	مین تم کو ملین گی،

[۱] ابوداؤد و ترمذی ونسائی وابن جارود وکتاب الایمان والنذور، [۲] صحیح بخاری، ابوداؤد وابن جارود کتاب الایمان والنذور [۳] صحیح بخاری ایمان ونذور، [۴] جمع الفوائد بحوالہ معجم کبیر واوسط للطبرانی وابوداؤد صفحہ ۲ باب الاقتصاد فی الاعمال

خاتم الانبیا صلعم نے عبادت کے ان تمام غلط راہبانہ طریقون کا اپنے ایک مختصر فقرہ سے ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا، آپنے فرمایا،

لا رھبانیۃ فی الاسلام (ابوداؤد) اسلام مین رہبانیت نہین،

عزلت نشینی اور قطع علائق عبادت نہین،

اکثر مذاہب نے دینداری اور خداپرستی کا کمال یہ سمجھا تھا، کہ انسان کسی غار کھوہ یا جنگل مین بیٹھ جائے اور تمام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلے، اسلام نے اسکو عبادت کا صحیح طریقہ نہین قرار دیا، عبادت درحقیقت خدا اور اس کے بندون کے حقوق کے ادا کرنے کا نام ہے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، اس بنا پر وہ شخص جو اپنے تمام ہمجنسون سے الگ ہوکر ایک گوشہ مین بیٹھ جاتا ہے، وہ درحقیقت ابنائے جنس کے حقوق سے قاصر رہتا ہے، اس لئے وہ کسی تعریف کا مستحق نہین، اسلام کا صحیح تخیل یہ ہو کہ انسان تعلقات کے اژدحام اور علائق کے ہجوم مین گرفتار ہوکر ان مین سے ہر ایک کے متعلق جو اُس کا فرض ہی اسکو بخوبی ادا کرے، جو شخص ان تعلقات و علائق اور حقوق و فرائض کے ہجوم سے گھبرا کر کسی گوشۂ عافیت کو تلاش کرتا ہے وہ دنیا کے کارزار کا نامرد اور بزدل سپاہی ہے، اسلام اپنے پیرون کو جوانمرد سپاہی دیکھنا چاہتا ہے، جو ان سب جھمیلون کو اٹھا کر بھی خدا کو نہ بھولین، غرض اسلام کے نزدیک عبادت کا مفہوم ترک فرض نہین، بلکہ ادائے فرض ہی، ترک عمل نہین، بلکہ عمل، کچھ نہ کرنا نہین، بلکہ کرنا ہی،

ابھی تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ آنحضرت صلعم نے بعض اُن صحابہ کو جو اہل و عیال اور دوست احباب سب کو چھوڑ کر دن بھر روزہ رکھتے تھے، اور راتون کو عبادت کرتے تھے، فرمایا "اے

فلان! تم ایسا نہ کرو کہ تم پر تمھاری بیوی بچون کا بھی حق ہی، تمھارے مہمان کا بھی حق ہی، تمھاری جان کا بھی حق ہی، تمھاری آنکھ کا بھی حق ہے"[1] اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام کی نظر مین عبادت اُن حقوق کو بجا لانا ہے، ان حقوق کو ترک کر دینا نہین، چنانچہ ایک دفعہ کسی غزوہ مین ایک صحابی کا گذر ایک ایسے مقام پر ہوا جس مین موقع سے ایک غار تھا، قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا، آس پاس کچھ جنگل کی بوٹیان بھی تھین، ان کو اپنی عزلت نشینی کے لئے یہ جگہ بہت پسند آئی، خدمتِ بابرکت مین آکر عرض کی کہ یارسول اللہ مجھ کو ایک غار ہاتھ آگیا ہے، جہان ضرورت کی سب چیزین ہین، جی چاہتا ہی کہ وہان گوشہ گیر ہو کر ترکِ دنیا کرون، آپنے فرمایا "مین یہودیت اور عیسائیت لیکر دنیا مین نہین آیا ہون بلکہ آسان اور سہل اور روشن ابراہیمی مذہب لیکر آیا ہون[1]"

اسلام سے پہلے آنحضرت صلعم غارِ حرا مین کئی کئی دن جا کر رہا کرتے تھے اور عبادتِ الٰہی مین مصروف رہتے تھے، لیکن جب سے وحی کا پہلا پیام آپکے پاس آیا، اور دعوت و تبلیغ کا بار آپکے مبارک کندھون پر رکھا گیا، شب و روز مین رات کی چند ساعتین اور سال مین رمضان کے چند اخیر دن گوشۂ عزلت اور زاویۂ تنہائی مین بسر ہوتے تھے، ورنہ تمام دن پوری جماعت کیساتھ مل کر خالق کی عبادت، اور پھر مخلوق کی خدمت مین صرف ہوتے تھے، اور یہی تمام خلفاء اور عام صحابہؓ کا طرزِ عمل رہا، اور یہی اسلام کی عملی اور سیدھی سادھی عبادت تھی[2]،

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۶۶، [2] اسلام مین گوشہ گیری اور عزلت نشینی کی اجازت صرف دو موقعون پر ہی، ایک اُس شخص کے لئے جس مین فطرۃً بدی ہے جس کی سرشت دوسرون کو نفع پہنچانا نہین بلکہ تکلیف دینا ہے، آنحضرت صلعم نے اسکو برائی سے بچنے کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ وہ لوگون سے قطع تعلق کرے، صحیح بخاری مین ہی کہ ایک بدو نے آکر آنحضرت صلعم سے دریافت کیا کہ سب سے بہتر شخص کون ہے؟ فرمایا ایک تو وہ جو اپنی جان و مال کو خدا کی راہ مین قربان کرتا ہی، دوسرے وہ جو کسی

اسلام مین عبادت کا مفہوم

اوپر کی تفصیلات سے یہ واضح ہوا ہوگا، کہ اسلام مین عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہین، جو دوسرے مذہبون مین پایا جاتا ہی، عبادت کے لفظی معنی اپنی عاجزی اور درماندگی کا اظہار ہے اور اصطلاحِ شریعت مین خدائے عزوجل کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذرانہ کو پیش کرنا، اور اُس کے احکام کو بجالانا ہی، اسی لئے قرآنِ پاک مین عبادت کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴) گھاٹی مین بیٹھکر اپنے رب کی عبادت کرے اور لوگون کو اپنے شر سے محفوظ رہنے دے[1]، اس تعلیم نبوی نے انسانون کی دو قسمین کردین، ایک وہ جن کو خلق اللہ کی ہدایت اور خدمت کی فطری توفیق ملی ہی، تو اُن پر یہ فرض ہی کہ وہ مجمع اور ہجوم مین رہ کر اُن کی بھلائی کا فرض انجام دین، یہان تک کہ اس راہ مین اُن کی دولت بھی خرچ ہو جائے، اور اُن کی جان بھی کام آجائے، دوسرے وہ لوگ ہین جن مین طبعًا مردم آزاری اور دوسرون کو نقصان پہنچانے کا مادہ ہی، اُنکی اخلاقی اور روحانی اصلاح اسی مین ہے کہ وہ اپنے کو مجمع سے الگ رکھ کر خدا کی عبادت مین اپنا وقت صرف کرین، تا کہ وہ گناہ کے بار سے، اور لوگ اُنکے آزار سے محفوظ رہین

دوسرا موقع جس مین آنحضرت صلعم نے عزلت نشینی کی اجازت دی ہی، وہ ہی جب مجمع و آبادی یا قوم و ملک مین فتنہ و فساد کا بازار اس طرح گرم ہو، کہ وہ اس کی روک تھام سے عاجز اور اس کی اصلاح سے قاصر ہو، تو ایسے موقع پر اس کے لئے پسندیدہ یہی ہی کہ وہ جماعت سے ہٹ کر گوشہ گیر ہو جائے، چنانچہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ "ایک ایسا زمانہ لوگون پر آئیگا جس مین ایک مسلمان کی بہترین دولت بکری ہو گی جس کو لیکر وہ بارش کی جگہون اور پہاڑون کی گھاٹیون کو تلاش کریگا، تاکہ وہ اپنے دین و ایمان کو فتنون سے بچا سکے" (صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء)

گوشہ گیری اور عزلت کے یہ دو موقع بھی درحقیقت نہایت صحیح اصول پر مبنی ہین، پہلے موقع مین ایسے فرد کا جس سے جماعت اور مخلوق کو فائدے کے بجائے نقصان کا اندیشہ ہو، الگ رہنا جماعت اور فرد دونون کے لئے فائدہ مند ہی، اور دوسرے موقع پر جبکہ جماعت کا نظام ابتر ہو گیا ہی، اور کوئی فرد جو بجائے خود نیک و سعید ہو لیکن اپنی کمزوری کے باعث وہ اس جماعت کی اصلاح پر قادر نہ ہو تو اس کے لئے جماعت کے دائرۂ اثر سے اپنے کو باہر رکھکر ہی اپنی نیکی اور سعادت کی تکمیل مناسب ہے،

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء،

مقابل اور بالضد لفظ استکبار اور غرور استعمال ہوا ہے،

اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ	جو میری عبادت سے غرور کرتے ہیں
عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَہَنَّمَ (مومن ۔ ۶)	وہ جہنم میں جائیں گے،

فرشتون کے متعلق فرمایا،

وَمَنْ عِنْدَہٗ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ	جو اس کے پاس ہین وہ اس کی عبادت
عَنْ عِبَادَتِہٖ، (انبیا ۔ ۲)	سے غرور نہین کرتے،

سعادت مند اور باایمان مسلمانون کے متعلق فرمایا،

اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا	میری آیتون پر وہی ایمان لاتے ہین
ذُکِّرُوْا بِہَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ	جن کو ان آیتون سے سمجھایا جائے تو
سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّہِمْ وَہُمْ	وہ سجدہ مین گر پڑتے ہین، اور اپنے پروردگار
لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ ، (سجدہ ۔ ۲)	کی پاکی بیان کرتے ہین، اور غرور نہین کرتے

اس قسم کی اور آیتین بھی قرآنِ پاک مین ہین جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت اور غرور و استکبار باہم مقابل کے متضاد معنی ہین، اس بنا پر اگر غرور و استکبار کے معنی خدا کے مقابلہ مین اپنے کو بڑا سمجھنا، اپنی ہستی کو بھی کوئی چیز جاننا، اور خدا کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے عار کرنا ہے، تو عبادت کے معنی خدا کے آگے اپنی عاجزی و بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کے سامنے اپنی گردنِ اطاعت کو خم کرنا ہے، اس بنا پر صحیفۂ محمدی کی زبان مین عبادت، بندہ کا ہر ایک وہ کام ہے جس سے مقصود، خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار، اور اس کے احکام کی اطاعت ہو، اگر کوئی

انسان بظاہر کیسا ہی اچھے سے اچھا کام کرے لیکن اس سے اسکا مقصود اپنی بندگی کا اظہار اور خدا کے حکم کی اطاعت نہ ہو تو وہ عبادت نہ ہوگا، اس سے ثابت ہوا کہ کسی اچھے کام کو عبادت مین داخل کرنے کیلئے پاک اور خالص نیت کا ہونا شرط ہے، اور یہی چیز عبادت اور غیر عبادت کے درمیان امر فارق ہے، قرآن پاک مین یہ نکتہ جا بجا ادا ہوا ہے

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى الَّذِي يُؤْتِي	دوزخ سے وہ پرہیزگار بچایا جائے گا جو
مَالَهُ يَتَزَكَّى وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ	اپنا مال دل کی پاکی حاصل کرنے کو دیتا ہے
مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَى إِلَّا ابْتِغَاءَ	اس پر کسی کا احسان باقی نہین جس کا
وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى وَلَسَوْفَ	بدلہ اس کو دینا ہو، بلکہ صرف خدائے برتر
يَرْضَى، (لیل-۱)	کی ذات اس کا مقصود ہے، وہ خوش ہوگا
وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ	صرف خدا کی ذات کی طلب کے لئے
اللهِ، (بقرہ-۳۷)	جو تم خرچ کرو،
إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللهِ،	ہم تو صرف خدا کے لئے تم کو کھلاتے
(انسان-۱)	ہین،
فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ	پھٹکار ہو ان نمازیون پر جو اپنی نماز سے
عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ	غافل رہتے ہین، اور جو دکھاوے کیلئے
هُمْ يُرَاءُونَ، (ماعون-۱)	کام کرتے ہین،

قرآن کی ان آیتون کی جامع و مانع تفسیر آنحضرت صلعم نے ان مختصر لیکن بلیغ فقرون مین فرمائی ہے کہ

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (صحیح بخاری و مسلم)	اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے،

اسی کی تشریح آپ نے اُن لوگوں سے کی جو اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر کرکے مدینہ منورہ آرہے تھے

لکل امرء مانوی فمن	ہر شخص کو وہی ملیگا جس کی اُس نے نیت کی،
کانت ہجرتہ الی اللہ ورسولہ	اگر ہجرت سے مقصود خدا اور رسول تک
فہجرتہ الی اللہ، ومن کانت	پہنچنا ہو تو اس کی ہجرت خدا کی طرف ہے
ہجرتہ الی دنیا یصیبہا اوامرء	اگر کسی دنیاوی غرض کے لئے ہے، یا کسی
ینکحہا فہجرتہ الی ماھاجر	عورت کے لئے ہو تو اس کی ہجرت اُسی کی
الیہ، (بخاری باب اول)	طرف ہو جسکی نیّت سے اُس نے ہجرت کی

اس تشریح سے یہ ثابت ہوگا کہ آنحضرت صلعم نے عبادت کا جو مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا ہو، اس مین پہلی چیز دل کی نیت اور اخلاص ہے، اس مین کسی خاص کام اور طرز و طریقہ کی تخصیص نہین ہے، بلکہ انسان کا ہر وہ کام جس سے مقصود خدا کی خوشنودی، اور اُس کے احکام کی اطاعت ہو، عبادت ہے، اگر تم اپنی شہرت کے لئے کسی کو لاکھون دے ڈالو، تو وہ عبادت نہین لیکن خدا کی رضاجوئی اور اُس کے حکم کی بجا آوری کے لئے چند کوڑیان بھی کسی کو دو تو یہ بڑی عبادت ہو، تعلیم محمدی کی اس نکتہ رسی نے عبادت کو درحقیقت دل کی پاکیزگی، روح کی صفائی، اور عمل کے اخلاص کی غرض و غایت بنا دیا ہے، اور یہی "عبادت" سے اسلام کا اصلی مقصود ہے،

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ	اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت
الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ	کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلون کو پیدا
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، (بقرہ ۳)	کیا تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو،

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ عبادت کی غرض و غایت محض حصولِ تقویٰ ہے،

تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے جس سے دل مین تمام نیک کامون کی تحریک اور بُرے کامون سے نفرت ہوتی ہے، آپنے ایک دفعہ سینہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ تقویٰ کی جگہ یہ ہے[1]، اور قرآن نے بھی "تقوی القلوب" دلون کا تقویٰ" کہہ کر اسی نکتہ کو کھولا ہے اسی کیفیت کا پیدا کرنا اسلام مین عبادت کی اصلی غرض ہے، نماز روزہ اور تمام عبادتین سب اسی کے حصول کی خاطر ہین، اس بنا پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال و اعمال جن سے شریعت کی نظر مین یہ غرض حاصل ہو، سب عبادت ہین،

اسی مفہوم کو ہم دوسری عبارت مین یون ادا کر سکتے ہین، کہ پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبادت صرف چند اُن مخصوص اعمال کا نام ہے، جن کو انسان خدا کے لئے کرتا ہے، مثلاً نماز، دعا، قربانی لیکن محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم نے اس تنگ دائرہ کو بیحد وسیع کر دیا، اس تعلیم کے رو سے، ہر ایک وہ نیک کام جو خاص خدا کے لئے اور اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لئے ہو، اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے کیا جائے عبادت ہے اسلام مین خدا کے لئے کسی کام کے کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کام خواہ خدا کی بڑائی اور پاکی کے لیے ہو، یا کسی انسان یا حیوان کے فائدہ کے لیے ہو، لیکن اُس کام کرنے سے اُس کام کے کرنے والے کا مقصود نمایش، دکھاوا، حصولِ شہرت، یا دوسرون کو احسان مند بنانا، وغیرہ کوئی دنیاوی اور مادی غرض نہ ہو، بلکہ محض خدا کی محبت، خوشنودی اور رضامندی ہو،

اس تشریح کے رو سے وہ عظیم الشان تفرقہ جو دین اور دنیا کے نام سے مذاہب نے قائم

[1] مسلم کتاب البر والصلۃ باب تحریم ظلم المسلم ۲ [illegible] صحیح رکوع ۳ ۱۴

کر رکھا تھا، محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم نے اس کو دفعتہً مٹا دیا، دین اور دنیا کی حیثیت اسلام میں دو حریف کی نہیں رہتی، بلکہ دو دوست کی ہو جاتی ہے، دنیا کے وہ تمام کام جن کو دوسرے مذاہب دنیا کے کام کہتے ہیں، اسلام کی نظر میں اگر وہ کام اسی طرح کیے جائیں، لیکن اُن کی غرض و غایت کوئی مادی خود غرضی و نمایش نہ ہو بلکہ خدا کی رضا اور اُس کے احکام کی اطاعت ہو تو وہ دنیا کے نہیں، دین کے کام ہیں، اس لیے دین اور دنیا کے کاموں میں، کام کا تفرقہ نہیں بلکہ غرض و غایت اور نیت کا تفرقہ ہے، تم نے اوپر پڑھا کہ آنحضرت صلعم نے ان صحابہ کو جو دن رات خدا کی عبادت میں مصروف رہتے تھے، فرمایا کہ تمھارے جسم کا بھی تُم پر حق ہے، کہ اس کو آرام دو، تمھاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے کہ اُس کو کچھ دیر سونے دو، تمھاری بیوی کا بھی حق ہے کہ اوسکی تسلی کرو، اور تمھارے مہمان کا بھی حق ہے[1]، کہ اُس کی خدمت کے لیے کچھ وقت نکالو، غرض ان حقوق کو بھی ادا کرنا، خدا کے احکام کی اطاعت اور اُس کی عبادت ہے، چنانچہ پاک روزی کھانا اور اس کا شکر ادا کرنا بھی عبادت ہے؛

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ	اے ایمان والو! ہم نے جو تم کو پاک اور
طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا	ستھری چیزیں روزی کی ہیں، اُن کو کھاؤ
لِلّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ	اور خدا کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کی عبادت
(بقرہ – ۲۱)	کرتے ہو،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پاک روزی ڈھونڈھنا اور کھانا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنا عبادت

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الضیف،

ہے، ایک اور آیت میں توکل یعنی کاموں کے لیے کوشش کرکے نتیجہ کو خدا پر سپرد کر دینا بھی عبادت قرار دیا گیا ہے، فرمایا

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ھود-۱۰)	اسکی عبادت کرو اور اُس پر بھروسہ رکھو،

اسی طرح مشکلات میں صبر و استقلال بھی عبادت ہے، فرمایا،

فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ (مریم-۴)	اس کی عبادت کر اور صبر کر،

کسی شکستہ دل سے اس کی تسکین و تشفی کی بات کرنا، اور کسی گنہگار کو معاف کرنا بھی عبادت ہے، ارشاد ہے،

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ	اچھی بات کہنا اور معاف کرنا، اس خیرات
مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا اَذًى، (بقرہ-۳۶)	سے بہتر ہے جس کے پیچھے ستانا ہو،

اسی آیتِ پاک کی تشریح محمد رسول اللہ صلعم نے ان الفاظ میں فرمائی ہے،

كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ، (بخاری کتاب الادب)	ہر نیکی کا کام خیرات ہے،
تبسمک فی وجه اخیک صدقة،	تمہارا کسی بھائی کو دیکھ کر مسکرانا بھی خیرات ہے،
واماطة الاذى عن الطريق	راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا
صدقة،	دینا بھی خیرات ہے،

غریب اور بیوہ کی مدد بھی عبادت بلکہ بہت سی عبادتوں سے بڑھ کر ہے، فرمایا،

الساعی علی الارملة والمسكين	بیوہ اور غریب کے لیے کوشش کرنے والے
كالمجاهد فی سبيل وكالذی	کا مرتبہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے

يصوم النهار ويقوم الليل	برابر ہے ، اور اس کے برابر ہے جو دن
(بخاری ، ادب)	بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھتا ہو)

باہم لوگون کے درمیان سے بغض وفساد کے اسباب کو دور کرنا، اور محبت پھیلانا، ایسی عبادت ہے جس کا درجہ نماز، روزہ، اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر ہے، آپ نے ایک دن صحابہؓ سے فرمایا،

الا اخبرکم بافضل من درجۃ	کیا مین تم کو روزہ نماز اور زکوٰۃ سے بھی
الصیام والصلوٰۃ والصدقۃ	بڑھ کر درجہ کی چیز نہ بتاؤن،

صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ارشاد فرمائیے، فرمایا،

اصلاح ذات البین[۱]،	وہ آپس کے تعلقات کا درست کرنا ہے'

حضرت سلمانؓ فارسی ایک دوسرے صحابی حضرت ابو درداؓ سے ملنے گئے تو دیکھا کہ انکی بیوی نہایت معمولی اور میلے کپڑے پہنے ہین، حضرت سلمانؓ نے وجہ دریافت کی، تو بولین کہ "تمھارے بھائی کو دنیا کی خواہش نہین ہے" اس کے بعد مہمان کے لئے کھانا آیا، تو ابو درداؓ نے کہا مین روزے سے ہون، حضرت سلمانؓ نے کہا مین تو تمھارے بغیر نہین کھاؤن گا، آخر انھون نے افطار کیا، رات ہوئی تو ابو درداؓ نماز کو کھڑے ہونے لگے حضرت سلمانؓ نے کہا ابھی سو رہو، پچھلی پہر کو حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا، اور کہا اب نماز پڑھو، چنانچہ دونون نے تہجد کی نماز ادا کی، پھر حضرت سلمانؓ نے ان سے کہا "اے ابو درداؓ تمھارے رب کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تو جس جس کا حق تم پر ہے، سب کو ادا کرو" حضرت ابو درداؓ نے حضرت صلعم کی خدمت

---

[۱] سنن ابی داؤد جلد دوم کتاب الادب باب اصلاح ذات البین ص ۱۹۲،

ہیں آکر حضرت سلمانؓ کی یہ تقریر نقل کی، آپ نے فرمایا کہ "سلمان نے سچ کہا۔"[۱]

لوگوں نے آنحضرت صلعم سے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ تمام کاموں میں سب سے بہتر کون کام ہے؟" فرمایا "خدا پر ایمان لانا، اور اس کی راہ میں جہاد کرنا۔" لوگوں نے پوچھا "کس غلام کے آزاد کرنے میں زیادہ ثواب ہے؟" ارشاد ہوا جس کی قیمت زیادہ ہو، اور جو اپنے مالک کو زیادہ پسند ہو۔" انھوں نے کہا اگر یہ کام ہم سے نہ ہو سکے تو فرمایا "پھر ثواب کا کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کی مدد کرو، یا جس سے کوئی کام بن نہ آتا ہو، اس کا کام کردو۔" پھر سوال ہوا کہ اگر یہ بھی نہ ہو سکے فرمایا "تو پھر یہ کہ لوگوں کے ساتھ کوئی برائی نہ کرو، یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے جو خود تم اپنے اوپر کر سکتے ہو۔"[۲]

ایک دفعہ آپ نے صحابہؓ سے فرمایا، خدا اپنے بندوں سے کہے گا کہ "میں نے تم سے کھانا مانگا، تم نے نہ کھلایا۔" وہ عرض کرینگے "خداوندا! تو نے کیسے کھانا مانگا تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے۔" فرمائیگا "کیا تم کو معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندہ نے تم سے کھانا مانگا، تم نے کھانا اس کو نہ کھلایا، اگر تم اس کو کھلاتے تو اس کو تم میرے پاس پاتے۔" "اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا، تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔" وہ کہیگا کہ "اے پروردگار! میں تجھکو کیسے پانی پلاؤں، تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے۔" وہ فرمائیگا "تم کو معلوم نہ تھا کہ میرے فلاں بندہ نے پیاس میں تجھ سے پانی مانگا، تو نے اس کو پانی نہ پلایا، اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا۔" "اے ابن آدم! میں بیمار ہوا، تو نے میری بیمار پرسی نہ کی۔" وہ کہیگا "اے پروردگار! میں کیونکر تیری بیمار پرسی کروں، تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے۔" فرمائیگا "تجھ کو خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی عیادت نہ کی؟"

[۱] صحیح بخاری کتاب الادب باب صنع الطعام والتکلف للضیف صفحہ ۹۰۶، [۲] ادب المفرد امام بخاری باب معونۃ الرجل اخاہ

اگر کرتا تو تو اس کو میرے پاس پاتا، یا مجھے اس کے پاس پاتا۔[1]"

اس مؤثر طریقۂ ادا نے خدا شناسی اور خدا آگاہی کے کتنے تو بر تو پردے چاک کر دیئے اور دکھا دیا کہ خدا کی عبادت اور اُس کی خوشنودی کے حصول کے کیا کیا طریقے ہین؟ حضرت سعدؓ جو چاہتے تھے، کہ اپنی کل دولت خدا کی راہ مین دیدین، آپنے اُنھین بتایا کہ "اے سعد! جو کچھ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مطلوب ہے، اس کا تم کو ثواب ملیگا، یہانتک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منھ مین بھی دو اُس کا بھی ثواب[2] ہے"، ابومسعودؓ انصاری سے ارشاد فرمایا "مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ[3] ہے" غریب و نادار صحابہؓ نے دربارِ رسالت مین ایک دن شکایت کی کہ "یا رسول اللہ! دولتمند لوگ ثواب مین بڑھ گئے، ہماری طرح وہ بھی نماز پڑھتے ہین، وہ بھی روزے رکھتے ہین، اُن کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی بجا لاتے ہین، جو ہم نہین بجا لا سکتے" فرمایا کیا تم کو اللہ نے وہ دولت نہین دی ہے جس کو صدقہ کر سکو، تمھارا سبحان اللہ اور الحمد اللہ کہنا بھی صدقہ ہے، یہانتک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقہ سے پوری کرتا ہے، وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے، لوگون نے کہا "یا رسول اللہ وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لئے یہ کرتا ہے" فرمایا کہ "اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا اُس کو گناہ نہ ہوتا؟ پھر اس کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیون نہ ملیگا[4]۔"

محمد رسول اللہ صلعم کی ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ حسنِ عمل، ثواب اور عبادت کے مفہوم مین اسلام نے کتنی وسعت پیدا کی ہے، اور کتنی تو بر تو انسانی غلطیون کا ازالہ کیا ہے، اس تشریح

[1] ادب المفرد امام بخاری باب عیادۃ المرضیٰ [2] ادب المفرد باب یوجر فی کل شئی [3] صحیح بخاری کتاب النفقات، [4] ادب المفرد امام بخاری باب کل معروف صدقہ،

کے بعد روشن ہو جائے گا کہ وحی محمدیؐ نے بالکل صحیح طور سے خلقتِ انسانی کی غرض وغایت عبادتِ الٰہی قرار دی ہے،

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ	اور میں نے انسانوں کو اور جنوں کو اسی لئے
إِلَّا لِيَعْبُدُونِ. (ذاریات-۳)	پیدا کیا ہے، کہ وہ میری عبادت کریں

اس آیت پاک میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں تک وسیع ہے جن کے کرنے کا مقصد خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار، اس کی اطاعت، اور اس کی خوشنودی کی طلب ہو، اس وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہیں، جن کے بحسن وخوبی انجام دینے کے لئے اس کی خلقت ہوئی ہے، یہ روحانیت کا وہ راز ہے جو صرف محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے دنیا کو معلوم ہوا،

عام طور سے مشہور ہے کہ شریعت میں چار عبادتیں فرض ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج، اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ ان فرائض کی تخصیص نے عبادت کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیا ہے، حقیقت میں یہ چاروں فریضہ عبادت کے سیکڑوں وسیع مضمون، اور ان کے جزئیات کے لیے بابان دفتر کو چار مختلف بابوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، جن میں سے ہر ایک فریضۂ عبادت اپنے افراد اور جزئیات پر مشتمل اور ان سب کے بیان کا مختصر عنوانِ باب ہے، جس طرح کسی وسیع مضمون کو کسی ایک مختصر سے لفظ یا فقروں میں ادا کر کے اس وسیع مضمون کے سرے پر لکھ دیتے ہیں، اسی طرح یہ چاروں فرائض درحقیقت انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو چار مختلف عنوانوں میں الگ الگ تقسیم کر دیتے ہیں، اس لئے ان چار فرضوں کو بجا طور سے انسان کے اچھے اعمال

اور کامون کے چار اصول ہم کہہ سکتے ہین،

۱۔ بندون کے وہ تمام اچھے کام اور نیک اعمال جن کا تعلق تنہا خالق اور مخلوق سے ہے، ایک مستقل باب ہے جسکا عنوان **نماز** ہے،

۲۔ وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اور آرام کے لیے کرتا ہے، **صدقہ اور زکوٰۃ** ہے،

۳۔ خدا کی راہ مین ہر قسم کی جسمانی اور جانی قربانی کرنا کسی اچھے مقصد کے حصول کے لیے تکلیف اور مشقت جھیلنا، اور نفس کو اس تن پروری اور مادی خواہشون کی نجاست اور آلودگی سے پاک رکھنا، جو کسی اعلیٰ مقصد کی راہ مین حائل ہوتی ہین **روزہ** ہے، یا یون کہو کہ ایثار و قربانی کے تمام جزئیات کی سرخی **روزہ** ہے،

۴۔ دنیائے اسلام مین ملتِ ابراہیمی کی برادری، اور اخوت کی مجسم تشکیل و تنظیم، مرکزی رشتۂ اتحاد کا قیام، اور اس مرکز کی آبادی اور کسبِ روزی کے لیے ذاتی کوشش اور محنت کے باب کا سرِعنوان **حج** ہے،

غور کر کے دیکھو انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کام انہی اصولِ چہارگانہ کے تحت مین داخل ہین، اسی لیے آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ[1] اسلام کی بنیاد پانچ ستونون پر قائم ہے، توحید و رسالت کا اقرار کرنا، نماز[2] پڑھنا، روزہ[3] رکھنا، زکوٰۃ[4] دینا اور حج[5] کرنا، پہلی چیز مین عقائد کا تمام دفتر سمٹ جاتا ہے، اور بقیہ چار[6] چیزین ایک مسلمان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کامون کو

---

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم کتاب الایمان،

محیط ہین، انہی ستونون پر اسلام کی وسیع اور عظیم الشان عمارت قائم ہے،

اس تقریر کا مفہوم یہ نہین ہے کہ یہ چارون فرض عبادتین نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اصل مطلوب بالذات نہین ہین، بلکہ یہ مقصد ہے کہ یہ چارون عبادتین اپنے تمام جزئیات باب، اور محتویات کے ساتھ فرض ہین، جو شخص صرف ان چارون فرائض کو جو عنوانِ باب ہین ادا کرتا ہے، اور اس باب کے نیچے کے مندرجہ جزئیات سے پہلوتہی کرتا ہے، اس کی عبادت ناقص اور اس کی اطاعت ناکمل ہے، اور اُس کے لئے دین و دنیا کی فلاح و کامیابی جس کا خدائے تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے، مشکوک ہے یہین سے یہ شبہہ زائل ہوتا ہے کہ ہماری نمازین، ہم کو برائیون سے کیون باز نہین رکھتین، ہمارے روزے ہم کو تقویٰ کی دولت کیون نہین بخشتے، ہماری زکوٰۃ ہمارے دلون کو پاک و صاف کیون نہین کرتی، ہمارا حج ہمارے گناہون کی مغفرت کا باعث کیون نہین بنتا، اور قرنِ اوّل کی طرح ہماری نمازین ملکون کو فتح، اور ہماری زکوٰتین ہمارے قومی افلاس کو دور کیون نہین کرتین، اور ہمارے سامنے دین و دنیا کے موعودہ برکات کا انبار کیون نہین لگ جاتا لیکن خدا کا وعدہ یہ ہے،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	اللہ نے تم مین سے اُن سے جو ایمان
مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	لائے، اور نیک کام کئے، یہ وعدہ کیا
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ، (نور-۷)	ہے کہ وہ اُن کو زمین مین خلیفہ بنائیگا،

ایمانِ کامل اور اعمالِ نیک کے بغیر اس وعدہ کی ایفا کی توقع رکھنا، حماقت ہی،

اسی طرح ان چارون جلی عنوانات کے احکام سے قطع نظر کر کے، صرف مندرجۂ تحت

جزئیات کی تعمیل ممکن ہو کہ دنیاے فانی کی بادشاہی کا اہل بنا دے، مگر آسمان کی بادشاہت میں اس کو کوئی حصہ نہیں ملیگا، اور اسلام اس لیے آیا ہے کہ اپنے پیروؤن کے پاؤن کے نیچے دونون جہانون کی بادشاہیان رکھدے[1]، اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب عبادات کے مفہوم کو اس وسعت کیساتھ سمجھا جائے، جو اسلام کا منشا ہے، اور اسی وسعت کے ساتھ اُس کو ادا کیا جائے، جو اسلام کا مطالبہ ہے،



[1] سیرۃ ابن ہشام وفد قریش عند النبی صلعم جلد اول صفحہ ۲۵۲ مطبع محمد علی مصر، کلمۃ واحدۃ لا یعطونیہا تملکون بہا العرب وتدین بہا العجم

نماز

اَقِیمُوا الصَّلٰوۃَ

اسلام کی عبادت کا یہ پہلا رکن ہے، جو امیر و غریب، بوڑھے جوان، عورت مرد، بیمار و تندرست، سب پر یکسان فرض ہے، یہی وہ عبادت ہے جو کسی شخص سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی، اگر اس فرض کو کھڑے ہو کر نہیں ادا کر سکتے تو بیٹھ کر ادا کرو، اگر اس کی بھی قدرت نہیں ہے، تو لیٹ کر کر سکتے ہو، اگر منھ سے نہیں بول سکتے تو اشاروں سے ادا کرو[1]، اگر کسی سخت مجبوری میں رک کر نہیں پڑھ سکتے تو چلتے ہوئے پڑھو[2]، سخت خوف کی حالت میں اگر کسی سواری پر ہو تو جس طرف موقع ہو اسی رخ پڑھو[3]۔

نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل، زبان اور ہاتھ پاؤں سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اس رحمان و رحیم کی یاد، اور اس کے بے انتہا احسانات کا شکریہ، حسن ازل کی حمد و ثنا، اور اس کی یکتائی، اور بڑائی کا اقرار، یہ اپنے محبوب سے مہجور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم و جان کی بندگی ہے، یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرض نیاز ہے، یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے، یہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے، یہ بیقرار

---

[1] نیل الاوطار جلد ۲ صفحہ ۲۰ بروایت موقوف از دارقطنی۔ [2] ابوداؤد باب صلوٰۃ الطالب۔ [3] صحیح بخاری تفسیر بقرہ آیت صلوٰۃ الخوف۔

روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تشفی اور مایوس دل کی دوا ہے، یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حساس و
اثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل، اور ہستی کا خلاصہ ہے،

کسی غیر مرئی طاقت کے آگے سرنگون ہونا اس کے حضور مین دعا و فریاد کرنا، اور اس سے مشکلون
مین تسلی پانا، انسان کی فطرت ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیون مین کوئی ساز ہے، جو نامعلوم
انگلیون کے چھونے سے بجتا رہتا ہے، یہی اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کا فطری جواب ہے، قرآن نے جابجا
انسانون کی اس فطری حالت کا نقشہ کھینچا ہے، اور پوچھا ہے کہ جب تم پر مصیبتین آتی ہین جب سمندر
مین طوفان اٹھتا ہے اور تمہارا جہاز بھنور مین پھنستا ہے تو خدا کے سوا کون ہوتا ہے جس کو تم پکارتے ہو،

غرض انسان کی پیشانی کو خود بخود ایک مسجود کی تلاش رہتی ہے جس کے سامنے وہ جھکے،
اندرونِ دل کی عرض نیاز کرے، اور اپنی دلی تمناؤن کو اس کے سامنے پیش کرے، غرض عبادت
روح کے اسی فطری مطالبہ کا جواب ہے، اگر یہ نہ ہو تو انسانی روح کے جوش جنون کا علاج ممکن نہین وحشی
سے وحشی مذہب مین بھی عبادت کے کچھ رسوم اس ندائے فطرت کی تسکین کے لئے موجود ہین، پھر آسمانی
مذاہب اس سے کیونکر خالی ہو سکتے ہین؟

چنانچہ دنیا کے ہر آسمانی مذہب مین خدا کی یاد کا حکم اور اس یاد کے کچھ مراسم موجود ہین، اسلام مین
اگر حمد و تسبیح ہے تو یہودیون مین مزمور، عیسائیون مین دعا، پارسیون مین زمزمہ، اور ہندوؤن مین بھجن
ہین، اور دن رات مین اس فریضہ کے ادا کرنے کے لئے ہر ایک مین بعض اوقات کی تعیین بھی ہے،
اس بنا پر یہ یقین کرنا چاہئے کہ نماز مذہب کے ان اصول مین سے ہے جن پر تمام دنیا کے مذہب متفق ہین،
قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق دنیا مین کوئی پیغمبر ایسا نہین آیا جس نے اپنی امت کو نماز کی تعلیم نہ

دی ہو، اور اس کی تاکید نہ کی ہو خصوصًا ملتِ ابراہیمی میں اس کی حیثیت[1] سب سے زیادہ نمایاں ہی حضرت ابراہیمؑ جب اپنے صاحبزادے حضرت اسمٰعیلؑ کو مکہ کی ویران سرزمین میں آباد کرتے ہیں تو اس کی غرض یہ بتاتے ہیں کہ "رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ" (ابراہیم-٦) اے ہمارے پروردگار تاکہ وہ نماز کھڑی کریں" حضرت ابراہیمؑ اپنے اور اپنی نسل کے لئے دعا کرتے ہیں، کہ "رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي" "اے میرے پروردگار! مجھ کو اور میری نسل میں سے لوگوں کو نماز کھڑی کرنے والا بنا" حضرت اسمٰعیلؑ کی نسبت قرآن پاک کی شہادت ہی، "وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ" (مریم-٤) "اور وہ اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم دیتے تھے" حضرت شعیبؑ کو اُن کے ہم قوم طعنہ دیتے ہیں "أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا" (ہود-٨) "کیا تمہاری نماز تم کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جس کو پوجتے آئے ہیں اُس کو چھوڑ دیں" حضرت لوطؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور اُنکی نسل کے پیغمبروں کے متعلق قرآن کا بیان ہے، "وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلٰوةِ" (انبیاء-٥) "اور ہم نے اُن کو نیک کاموں کے کرنے اور نماز کھڑی کرنے کی وحی کی" حضرت لقمانؑ

---

[1] قرآن کی تائید تورات اور زبور سے بھی ہوتی ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہی کہ یہودیوں کے پرانے صحیفوں میں نماز کے لئے اصطلاحی لفظ "خدا کا نام لینا" تھا، چنانچہ توراۃ اور زبور میں نماز کا ذکر اسی نام سے آیا ہے، حضرت ابراہیمؑ نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پاس ایک قربانگاہ بنائی اور خدا کا نام لیا، (پیدائش ١٢-٨) حضرت اسحاقؑ نے خدا کا نام لیا، (پیدائش ٢٦-٢٥) حضرت داؤدؑ نے خدا کا نام لیا، (زبور ١١٦-١٧) اور یہ اصطلاح قرآن میں بھی مستعمل ہوئی ہی، "وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلّٰى" (الاعلیٰ) "اور اپنے رب کا نام لیا پس نماز پڑھی" اس معنی کی اور بھی آیتیں قرآن پاک میں مذکور ہیں، یہودیوں کے پچھلے صحیفوں مثلاً سفر دانیال وغیرہ، اور عیسائیوں کے تمام صحیفوں میں نماز کے لئے "دعا" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عربی لفظ "صلوٰۃ" کے ہم معنی ہے، اسی لئے انجیل کے اُردو مترجموں نے اُس کا ترجمہ نماز کیا ہے، (متی ١٧-٢١) اور (متی ٢٣-١٤)

اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہین "یابُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ" (لقمان - ۲) اے میرے بیٹے نماز کھڑی کر حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا "وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ" (طٰہٰ - ۱) اور میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر۔ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ اور اُن کے ساتھ بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے "وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" (یونس - ۹) اور نماز کھڑی کیا کرو "بنی اسرائیل سے وعدہ تھا "اِنِّیْ مَعَکُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ" (مائدہ ۳-۲) مین تمہارے ساتھ ہون اگر تم نماز کھڑی کیا کرو" حضرت زکریاؑ کی نسبت ہے "وَھُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ" (آل عمرانؑ) اور وہ محراب مین کھڑے نماز پڑھ رہے تھے" حضرت عیسیٰؑ کہتے ہین "وَاَوْصَانِیْ بِالصَّلٰوۃِ" (مریم - ۲) اور خدا نے مجھ کو نماز کا حکم دیا ہے"

آیات بالا کے علاوہ قرآن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ مین بھی عرب مین بعض یہود اور عیسائی نماز پڑھا کرتے تھے،

مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اُمَّۃٌ قَآئِمَۃٌ	اہل کتاب مین کچھ لوگ ایسے بھی ہین جو
یَّتْلُوْنَ اٰیَاتِ اللّٰہِ اٰنَآءَ الَّیْلِ	راتون کو کھڑے ہو کر خدا کی آیتین پڑھتے
وَھُمْ یَسْجُدُوْنَ ، (آل عمران ۱۲)	ہین، اور وہ سجدہ کرتے ہین،

حدیث مین بھی یہودیون اور عیسائیون کی نماز کے تذکرے ہین، مثلاً آپ نے فرمایا کہ "جب نماز پڑھو تو تہ بند باندھ لو یا چادر اوڑھ لو، یہودیون کی طرح (ننگے) نہ پڑھو" (صفحہ ۲) تم یہودیون کی طرح صرف اوپر سے نماز مین چادر مت ڈال لو بلکہ اس کو باندھ لیا کرو" (صفحہ ۲) نماز مین یہودیون کی طرح مت جھومو" (صفحہ ۱۱۲) "تم یہودیون کے برخلاف نماز مین موزے اور جوتے پہنے رہو" (صفحہ ۱۱۴) "میری امت مین اس وقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر رہیگا جب تک لوگ یہودیون

کی تقلید مین مغرب کی نماز مین ستارون کے نکلنے کا اور عیسائیون کی تقلید مین صبح کی نماز مین ستارون کے ڈوبنے کا انتظار نہ کرینگے" (صفحہ۴۵) اِن حوالون سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے یہود و نصاریٰ مین کچھ لوگ ایسے تھے جو نماز ادا کرتے تھے،

عرب مین جو لوگ اپنے کو دینِ ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے ان مین بعض تو ایسے تھے کہ وہ کسی خاص طریقۂ عبادت سے واقف نہ تھے، چنانچہ زید بن عمرو کا واقعہ گذر چکا ہے، کہ وہ کہا کرتے تھے کہ "اے خدا مجھے معلوم نہین کہ مین تجھے کیسے پوجون" یہ کہہ کر ہتھیلی اٹھاتے تھے اور اُسی پہ سجدہ کر لیتے تھے[۲] لیکن ایک دو ایسے بھی تھے، جو کسی نہ کسی صورت سے نماز پڑھتے تھے، چنانچہ حضرت ابو ذر غفاریؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور اپنے اسلام لانے کے تین برس پہلے سے رات کو نماز پڑھ لیتے تھے، کسی نے اُن سے پوچھا کہ اس وقت آپ کس رخ نماز پڑھتے تھے، کہنے لگے جدھر رُخ کر لیا[۳]، عرب کا ایک جاہلی شاعر جران العود کہتا ہے[۴]

وادرکن اعجازاً من اللیل بعد ما ... اقام الصلوٰۃ العابد المتحنف

(اوران سواریون نے رات کے پچھلے حصہ مین اس وقت کے بعد جب عبادت گذار حنیفی نماز پڑھ چکا تھا)

اس شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب مین مذہب حنیفی کے پیرو پچھلی رات مین نماز ادا کرتے تھے، یہود کی بڑی جماعت نے نماز کو بھلا دیا تھا، اور اُن کی نماز صرف چند رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی، اور نماز سے زیادہ انھون نے قربانی اور نذرانون پر زور دیا تھا، جن مین خلوص اور

---

[۱] کنز العمال جلد چہارم طبع حیدر آباد کے مختلف ابواب سے یہ حدیثین نقل کیگئی ہین، اوپر متن مین اس جلد کے صرف صفحات لکھدیئے گئے ہین، [۲] ابن ہشام ذکر زید بن عمرو بن نفیل [۳] صحیح مسلم فضائل ابی ذر [۴] لسان العرب لفظ حنف،

خداپرستی کا شائبہ تک نہ تھا، عیسائیون نے خدا کی نماز کے ساتھ ساتھ انسانون کی نمازین بھی شروع کردی تھین، وہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے علاوہ اور بھی سیکڑون ولیون اور شہیدون کی عبادت مین مصروف ہوگئے تھے[1]،

دینِ ابراہیمی کی پیروی کے مدعی صرف اپنے قیاس سے کچھ ارکان ادا کرلیتے تھے، الغرض آپ کی بعثت سے پہلے نماز کی خالص اور موحدانہ حقیقت دنیا سے عموماً گم ہوچکی تھی، اس کی شکل و صورت اس قدر مسخ ہوگئی تھی کہ آج بھی اُن کے صحیفون مین اس کی اصلی شکل نظر نہین آتی، نہ اسکے ارکان کا پتہ لگتا ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الہامی صحیفون کے حامل اور امانتدار اس فرض کو کس طرح ادا کرتے تھے، کن مؤثر دعاؤن کو پڑھتے تھے، اور اس کی ادائگی کے کیا اوقات تھے جو کچھ ان مین رہ گیا تھا، وہ صرف علی رسم و رواج، اور ان کے مذہبی مقتداؤن کی کچھ تجویزین، جنہیں مذہبی فریضہ سمجھکر عمل کیا جارہا تھا، سجدہ جو نماز کی روح اور نیاز الٰہی کی انتہائی منزل ہے، اس کو یہود و نصاریٰ دونون نے مشکل اور باعث تکلیف سمجھکر چھوڑ دیا تھا، اور اس طرح نماز کی ظاہری شکل و صورت بھی انھون نے بگاڑ دی تھی، قرآن مجید مین اُن کی اس صورتِ حال کا نقشہ ان الفاظ مین کھینچا گیا ہے،

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ	اُن کے بعد اُن کے وہ جانشین ہوئے جنکو
وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ	خدا کی کتاب باپ دادون سے وراثت
هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا	مین ملی، وہ صرف اس دنیاوی زندگی کا

[1] دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم لفظ عبادت (وَرشپ) ۱۲،

وَاِنۡ يَّاۡتِهِمۡ عَرَضٌ مِّثۡلُهٗ
يَاۡخُذُوۡهُ ؕ اَلَمۡ يُؤۡخَذۡ عَلَيۡهِمۡ
مِّيۡثَاقُ الۡـكِتٰبِ اَنۡ لَّا يَقُوۡلُوۡا
عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَـقَّ وَدَرَسُوۡا
مَا فِيۡهِ ؕ وَالدَّارُ الۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ
لِّـلَّذِيۡنَ يَتَّقُوۡنَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ
وَالَّذِيۡنَ يُمَسِّكُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ وَ
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيۡعُ
اَجۡرَ الۡمُصۡلِحِيۡنَ ۝

(اعراف - ۲۱)

فائدہ لیتے ہین، اور کہتے ہین کہ ہم کو معاف
کر دیا جائیگا، اور اگر ایسا ہی فائدہ اب
بھی ان کے سامنے آئے تو لے لین
(اور مذہب کی پروا نہ کرین) کیا ان سے
کتاب کا معاہدہ نہین لیا گیا کہ وہ خدا کے
متعلق سچ کے سوا کچھ اور نہ کہین گے،
اور ان لوگون نے جو کچھ اس (کتاب)
مین ہے اس کو پڑھا، اور آخرت کا گھر
ان لوگون کے لئے ہے جو پرہیزگار ہین،
کیا تم نہین سمجھتے؟ اور وہ لوگ جو کتاب
کو مضبوطی سے پکڑین، اور انھون نے نماز
کو قائم کیا، تو ہم اپنی حالت درست کرنے والون
کا اجر ضائع نہین کرتے

سورۂ مریم مین تمام انبیاے صادقین کے ذکر کے بعد خدا فرماتا ہے،

فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ
اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا
الشَّهَوٰتِ ، (مریم - ۴)

اُن کے بعد ان کے جانشین ایسے ہوئے
جنھون نے نماز کو برباد کیا اور اپنی خواہشون
کی پیروی کی،

نماز کے ضائع اور برباد کرنے سے مقصود، نماز کو صرف چھوڑ دینا نہین ہے، بلکہ زیادہ تر اُس کی

حقیقت اور اُس کی روح کو گم کر دینا ہے، مسلمان جب اپنی نماز کے لئے حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ (نماز کے لئے آؤ) کا ترانہ بلند کرتے تھے، تو یہود و نصاریٰ اس کا مذاق اڑاتے تھے، اس پر قرآن نے اونکی نسبت یہ شہادت دی کہ "اُن کی خدا پرستی کی روح اتنی مردہ ہو چکی ہے کہ جب دوسرے لوگ خدا پرستی کے جذبہ میں سرشار ہوتے ہین تو وہ اسکو ہنسی کھیل بنا لیتے ہین،

وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا	اور جب تم نماز کے لئے آواز دیتے ہو تو
هُزُوًا وَّلَعِبًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ	وہ اس کو ہنسی کھیل بنا لیتے ہین، یہ اس لئے
قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ، (مائدہ-۹)	کہ وہ عقل سے خالی ہو چکے ہین،

اہلِ عرب اور قریش جو اپنے آبائی مذہب پر تھے، وہ گو نماز کی صورت سے کسی حد تک واقف تھے، مگر بھولے سے بھی اس فرض کو ادا نہین کرتے تھے، بتون کی پوجا، جنات کی دہائی، فرشتون کی خوشامد، یہ اُن کی عبادت کا خلاصہ تھا، حج و طواف یا دوسرے موقعون پر وہ خدا سے دُعائین مانگتے تو اُن مین بھی بتون کے نام لے لیتے، اور شرک کے فقرے ملا دیتے تھے، موحدانہ خضوع وخشوع کا اُن کی دعاؤن مین شائبہ تک نہ تھا مسلمانون کو جب کبھی نماز پڑھتے دیکھ لیتے تو اُنکا منھ چڑھاتے تھے، دق کرتے تھے ڈھکیل دیتے تھے، شور کرتے تھے، سیٹی اور تالی بجاتے تھے چنانچہ اُن کے متعلق قرآن نے کہا،

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ	اور اُن کی نماز خانۂ کعبہ کے پاس سیٹی اور
الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاۗءً وَّتَصْدِيَةً (انفال)	تالی بجانا ہے،

اگلے مفسرون نے اس آیتِ پاک کے دو مطلب لئے ہین، ایک یہ کہ واقعی وہ جو نماز

پڑھتے تھے، اس میں سیٹی اور تالی بجایا کرتے تھے، دوسرے یہ کہ مسلمان جب نماز پڑھتے تھے تو وہ سیٹی اور تالی بجا کر اُن کی نماز خراب کرنی چاہتے تھے، اور گویا یہی اُن کی نماز تھی[1]، پہلے معنی کی بنا پر تو اُن کی نماز محض ایک قسم کا کھیل کود اور لہو ولعب تھا، اور دوسرے معنی کے رو سے سرے سے اُن کے ہاں نماز ہی نہ تھی، بلکہ دوسروں کو نماز سے روکنا یہی اُن کی نماز تھی،

ایک اور آیت میں ہے،

اَرَءَيْتَ الَّذِي يَنْهٰى عَبْدًا	کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ
اِذَا صَلّٰى، (علق - ۱)	کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے،

ایک بندہ سے مراد خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، آپ جب صحنِ حرم میں نماز پڑھتے تو قریش جو بے فکری کے ساتھ اِدھر اُدھر بیٹھے رہتے، کبھی آپ کی ہنسی اڑاتے اور کبھی قتل کرتے[2]، کبھی آپ کی گردن میں پھندا ڈال دیتے[3]، اور کبھی جب آپ سجدہ میں جاتے پشتِ مبارک پر نجاست لا کر ڈال دیتے تھے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بارِ نجاست سے اٹھنے میں تکلیف ہوتی تو ہنستے اور قہقہہ لگاتے تھے[4]، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے آغاز میں تو اخفا کے خیال سے اور اس کے بعد اُن کے ان حرکات کی وجہ سے عموماً راتوں کو اور دن کو کسی غار یا دَرّہ میں چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے، اور مسلمان بھی عموماً اِدھر اُدھر چھپ کر ہی نماز پڑھتے تھے، یا پھر رات کے سناٹے میں اس فرض کو ادا کرتے تھے، مشرکین اگر کبھی اس حالت

---

[1] ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور، [2] ایضاً [3] صحیح بخاری کتاب المناقب فضائل ابوبکرؓ، [4] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب المرأۃ تطرح عن المصلی شیئاً من الاذی،

مین اُن کو دیکھ پاتے تو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے، ابن اسحاق مین ہے کہ صحابہ جب نماز پڑھنا چاہتے تو گھاٹیون مین چھپ کر نماز پڑھتے تھے، ایک دفعہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص چند مسلمانون کے ساتھ مکہ کی ایک گھاٹی مین نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کی ایک جماعت آگئی، اس نے اس نماز کو بدعت (نیا کام) سمجھا اور مسلمانون کو برا بھلا کہا، اور اُن سے لڑنے پر آمادہ ہوگئی؛[1]

الغرض جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانون کو خدا کے آگے سربسجود ہونے کی دعوت دی تو اس وقت تین قسم کے لوگ تھے، ایک وہ (یعنی یہود) جو نماز تو پڑھتے تھے لیکن عموماً اس کی حقیقت سے بیگانہ تھے، ان کی نمازین بالعموم اخلاص و اثر، سکون و دلجمعی خشوع وخضوع، اور خوف وخشیت سے بالکل خالی تھین، دوسرے وہ (یعنی عیسائی) جو خدا کی نماز کے ساتھ انسانون کو بھی اپنے سجدہ کے قابل سمجھتے تھے، اور اُن کی عبادتین کرتے تھے اور وہ چیز جو توحید کا آئینہ تھی اُن کے ہان شرک کا مظہر بن گئی تھی، تیسرے وہ (یعنی عرب بت پرست) جنھون نے نہ کبھی خدا کا نام لیا، اور نہ کبھی خدا کے آگے سر جھکایا، وہ اس روحانی لذت سے ناآشنا ہی تھے

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو آپ کو ملا، وہ نماز کا تھا، یَا اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ، وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ (مدثر-۱) "اے لحاف مین لپٹے ہوئے اٹھ، اور ہشیار کر، اور اپنے رب کی بڑائی بول" "رب کی بڑائی بولنا" یہی نماز کی بنیاد ہے، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نماز تکمیل کے مدارج طے کرتی ہوئی، اس نقطہ پر پہنچ گئی جو روحانی معراج کی آخری سرحد ہے، آپ نے سونے والون کو جگایا، بھولے ہوون

---

[1] سیرۃ ابن ہشام (ابتداء ما افترض اللہ سبحانہ من الصلوۃ)

کو بتایا، انجانون کو سکھایا اور خدا اور بندے کے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا، گوشت پوست کے
سونے چاندی کے، اور اینٹ اور پتھر کے اُن بتون کو جو خدا کی جگہ کھڑے تھے، ڈھکیل کر نیچے
گرا دیا، صرف ایک خدا کی نماز دنیا مین باقی رکھی، اور خدا کے سوا ہر ایک کے سجدے کو
حرام کر دیا، اس طرح آپ کی تعلیم کے ذریعہ سے نماز کی اصل حقیقت دنیا مین ظاہر ہوئی، آپنے
اہلِ عرب اور دنیا کی بت پرست قومون کی نماز کا طریقہ بتایا، اس کے ارکان و آداب سکھائے
مؤثر دعائین تعلیم کین، عیسائیون کو مخلصانہ عبادت اور ایک خدا کی پرستش کا سبق دیا، یہودیون
کو نماز کے خضوع و خشوع، راز و نیاز، اور اخلاص و اثر سے باخبر کیا، اور انبیائے عالم کی نماز کو
اپنے عمل کے ذریعہ سے شکل و صورت اور روح و حقیقت دونون کیساتھ ناقابلِ تحریف اور غیر متغیر
وجود بخش دیا، حکم ہوتا ہے کہ

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ (بقرہ-۳۱) نمازون کی نگہداشت کرو،

یہ نماز کی ظاہری اور معنوی دونون حیثیتون سے نگہداشت کا حکم ہے، اور مسلمان کی پہچان
یہ مقرر ہوئی کہ

وَهُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ (انعام-۱۱) اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہین،

الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ (معارج-۱) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہین،

وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوٰتِهِمْ اور (کامیاب ہین) وہ جو اپنی نمازون

يُحَافِظُونَ، (مؤمنون-۱) کی نگہداشت کرتے ہین،

خود آنحضرت صلعم کو حکم ہوتا ہے، کہ خود بھی نماز پڑھو، اور اپنے اہل و عیال کو بھی اس کا حکم دو،

اور اس نماز پر جس کا مکہ کے قیام کے زمانہ میں ادا کرنا بہت مشکل ہے، پوری پابندی اور مضبوطی کے ساتھ جمے رہو، فرمایا،

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا، (طٰہٰ-۸)

اور اپنے گھر والوں پر نماز کی تاکید رکھو اور خود بھی اس کے اوپر جمے (پابند) رہو

نماز کیسی ہونی چاہیے؟ فرمایا،

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ، (بقرہ-۳۱)

اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو

تعریف کی گئی کہ

اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ، (مومنون-۱)

(کامیاب ہیں وہ مومن) جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں،

حکم ہوا کہ

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (اعراف-۷)

تم اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو،

وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا، (اعراف-۷)

اور اس (خدا) کو ڈر اور امید کے ساتھ پکارو،

وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ، (اعراف-۳)

اور خدا کو پکارو اس حال میں کہ تم دین کو اسی کیلئے خالص کرنے والے ہو،

اس اجمال کے بعد نماز کے تمام مباحث پر ایک تفصیلی نگاہ کی ضرورت ہے،

اسلام مین نماز کا مرتبہ اسلام سے پہلے بھی دنیا مین کوئی ایسا مذہب نہین آیا جس مین نماز کو اہمیت نہ دی گئی ہو، لیکن چونکہ وہ مذہب خاص خاص قومون اور وقتون تک محدود تھے اس لیے اُن کے اندر سے عملاً اُس کی اہمیت جاتی رہی، چنانچہ اسلام سے پہلے کی دنیا کے کسی مذہب مین آج نماز یعنی خدا کے سامنے اقرارِ عبودیت اور اس کی حمد و ثنا کو واضح معین اور تاکیدی حیثیت حاصل نہین ہے یعنی کسی مذہب کے پیرووں بلکہ ملہمون کے عمل سے بھی اس کی یہ صورت نمایان نہین ہوتی، ورنہ جیسا کہ گذر چکا، قرآن کے رُو سے تو دنیا مین کوئی ایسا پیغمبر نہین آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو، اور اس نے اپنی اُمت کو اُس کی تاکید نہ کی ہو، مگر موجودہ حیثیت یہ ہے کہ اسلام کے سوا وہ کہین نمایان، واضح اور مؤکد صورت مین باقی نہین رہی ہے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء اور قرآن پاک خاتم الکتب ہو کر آیا ہے اس لئے اس فریضۂ الٰہی کو دینِ کامل مین ایسی منظم، واضح، مؤکد اور نمایان صورت دیگئی ہے کہ وہ قیامت تک دنیا مین قائم اور باقی رہے،

یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان متنفس جب تک اس مین کچھ بھی ہوش و حواس باقی ہے، کسی حالت مین بھی سبکدوش نہین ہو سکتا، قرآن پاک مین سو مرتبہ سے زیادہ اس کی تعریف، اس کی بجا آوری کا حکم اور اس کی تاکید آئی ہے، اس کے ادا کرنے مین سستی اور کاہلی نفاق کی علامت[1] اور اُس کا ترک کفر کی نشانی[2] بتائی گئی ہے، یہ وہ فرض ہو جو اسلام

---

[1] منافقین کی صفت مین ہے، وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى (نساء - ۲۱) جب وہ نماز کو اٹھتے ہین تو سست و کاہل ہو کر اٹھتے ہین، فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ، (ماعون - ۱)

کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا، اور اُس کی تکمیل اُس شبستانِ قدس میں ہوئی جس کو معراج کہتے ہیں[۵]،

اسلام میں پہلا فرض ایمان اور اُس کے لوازم ہیں، اور اس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے، چنانچہ سورۂ روم (رکوع ۴) میں پہلا حکم یہ دیا گیا کہ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ (اپنا منھ ہر طرف سے پھیر کر دین توحید پر سیدھا رکھو اور یہی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے) اس کے بعد دوسرا حکم اسی سے ملحق یہ ہے،

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ (روم-۴)

اور نماز کو کھڑا رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ،

اس آیتِ پاک سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے اور دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترکِ نماز سے کفر و شرک میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے، کیونکہ جب تک دل کی کیفیت کو ہم بیرونی اعمال کے ذریعہ سے بڑھاتے نہ رہیں، خود اُس کیفیت کے زائل ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہے، یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلعم نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے، اور اُس کے تارک کے متعلق شرک اور کفر کا ڈر ظاہر فرماتے رہے،

چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "نماز دین کا ستون ہے" جس طرح ستون گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے اسی طرح نماز کے ترک کرنے سے دل کی دینداری بھی رخصت ہو جاتی ہے، طائف کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱) افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں،

[۴] کفار کے بارے میں ہے لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (مدثر-۲) "ہم نمازیوں میں نہ تھے" یہ وہ اس وقت کہیں گے جب ان سے پوچھا جائیگا کہ تم دوزخ میں کیوں ہو؟ [۵] کتب صحاح واقعات معراج و اسرار و صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ،

وفد نے جب مدینہ منورہ آکر صلح کی بات چیت شروع کی، تو نماز، جہاد، اور صدقات سے مستثنیٰ ہونا چاہا، آپ نے دو پچھلی باتون سے مستثنیٰ کر دیا، لیکن نماز کے متعلق فرمایا "جس دین مین خدا کے سامنے جھکنا نہ ہو، اُس مین کوئی بھلائی نہین"۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے، کہ "نماز دل کی روشنی ہے"۔ اپنی نسبت فرمایا ہے، "نماز میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے"، ایک تمثیل مین آپ نے فرمایا "انسان آگ مین جلتا رہتا ہے، اور نماز سے وہ آگ بجھ جاتی ہے"۔ یہ محبوب ازل کے ہجر و فراق کی آگ ہے، اور نماز آبِ زلال ہے، جو آگ کو سرد کر دیتا ہے، آپ نے فرمایا کہ کفر اور ایمان کے درمیان امتیاز نماز ہی سے ہے؛ کیونکہ ایمان اور کفر دونون انسان کی اندرونی حالت سے تعلق رکھتے ہین، جسکا اظہار اس کے اعمال ہی سے ہو سکتا ہے، مسلمان کا وہ عمل جس کے دیکھنے کا دن مین متعدد دفعہ لوگون کو موقع ملے نماز ہی ہے، عین اس وقت جب جناب رسالت پناہؐ کی زندگی کے اخیر لمحے تھے اور فرض نبوت کے آخری حروف زبانِ مبارک سے ادا ہو رہے تھے، آپ فرما رہے تھے "نماز اور غلام" [1]

نماز کی حقیقت | نماز کے لئے اصل عربی لفظ "صلوٰۃ" ہے، صلوٰۃ کے معنی عربی اور عبرانی زبانون مین "دعا" کے ہین، اس لئے نماز کی لفظی حقیقت خدا سے درخواست اور التجا ہے، اور اسکی معنوی حقیقت بھی یہی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نماز کی یہی تشریح فرمائی ہے، معاویہ ابن حکم سلمی ایک نو مسلم صحابی تھے، ان کو اسلام کے جو آداب بتائے گئے ان مین ایک چیز یہ بھی تھی کہ جب کبھی کسی مسلمان کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو اس کے جواب مین تم یرحمک اللہ کہو، اتفاق سے ایک دفعہ نماز با جماعت ہو رہی تھی، معاویہ بھی اس مین شریک تھے

[1] یہ تمام حدیثین کنز العمال (کتاب الصلوٰۃ جلد ۴) مین مختلف کتب حدیث کے حوالون سے درج ہین،

اُن کے پاس کسی مسلمان کو چھینک آئی، انھون نے نماز کی حالت مین یرحمک اللہ کہدیا، صحابہؓ نے ان کو گھورنا شروع کیا، معاویہ نے نماز ہی مین کہا تم سب مجھے کیون گھور رہے ہو؟ صحابہؓ نے زانو پر ہاتھ مارے اور سبحان اللہ کہا، اب وہ سمجھے کہ بولنے سے منع کیا جا رہا ہے، نماز ہو چکی تو آنحضرت صلعم نے پوچھا کہ نماز مین کون باتین کرتا تھا، لوگون نے معاویہؓ کی طرف اشارہ کیا، آپنے اُن کو پاس بلا کر نہایت نرمی سے سمجھایا کہ "نماز قرآن پڑھنے اور اللہ کو یاد کرنے اور اس کی پاکی اور بڑائی بیان کرنے کا نام ہے، اس مین انسانون کو باتین کرنا مناسب نہین[1]" حضرت انسؓ کہتے ہین کہ آپنے ایک دفعہ فرمایا کہ الدعاء مخ العبادۃ "دعا عبادت کا مغز ہے" اور حضرت نعمانؓ ابن بشیر انصاری روایت کرتے ہین کہ آپنے فرمایا "الدعاء ھو العبادۃ" دعا ہی عبادت ہے" اس کے بعد آپنے یہ کہہ کر کہ تمھارا پروردگار فرماتا ہے، اس تفسیر کی تائید مین یہ آیت پڑھی[2] جس مین دعا ہی کا نام عبادت بتایا گیا ہے،

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ۭ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ ، (مومن - ۶)

مجھ سے دعا مانگو، مین قبول کرون گا، جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہین، وہ عنقریب جہنم مین ذلیل و خوار ہوکر جائنگے

مستدرک حاکم (کتاب الدعاء) مین ہے کہ آپنے فرمایا "بہترین عبادت دعا ہے" اس کے بعد آیت مذکورہ تلاوت فرمائی،

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الصلوۃ باب تشمیت العاطس فی الصلوۃ، یہ دو روایتین ہین، ہم نے ان دونون کو جمع کر دیا ہے، [2] یہ دونون حدیثین جامع ترمذی کتاب الدعوات مین ہین، دوسری حدیث ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب الدعاء مین اور مستدرک حاکم کتاب الدعاء مین بھی ہے،

قرآن پاک مین حضرت موسیٰؑ کے قصہ کے ضمن مین نماز کی حقیقت صرف ایک لفظ مین ظاہر کی گئی ہے، یعنی "خدا کی یاد" فرمایا،

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ، (طٰہٰ-۱) اور میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر،

کامیابی اسی کے لئے ہے جو خدا کو یاد کرکے نماز ادا کرتا ہے،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی ۙ وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی ؕ (اعلیٰ-۱) کامیاب وہ ہوا جس نے پاکی حاصل کی، اور خدا کا نام یاد کیا، پس نماز پڑھی،

انسان کو اپنی روحانی تڑپ، دلی بےچینی، قلبی اضطراب، اور ذہنی شورش کے عالم مین جب دنیا اور دنیا کی ہر چیز فانی، عقل کی ہر تدبیر واماندہ، جسم کی ہر قوت عاجز اور سلامتی کا ہر راستہ بند نظر آتا ہے، تو سکون و اطمینان کی راحت اُس کو صرف اسی ایک قادر مطلق کی پکار، دعا، اور التجا مین ملتی ہے، وحیِ الٰہی نے اس نکتہ کو ان الفاظ مین ادا کیا،

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (رعد-۴) ہان! خدا ہی کی یاد سے دل تسکین پاتے ہین،

یہی وجہ ہے کہ مصیبتون کے ہجوم اور تکلیفون کی شدت کے وقت ثابت قدم اور دعا ہی چارۂ کار بنتے ہین،

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ، (بقرۃ-۵) ثابت قدمی اور نماز (یا دعا) کے ذریعہ سے اپنی مصیبتون مین مدد چاہو،

زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ذرہ ذرہ خدائے قادر و توانا کے سامنے سرنگون ہے

آسمان، زمین، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ، جنگل جھاڑ، چرند، پرند، سب اس کے آگے سربسجود ہیں اور اس کے مقرر کردہ احکام و قوانین کی بیچون وچرا اطاعت کر رہے ہیں یہی اُن کی تسبیح و نماز ہے

وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ	اور (دنیا میں) کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ
وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ	(اس خدا) کی حمد کی تسبیح پڑھتی ہے، البتہ
(بنی اسرائیل۔۵)	تم اُن کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ	کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو آسمانوں میں ہے،
فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ	اور جو زمین میں ہے، اور سورج، چاند،
وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ	تارے، پہاڑ، درخت، جانور، اور بہت
وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ	سے آدمی اس کو سجدہ کرتے ہیں، اور بہت
النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ	سے آدمیوں پر اس کا عذاب ثابت ہو چکا
الْعَذَابُ ؕ (حج۔۲)	(کیونکہ وہ اس کو سجدہ نہیں کرتے تھے)

غور کرو! کائنات کا ذرہ ذرہ بلا استثنا خدا کے سامنے سرنگون ہے لیکن استثنا ہے تو صرف انسان میں کہ بہتیرے اس کو سجدہ کرتے ہیں، اور بہتیرے اس سے روگرداں ہیں، اسی لئے وہ عذاب کے مستحق ہو چکے۔ انسان کے علاوہ تمام مخلوقات بلا استثناء اطاعت گذار ہے، کیونکہ وہ ذاتی ارادہ و اختیار سے سرفراز نہیں، خدا کے حکم کے مطابق وہ ازل سے اپنے کام میں مصروف ہے اور قیامت تک مصروف رہے گی، لیکن انسان ذاتی ارادہ و اختیار کا ایک ذرہ پاکر سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہے، اسلام کی نماز انہی سرکش اور باغی انسانوں کو دوسری مطیع و فرمانبردار

مخلوقات کی طرح اطاعت وانقیاد اور بندگی و سرافگندگی کی دعوت دیتی ہے، جب دنیا کی
تمام مخلوقات اپنی اپنی طرز اور اپنی اپنی بولیون مین خدا کی حمد و ثنا اور تسبیح و تہلیل مین مصروف ہے،
تو انسان کیون نہ اپنے خدا کی تقدیس کا ترانہ گا کر اپنی اطاعت کا ثبوت پیش کرے، اور یہی نماز
نماز کی روحانی غرض و غایت | نماز کی روحانی غرض و غایت یہ ہے کہ اس خالقِ کل، رازقِ عالم،
مالک الملک منعم اعظم کی بے غایت بخششون، اور بے پایان احسانون کا شکر ہم اپنے دل اور زبان
سے ادا کرین، تا کہ نفس و روح اور دل و دماغ پر اس کی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی و بے چارگی
کا نقش بیٹھ جائے، اس کی محبت کا نشہ رگ رگ مین سرایت کر جائے، اس کے حاضر و ناظر ہونے
کا تصوّر ناقابلِ زوال یقین کی صورت مین اس طرح قائم ہو جائے، کہ ہم اپنے ہر دلی ارادہ و نیت
اور ہر جسمانی فعل و عمل کے وقت اس کی ہوشیار اور بیدار آنکھون کو اپنی طرف اٹھا ہوا دیکھین،
جس سے اپنے برے ارادون پر شرمائین، اور ناپاک کامون کو کرتے ہوئے جھجکین، اور بالآخر ان
سے بالکل باز آئین صحیحین کی کتاب الایمان مین ہے کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
صحابہؓ کے مجمع مین تشریف فرما تھے، ایک شخص نے سائل کی صورت مین آکر نماز کی حقیقت دریافت
کی، آپ نے اس کی تشریح فرمائی، پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ احسان کیا ہے؟ فرمایا" یہ کہ تم اپنے پروردگار
کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اس کو نہین دیکھ رہے ہو، تو
وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے" اسی طرح ایک اور شخص کو نماز کے آداب کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا،
کہ" نماز کی حالت مین کوئی شخص سامنے نہ تھوکے، کیونکہ اُس وقت وہ اپنے رب کے ساتھ راز و
نیاز کی باتون مین مصروف ہوتا ہے" حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک رات جب آپ

اعتکاف مین بیٹھے تھے، اور شاید لوگ الگ الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے، تو آپ نے سر مبارک باہر نکال کر فرمایا، "لوگو! نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے، اس کو جاننا چاہیئے کہ وہ کیا عرض معروض کر رہا ہے، نماز مین ایک دوسرے کی آواز کو مت دباؤ" ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ نماز کی عادت سے ایک مخلص نمازی کے دل و دماغ پر کیسے نفسیاتی اثرات طاری ہو سکتے ہین، اور اس کے اخلاق و عادات پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے، اسی لئے قرآن پاک مین اس نکتہ کی شرح اس طرح کی گئی،

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ط اِنَّ الصَّلٰوۃَ	اور نماز کھڑی کیا کر، کہ نماز بیحیائی اور
تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ط	برائی کی باتون سے روکتی ہے، اور البتہ
وَلَذِکْرُ اللّٰهِ اَکْبَرُ (عنکبوت)	خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے،

اس آیت مین نماز کی دو حکمتین بیان کی گئی ہین، ایک تو یہ کہ نماز برائیون اور بیحیائیون سے روکتی ہے، اور دوسری اس سے بڑھ کر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے، اور خدا کی یاد سے بڑھ کر کوئی بات نہین، بے حیائی اور برائی کی باتون سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی ہے یعنی یہ سلبی حالت کی یہ ایجابی صورت ہے جس کا حصول انسان کی منزل مقصود اور حقیقی کامیابی ہے، چنانچہ فرمایا،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی لا وَذَکَرَ اسْمَ	کامیاب ہوا وہ جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام لیا، پس نماز پڑھی
رَبِّهٖ فَصَلّٰی، (اعلیٰ)	

لہ مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۳۶ و صفحہ ۶۷ و صفحہ ۱۲۹،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے
کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے، یعنی نماز پڑھے، اس سے زیادہ واضح یہ آیت پاک ہے،

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ	تو ان ہی کو تو ہشیار کر سکتا ہے جو بن دیکھے
رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ	اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں، اور
وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ	نماز کھڑی کیا کرتے ہیں، اور جو تزکیہ
وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ،	دل کی صفائی حاصل کرتا ہے، وہ اپنے
	ہی لئے حاصل کرتا ہے، اور (آخر)
(فاطر - ۳)	خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے،

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو اس کی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی، نفسانی برائیوں
سے ہٹاتی، اور اس کی روحانی ترقیوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے، فرمایا،

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا	بے شک انسان بے صبرا بنا ہے، جب
اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا	اس پر مصیبت آئے تو گھبرایا، اور
وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا	جب کوئی دولت ملے تو بخیل، لیکن
اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ	وہ نمازی (ان باتوں سے پاک ہیں)
عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (معارج)	جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں،

آپ نے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنے والے کے لئے قرآن نے کن اخلاقی
برکتوں کی بشارت سنائی ہے،

نماز کے ان ہی ثمرات اور برکات کی بنا پر ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل مین صحابہؓ سے فرمایا کہ "اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے ایک صاف وشفاف نہر بہتی ہو جس مین وہ دن مین پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اُس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے؟" صحابہؓ نے عرض کی نہین یا رسولؐ اللہ، ارشاد ہوا کہ "نماز بھی اسی طرح گناہون کو دھو دیتی ہے جس طرح پانی میل کو"[1] ایک دفعہ ایک بدوی مسلمان نے آکر اپنے ایک گناہ کی معافی کی تدبیر پوچھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی[2]،

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ	اور دن کے دونون کنارون پر اور
وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ	رات کے کچھ ٹکڑون مین نماز کھڑی کیا
یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِکَ	کرو، بے شک نیکیان برائیون کو
ذِکْرٰی لِلذّٰکِرِیْنَ ،	دور کر دیتی ہین، یہ نصیحت ہے یاد
(ھود ۔ ۱۰)	رکھنے والون کو،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ مذہب اپنے پیرودن مین جس قسم کے جذبات اور محرکات پیدا کرنا چاہتا ہے، اُن کا اصلی سرچشمہ یہی نماز ہے، جو اپنے صحیح آداب وشرائط کے ساتھ بجا لائی گئی ہو، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا ہے، جس کے گر جانے سے پوری عمارت کا گر جانا یقینی ہے،

---

[1] یہ حدیث مختلف کتابون مین مختلف روایتون کے ساتھ آئی ہے، کنز العمال (جلد ۴ صفحہ ۶۷ و ۶۸) مین حاکم، احمد، ابن خزیمہ، طبرانی، اور بیہقی کے حوالون سے یہ تمام روایتین یکجا مذکور ہین،

[2] صحیح بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ وتفسیر سورۂ ہود،

نماز کے لئے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت

جس طرح مادّی عالم کے کچھ قانون ہین جن کی پابندی اور رعایت سے ہمارے اعمال کے صحیح نتائج پیدا ہوتے ہین، اسی طرح انسان کی اندرونی دنیا جسکو مذہب "قلب کا عالم" اور فلسفہ "نفسیات" یا "دماغی کیفیات" کہتا ہے، اس کے لیے بھی کچھ قانون اور اسباب ہین جن کی پابندی اور رعایت سے قلب و دماغ اور نفس و روح کے مطلوبہ اعمال و افعال سامنے آتے اور اُن کے صحیح نتیجے مترتب ہوتے ہین، سائیکالوجی (علم نفسیات) کے انکشاف اور ترقی نے اب اس گرہ کو بالکل کھول دیا ہے، اُس نے بتایا ہے کہ ہم اپنے یا دوسرون کے اندر جس قسم کے جذبات اور ولولے پیدا کرنا چاہین، اور اُن کے مناسب شکل و صورت، اور ماحول (گرد و پیش) نہ اختیار کرین، تو ہم کو اُن کے پیدا کرنے مین کامیابی نہین ہوسکتی، ہمارے تمام تمدنی اجتماعی اور معاشرتی قوانین اسی اصول کے تحت مین وضع ہوئے ہین اور اسی اصول کی بنا پر ہر قسم کے مذہبی، سیاسی، اور اجتماعی مقاصد کے حصول کے لئے رواجی رسوم و آداب اور قواعد و ضوابط مقرر ہین، معبدون، ہیکلون اور گرجون مین جہان مذہبی عظمت و تقدس پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، پجاریون اور کاہنون کے خاص لباس، خاص رسوم و آداب، سکون و خاموشی، ادب و لحاظ، گھنٹون کی پر شکوہ آواز، اور نشست و برخاست کے خاص طریقے ضروری سمجھے گئے ہین، شاہانہ رعب و داب کے اثرات پیدا کرنے کے لئے شاہی جلوسون اور سلطانی دربارون مین فوجون کے پرے، قوی ہیکل چوبدار، عصا بردار نقیب و چاؤش، خدام کی زرق برق پوشاکین ننگی تلوارین، بلند نیزے، تخت و تاج، علم و پرچم، ماہی مراتب، نوبت و نقارہ اور دمبدم دور باش اور نگاہ روبرو کی پر رعب صدائین ضروری ہین، کسی تعلیمی یا علمی میلان پیدا کرنے

کے لئے فضا کا سکون و خاموشی، مقام کی سادگی و صفائی، شور و غوغا، اور شہر و بازار سے دوری ضروری چیزیں ہیں، بزم عروسی کے لئے رنگ و بو، نور و سرور، گانا بجانا، اور عیش و نشاط کا اظہار طبعی ہے،

انہی طبعی و نفسی اصول کی بنا پر مذہبی اعمال میں بھی ان محرکات و آداب و قوانین کی رعایت رکھی گئی ہے، نماز سے مقصود دل کے خضوع و خشوع توبہ و انابت پشیمانی و شرمندگی، اطاعت و بندگی، اور خدا کی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی و درماندگی کا اظہار نیز دل و دماغ اور نفس و روح میں پاکی، صفائی اور طہارت پیدا کرنا ہے، اس بنا پر نماز کے لئے بھی ایسے آداب و شرائط اور ارکان مقرر کئے گئے جن سے انسان کے اندر اس قسم کے جذبات کو تحریک اور نشوونما ہو، مثلاً نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر کہ وہ اب شہنشاہ عالم کے دربار میں کھڑا ہے، ہاتھ باندھے رہے، نظر نیچی کئے رہے، طور و طریق اور حرکات و سکنات میں ادب و احترام کا لحاظ رکھے، نماز کی جگہ پاک ہو، بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، ادب سے اس کی بارگاہ میں اپنی دعاؤں اور التجاؤں کو پیش کرے، اس ظاہری مجموعی ہیئت کا اثر انسان کی باطنی کیفیت پر پڑتا ہے اور اس میں روحانی فیوض و برکات کی استعداد و صلاحیت پیدا ہوتی ہے، فرض کیجئے کہ ظاہری صفائی و پاکیزگی کا لحاظ نہ رکھا جائے، تو دل کی صفائی و پاکیزگی کا تصور اس کے اندر مؤثر انداز میں کیونکر پیدا ہوگا، یہی نفسی اصول ہے جو انسان کے ہر نظام اور ارادہ میں جاری و ساری ہے، اندر بنانے کے لئے باہر کا بنانا بھی ایک حد تک ضروری ہے، اسی اصول کی بنا پر تنہائی کی فرض نمازوں سے جماعت کی نماز، اور گھر کی نمازوں سے مسجد کی نماز بہتر ہے، کہ جماعت کا ماحول اور مسجد کا منظر دلوں کی کیفیت کو دوبالا کر دے گا، اسی بنا پر تمام

بڑے بڑے کاموں میں اجتماعیت اور نظام کی وحدت کا خیال رکھا جاتا ہے، اسی اصول کے تحت اسکولوں کی تنظیم، اور اُن کی درجہ بندی کھیل میں فریقین کی ہمرنگی وہم لباسی، فوجوں میں وردی اور حرکت وعمل کی یکسانی کی ضرورت سمجھی گئی ہے، اور یکساں اسلحہ اور ہتھیار، اور ہم قدم سکون رفتار کی بھی ضرورت ہے، کہ ان ظاہری محرکات کا اثر پوری جماعت کے اندرونی تخیل پر پڑتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت میں چند اشخاص ایسے ہوں جو اصلی کیفیت سے متکیف ہوں، اُن کی یہ حقیقی کیفیت اپنے اثر سے دوسروں کو بھی پرکیف بناتی ہے، اور ان سے دوسرا، اور دوسرے سے تیسرا متاثر ہوکر کم وبیش پوری جماعت متاثر ہوجاتی ہے، اسی لئے جلسوں میں ایک کی ہنسی سے سب کو ہنسی، اور ایک کے رونے سے بہتوں کو رونا آجاتا ہے، نفسیات اجتماع میں یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہے، غرض اسی سے اسلام نے اپنی عبادت کے لئے ان طبعی نفسی اصول کا بڑا لحاظ رکھا ہے، نماز کے آداب، شرائط اور ارکان انہی کا نام ہے،

ذکر ودعا وتسبیح کے دو طریقے

یہ بار بار دہرایا جاچکا ہے کہ نماز سے مقصود خضوع وخشوع، ذکر الٰہی، حمد وثنا، اپنے گناہوں پر ندامت واستغفار اور اسی قسم کے دوسرے پاک جذبات کی تحریک ہے، یہ تمام باتیں درحقیقت انسان کے دل سے تعلق رکھتی ہیں، جن کے لئے ظاہری ارکان کی حاجت نہیں ہے، اسی لئے اسلام نے اپنی عبادتوں کی دو قسمیں کی ہیں، ایک تو وہ جن کو انسان ہر حال اور ہر صورت میں کسی قید وشرط کے بغیر ادا کرسکے، اس کا نام عام تسبیح وتہلیل اور ذکر الٰہی ہے، جس کے لئے نہ زمانہ کی قید ہے، نہ مکان کی شرط ہے، نہ اٹھنے بیٹھنے کی پابندی ہے، یہ عبادت ہر لحظ اور ہر صورت میں انجام پاسکتی ہے، چنانچہ خدا نے فرمایا،

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِكُمْ، (نساء - ۱۵)

پس تم اللہ کو کھڑے بیٹھے اور لیٹے یاد کرو،

اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے صحابۂ کرام کی یہی حالت تھی، خدا نے اُن کی مدح فرمائی،

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ، (آل عمران - ۲۰)

جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے خدا کو یاد کرتے ہیں،

دنیاوی مشاغل اور ظاہری کاروبار بھی اُن کو اس فرض سے غافل نہیں کرتے، فرمایا

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ، (نور - ۵)

ایسے لوگ ہیں جن کو تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت کے مشاغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے،

نماز متحدہ طریق عبادت کا نام ہے

دوسری عبادت وہ ہے، جو خاص شکل وصورت کے ساتھ خاص اوقات میں اور خاص دعاؤں کے ذریعہ سے ادا کیجائے، اس کا نام نماز ہے پہلا طرزِ عبادت انفرادی چیز ہے، اور وہ ہر فرد کے جداگانہ انتخاب پر منحصر ہے، اس کو جماعتی حیثیت حاصل نہیں ہے، اور نہ اسلام میں اس کو جماعت کیساتھ ادا کرنا مسنون بتایا گیا ہے، وہ تنہائی کا راز ہے جس کو اس طرح خاموشی سے ادا کرنا چاہئے، کہ ریا اور نمایش کا شایبہ بھی پیدا نہ ہوسکے لیکن دوسری قسم کی عبادت درحقیقت جماعتی صورت رکھتی ہے، اور اسی لئے اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے، اور اس کے انکار پر قتل تک جائز ہوسکتا ہے، اگر اس کو جماعت کیساتھ کوئی شخص

ادا نہ کرے تو اگرچہ وہ ادا ہو جائے گی، لیکن جماعت کے ثواب اور برکات سے اس شخص کو محرومی رہیگی، دوسرے لفظون مین ہم اس کو یون تعبیر کرسکتے ہین کہ عام ذکر و فکر اور تسبیح و تہلیل انفرادی طرز عبادت ہی، اور نماز ایک جماعتی شعار ہے، جو خاص ارکان اور شرائط کے ساتھ اوقات مقررہ پر ادا ہوتی ہے، اور جس کے ادا کرنے کا جماعت کے ہر فرد کو ہر حالت مین حکم ہے، البتہ اگر کسی عذر کی بنا پر جماعت کے ساتھ ادا نہ ہو سکے تو تنہا بھی اس کو ادا کرنا ضروری ہے، اس کی مثال اس سپاہی کی سی ہے، جو کسی منزل مین اپنی فوج سے جس کے ساتھ اُس کو چلنا تھا کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا، اب تنہا رہ کر بھی اس کو وہی فرض ادا کرنا ہے جو پوری فوج کے ساتھ اس کو ادا کرنا پڑتا،

نماز مین نظامِ وحدت کا اصول

اسلام کے عام فرائض و احکام اور خصوصاً نماز اور اس کے متعلقات کی نسبت غور کرتے وقت ایک خاص اصول کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہئے، وہی اصول درحقیقت اسلام کا اصلی راز بلکہ سرّ الاسرار ہے، اسلام کی اصل حقیقت صرف ایک ہے اور وہ "توحید" ہے، یہ توحید نہ صرف ایک فلسفیانہ موشگافی اور صوفیانہ نکتہ پروری ہے، بلکہ وہ عملی کیفیت ہے، جس کو اسلام کے ایک ایک حکم سے آشکارا ہونا چاہئے، اسلام کے دوسرے احکام کی طرح نماز بھی اس حقیقت اور کیفیت کا مظہر ہے، نماز کی ایک ایک حرکت، ایک ایک جنبش ایک ایک لفظ، ایک ایک اشارہ، اور ایک ایک طرز سے اس حقیقت و کیفیت کو تراوش کرنا چاہئے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک نماز کی کوئی خاص شکل و صورت، آئین و طریق، اور سمت و وقت مقرر نہ کیا جاتا، جماعتین اس کو ایک متحدہ نظام مین ادا نہین کرسکتی تھین، نماز لاکھون کرورون مسلمانون پر جنھون نے دعوتِ محمدی کو قبول کیا فرض تھی، اب اگر ان مین سے ہر ایک کو یہ اجازت ہوتی

کہ جیسے چاہے، جب چاہے، جدھر منھ کرکے چاہے ادا کرلے، تو اسلام کی وحدت کا نظام قائم
نہ رہتا، اور نہ اس کے دل کی طرح اس کی جسمانی اداؤن سے بھی توحید کا راز آشکارا ہوتا اور نہ کل
روے زمین کے لاکھون کرورون مسلمان واحد جماعت کی مجسم صورت بن سکتے،

غرض اس نظام وحدت کا آشکارا و ہویدا کرنا، توحید کا سب سے بڑا رمز اور شعار ہے، اور کرورن
دلون کو جو کرورون اشباح و اجسام مین ہین، ایک متحد جسم اور واحد قالب ظاہر کرنا صرف اسی
طرح ممکن ہے کہ ان سے واحد نظام کے ماتحت، واحد صورت و شکل مین، واحد اعمال و افعال کا
صدور کرایا جائے، چنانچہ انسان کے تمام جماعتی نظامات کی وحدت اسی اصول پر مبنی ہے، قوم
کی وحدت، فوج کی وحدت، کسی بزم و انجمن کی وحدت، کسی مملکت و سلطنت کی وحدت غرض
ہر ایک نظام وحدت اسی اصول پر قائم ہے، اور اسی طرح قائم ہو سکتا ہے،

نماز مین جسمانی حرکات یہ بھی ظاہر ہے، کہ نماز کی اصل غرض و غایت چند پاکیزہ جذبات کا اظہار ہے
یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان کے اندر کوئی خاص جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے حسب حال
اس سے کوئی فعل یا حرکت بھی صادر ہوتی ہے، غصہ کی حالت مین چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، خوف
مین زرد پڑ جاتا ہے، خوشی مین کھل اٹھتا ہے، غم مین سکڑ جاتا ہے، جب وہ کسی سے سوال کرتا ہے
تو اس کے سامنے اپنے دونون ہاتھ پھیلا دیتا ہے، کسی کی تعظیم کرتا ہے، تو اس کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا
ہے، کسی سے عاجزی کا اظہار کرتا ہے، تو اس کے آگے جھک جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ اپنا
تذلل، فروتنی، اور خوشامد مقصود ہو تو منھ کے بل گرتا ہے، اور پاؤن پر سر رکھ دیتا ہے، یہ جذبات
کے اظہار کے فطری طریقے ہین، جو ہر قوم مین تقریباً یکسان رائج ہین، اس تشریح کے بعد اب یہ

سمجھنا چاہئے کہ جس طرح نماز کی دعائین انسانی طرزبیان مین ادا کی گئی ہین اس کے ارکان بھی انسان کے فطری افعال و حرکات کی صورت مین رکھے گئے ہین،

انسان کے قلبی افعال و اعمال کے مظاہر اُس کے جسمانی اعضا ہین، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ارادہ و نیت اور اس کے دلی جذبات و احساسات کے متعلق اُس وقت تک کچھ نہین کہہ سکتا جب تک اسکے ہاتھ پاؤن اور زبان سے اُن کے مطابق کوئی عمل یا حرکت ظاہر نہو اگر ایسا نہو تو ہر انسان اپنی نسبت ولایت اور خیر کُل ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہے، اور سوسائٹی کا کوئی ممبر اس کی تکذیب نہین کرسکتا لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح سوسائٹی کی بنیاد ہی سرے سے تباہ و برباد ہوجاتی ہے، اگرچہ انسان کے اندر کی ہر چیز اسی طرح خدا کے سامنے ہے جس طرح باہر کی، اور اس لئے خدا کو ظاہری اعمال کی ضرورت نہین، مگر خود بندون کو ان کی ضرورت ہے، کہ وہ اپنی ظاہری اور باطنی دونون حیثیتون سے عرض و التجا، اور تذلل و عاجزی کی تصویر بنجائین،

انسان اپنے جسم اور روح دونون کے لحاظ سے خدا کا مخلوق ہے، اس کی زندگی کے دونون جزو خدا کے احسانات و انعامات سے یکسان گران بار ہین، اس لئے ضرورت ہے، کہ اس خالق و رازق اور اس ارحم الراحمین کے سامنے روح اور جسم دونون جھک کر سجدۂ نیاز ادا کرین، غرض یہ وجوہ ہین جن کی بنا پر شریعت نے جسم و جان دونون کی رعایت کرتے ہوئے نماز کے ارکان مقرر کئے

اوپر گذر چکا ہے کہ انسان کے فطری اعمال و حرکات کے قالب مین نماز کا پیکر تیار کیا گیا ہے جسمانی طریقے سے ہم کسی بڑے محسن کی تعظیم اور اُس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار تین طریقون سے کرتے ہین، کھڑے ہوجاتے ہین، جھک جاتے ہین، زمین پر سر رکھدیتے ہین، نماز کے بھی یہی

تین رُکن ہین، چنانچہ آغازِ عالم سے انبیاے کرام علیہم السلام نے جس نماز کی تعلیم انسانون کو دی، وہ ان ہی تین اجزا سے مرکب تھی، کھڑے ہوجانا (قیام) جھک جانا (رکوع) اور زمین پر سر رکھدینا (سجدہ)

ارکانِ نماز | معلوم ہوچکا ہے کہ "نماز" ملتِ ابراہیمی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا کے گھر کی تعمیر و تطہیر کا حکم ہوا، تو ساتھ ہی اس کی غرض بھی بتائی گئی،

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ	اور میرے گھر کو طواف کرنے والون،
وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ،	کھڑے ہونے والون، رکوع کرنے والون،
(حج - ۴)	اور سجدہ کرنے والون کے لئے پاک و صاف کر،

اس حکم مین نماز کے تینون ارکان، قیام، رکوع اور سجود کا مفصل اور بہ ترتیب ذکر ہے، حضرت مریمؑ کا زمانہ سلسلۂ اسرائیلی کا آخری عہد تھا، اُن کو خطاب ہوا،

يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي	اے مریم اپنے رب کے حضور مین کھڑے
وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ ،	ہو کر بندگی کر، اور سجدہ کر، اور رکوع
(آل عمران - ۵)	کرنے والون کیساتھ رکوع کر،

اس نمازِ مریمی مین بھی، نماز کے تینون ارکان موجود ہین،

توراۃ کے حوالون سے بھی نماز کے مختلف ارکان کا پتہ چلتا ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ ترجمون نے عبرانی اور یونانی لفظون کے ترجمے اپنے خیالات اور رسم و رواج کے مطابق کر دیئے ہین، جس سے حقیقت کے چہرہ پر بڑی حد تک پردہ پڑجاتا ہے، بہرحال عبادت اور تعظیم کے تینون طریقے، حضرت ابراہیمؑ کی شریعت اور اُن کی نسل مین جاری تھے، ذیل مین ہم ان مین سے ہر ایک

کا حوالہ توریت کے مجموعہ سے نقل کرتے ہین،

قیام	"پر ابرہام (ابراہیم) ہنوز خداوند کے حضور مین کھڑا رہا" (پیدایش ۱۸-۲۲)
رکوع	"اور (ابراہیم) زمین تک اُن کے آگے جھکا، اور بولا اے خداوند" (پیدایش ۱۸-۲)
سجدہ	"اور یہ سُن کے کہ خداوند نے بنی اسرائیل کی خبرگیری کی، اور اُن کے دکھون پر نظر کی، انھون نے اپنے سر جھکائے، اور سجدے کیئے" (خروج ۴-۳۱)

"تب ابرہام (ابراہیم) منھ کے بل گرا، اور خدا اُس سے ہمکلام ہو کر بولا، (پیدایش ۱۷-۳)

"تب ابرہام (ابراہیم) نے اپنے نوجوانون سے کہا تم یہان گدھے پاس رہو، مین اس لڑکے کے ساتھ (اپنے فرزند کی قربانی کے لیے) وہان تک جاؤن گا، اور سجدہ کر کے پھر تمھارے پاس آؤنگا" (پیدایش ۲۲-۵)

"تب اُس مرد (حضرت اسحاق کا ایلچی) نے سر جھکایا اور خداوند کو سجدہ کیا اور اس نے کہا میرے خداوند ابرہام کا خدا مبارک ہو، (پیدایش ۲۴-۲۶)

"اور ایسا ہوا کہ جب داؤدؑ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا، جہان اس نے خدا کو سجدہ کیا" (۲ سموئل ۱۵-۳۲)

زبور مین حضرت داؤدؑ خدا تعالیٰ سے کہتے ہین:-

"اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کرونگا" (زبور ۵-۷)

ان حوالون سے بخوبی ثابت ہے کہ ابراہیمی ملت مین عبادت اور تعظیم الٰہی کے یہ تینون ارکان موجود تھے، اور اسلام نے اسی کی پیروی کی ہے، موجودہ انجیل مین دعا و نماز کا ذکر متی ۶-۵ و ۱۷-۲۱ و ۲۶-۳۶ مرقس ۱۴-۳۳ و لوقا ۲۲-۴۱ وغیرہ مین ہے، طریقۂ نماز مین ایک انجیل

میں ایک ہی موقع کے لئے گھٹنا ٹیکنا (جو گویا رکوع ہے) (لوقا ۲۲-۴۱) اور دوسری میں (متی ۲۶-۳۹) منہ کے بل گرنا یعنی سجدہ کرنا لکھا ہے اور بقیہ انجیلوں میں خاموشی ہے،

عہدِ بعثت میں یہود و نصاریٰ میں جو لوگ نماز کے پابند تھے، وہ بھی ان ارکان کو ادا کرتے تھے، کھڑے ہو کر توراۃ یا زبور کی آیتیں تلاوت کرتے تھے، اور سجدہ بھی کرتے تھے، قرآنِ پاک کی شہادت ہے،

لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ	وہ برابر نہیں ہیں اہلِ کتاب میں کچھ
أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيٰتِ اللّٰهِ	ایسے بھی ہیں جو رات کو خدا کی آیتیں
آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ	کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں، اور سجدے
(آل عمران - ۱۲)	کرتے ہیں،

روایات میں ہے کہ رکوع میں یہودیوں کی طرح دونوں ہاتھ جڑے نہ رہیں[1]، اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے یہود بھی نماز کے یہ مختلف ارکان ادا کرتے تھے،

اسلام کی نماز بھی ان ہی قدیم ارکان اور فطری شکل و صورت کے ساتھ فرض ہوئی جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد سے اب تک چلی آرہی تھی، چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مصنفین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اسلامی نماز اپنی ترکیب میں بہت حد تک یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے مشابہ ہے[2]"۔

اسلام نے صرف یہ کیا کہ اس خزانہ کو وقفِ عام کر دیا، انسانی آمیزشوں کو نکال کر اسے

---

[1] فتح الباری ابن حجر جلد ۲ صفحہ ۲۲۴ مصر، [2] مضمون صلوٰۃ جلد ۴ صفحہ ۹۶۔

ہوئے فریضون کو دوبارہ یاد دلایا، مٹے ہوئے نقش کو ابھار دیا، نماز کے بے جان پیکر مین حقیقت کی روح پھونک دی، اس مین اخلاص کا جوہر پیدا کیا، اس کو دین کا ستون بنایا، اور اپنی متواتر تعلیم و عمل سے اس کی ظاہری شکل و صورت کو بھی ہر انسانی تغیر سے محفوظ کر دیا، اس طرح اس نے اُس تکمیل کا فرض انجام دیا جس کے لئے وہ ازل سے منتخب تھا،

یہ مسئلہ کہ نماز مطلق تسبیح و تہلیل اور ذکر الٰہی کا نام نہین، بلکہ اس کے ساتھ کچھ ارکان بھی ہین، رسول اللہ صلعم اور صحابہؓ کے عمل متواتر کے علاوہ خود قرآن پاک سے بھی ثابت ہے، خوف اور جنگ مین نماز کے قصر اور ارکان کی تخفیف کی اجازت دی گئی ہے، اس کے بعد ہے کہ جب خطرہ جاتا رہے، تو نماز کو اُس طرح ادا کرو جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے،

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ	نمازون کی اور بیچ کی نماز کی نگہداشت
الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ	کرو، اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے
فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا	ہو، پھر اگر خوف ہو تو پیادہ یا سوار ہو کر
فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا	(پڑھو) پھر جب خوف جاتا رہے تو
عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ	اللہ کو ویسے یاد کرو جیسے اس نے تم کو
(البقرہ ۳۱ - ۳۱)	بتایا جو تم نہین جانتے تھے،

[illegible]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس ذکر الٰہی کا کوئی خاص طریقہ تھا جس کی عملی شکل نماز ہے اور اسی کی تفصیل سورۂ نساء مین ہے، اسی طرح جنگ کی نماز مین ایک رکعت امام کے ساتھ باقاعدہ ادا کرنے کے بعد، دوسری رکعت[1] کے متعلق کہا گیا ہے،

پس جب نماز (ایک رکعت) ادا کر چکو	فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ
تو اللہ کو اٹھتے بیٹھتے، اور پہلوون پر	قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ
یاد کرو، پھر جب اطمینان ہو جائے	فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
تو نماز کھڑی کرو،	(نساء - ۱۵۰)

اس آیت مین غور کرنے کی دو باتین ہین، اول یہ ہے کہ ایک رکعت جو باقاعدہ ادا ہوئی اس کو الصّلوٰۃ (نماز) کہا گیا، اور دوسری رکعت جو خدا کا نام اٹھ کر، بیٹھکر، جھک کر، لیٹے اور لڑائی حملہ اور مدافعت کی حالت مین پوری ہوئی، اُس کو صرف ذکر اللہ کہا گیا، دوسری بات یہ ہے کہ جنگ کی اس عارضی مخفف نماز کو "اقامت صلوٰۃ" (نماز کھڑی کرنا) کے لفظ سے ادا نہین کیا گیا، حالانکہ ذکر الٰہی، تسبیح و تہلیل، اور بعض ارکان بھی اس مین موجود تھے، بلکہ یہ فرمایا گیا کہ (پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو) اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ (نماز کھڑی کرنے) کے معنی مطلق ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد و ثنا اور تلاوت قرآن سے جداگانہ ہین، یعنی اقامت صلوٰۃ کے ضمن مین ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد و ثنا اور قرأت کے علاوہ کچھ اور ارکان بھی داخل ہین، جو جنگ کی حالت مین کم یا موقوف ہو گئے تھے، اور اب اس عارضی مانع کے دور ہو جانے کے بعد پھر بدستور نماز مین اُن کی بجا آوری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، یہی وہ ارکان تھے جن کے متعلق سورۂ بقرہ مین یہ کہا گیا تھا کہ جب خوف جاتا رہے تو پھر خدا کو اُس طرح یاد کرو جس طرح اُس نے بتایا ہے،

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اسلام مین نماز کن ارکان کے ساتھ مقرر ہوئی ہے، گو اس کیلئے یہ بالکل کافی ہے کہ آنحضرت صلعم نے تمام عمر خود کس طرح نماز پڑھی، اور صحابہ کو کس طرح کی نماز سکھائی

کیونکہ نماز کی یہ عملی کیفیت پورے تواتر کے ساتھ اس عہد سے لے کر آج تک موجود ہے، اور دوست و دشمن اور مخالف و موافق کو معلوم ہے، اور اسلام کے ہر فرقہ مین یکسان طور سے عملاً بلا اختلاف مسلم ہے، تاہم نظر پسند لوگون کے لئے قرآن پاک سے ان کا ثبوت بہم پہنچا دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

ہم پہلے رب العزت کی بارگاہ مین مؤدب کھڑے ہوتے ہین،

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ	نمازون پر (عموماً) اور بیچ کی نماز پر
الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ	(خصوصاً) نگاہ رکھو، اور خدا کے آگے
(بقرہ - ۳۱)	مؤدب کھڑے ہو،

نماز کا آغاز خدا کا نام لے کر کرتے ہین کہ

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ؕ (اعلیٰ - ۱)	اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی
وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ (مدثر - ۱)	اور اپنے رب کی بڑائی کر،

لفظ اللّٰہُ اَکْبَرُ جس کی نماز مین بار بار تکرار کیجاتی ہے، اسی حکم کی تعمیل ہے،

اس کے بعد خدا کی حمد و ثنا کرتے، اور اس سے اپنے گناہون کی بخشش چاہتے ہین،

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ	اور جب تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار
(طور - ۲)	کی حمد کی تسبیح کر،

پھر قرآن پڑھتے ہین،

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ	قرآن مین سے جتنا ہو سکے پڑھو،
(مزمل - ۲)	

قرآن کی اِن آیتون مین خدا کے اسمار اور صفات کا تذکرہ کرتے ہین، اور اس کی حمد خصوصیت کے ساتھ بیان کرتے ہین جس سے اس کی بڑائی (تکبیر) ظاہر ہوتی ہے،

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ	کہہ اللہ کو پکارو یا رحمان کو پکارو، جو
اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى	کہکر پکارو سب اچھے نام اسی کے ہین
وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ	اپنی نماز نہ بہت زور سے پڑھ، اور نہ
بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا	بہت چپکے، بیچ کی راہ تلاش کر، اور
وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ	کہہ کہ حمد اس اللہ کی جس نے کوئی بیٹا
يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ	نہین بنایا، اور نہ سلطنت مین کوئی
شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ	اُس کا شریک ہے، اور نہ درماندگی
لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ	کے سبب سے اس کا کوئی مددگار ہے
تَكْبِيْرًا، (اسرائیل-۱۲)	اور اس کی بڑائی کر، بڑی بڑائی،

چونکہ اس کی یہ حمد سورۂ فاتحہ مین بہ تمام وکمال مذکور ہے، اسی لئے اس سورہ کو ہر نماز مین پہلے پڑھتے ہین، اس کے بعد قرآن مین سے جتنا پڑھنا ممکن اور آسان ہوتا ہے، اس کو پڑھتے ہین، پھر خدا کے سامنے ادب سے جھک جاتے یعنی رکوع کرتے ہیں،

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ، (بقرہ-۵)	اور رکوع کرنے والون کیساتھ رکوع کرو

پھر اس کے آگے پیشانی کو زمین پر رکھ دیتے یعنی سجدہ کرتے ہین،

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا	اے ایمان والو! جھکو (رکوع کرو)

وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ	اور سجدہ کرو، اور اپنے رب کی
وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ	پرستش کرو، اور نیک کام کرو،
(حج - ۱۰)	تاکہ کامیاب ہو،

ان دونوں (رکوع وسجدہ) میں خدا کی تسبیح وتحمید کرتے ہیں،

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ	تو اپنے بزرگ پروردگار (ربِّ عظیم)
(واقعہ - ۲ - ۳)	کے نام کی تسبیح کر،
سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى،	اپنے برتر (ربِّ اعلیٰ) کے نام کی
(اعلیٰ - ۱)	تسبیح کر،

آنحضرت صلعم کی ربانی تعلیم کے مطابق پہلا حکم رکوع میں اور دوسرا سجدے میں ادا ہوتا ہے[1]، قیام، رکوع اور سجود کی یہ ترتیب سورۂ حج (۴ - ذکر ابراہیمؑ) اور آلِ عمران (۵ - ذکر مریم) سے اور یہ امر کہ سجدہ پر ایک رکعت تمام ہوجاتی ہے، سورۂ نساء (۱۵ - ذکر نمازِ خوف) سے ثابت ہے، درحقیقت ارکان کی یہ ترتیب بالکل فطری اور عقلی ہے، پہلے کھڑا ہونا، پھر جھک جانا، پھر سجدے میں گر پڑنا، اس میں خود طبعی اور فطری ترتیب ہی، تعظیم کی ابتدائی اور کثیر الوقوع شکل یہ ہوتی ہے، کہ آدمی کھڑا ہوجاتا ہے، جب کیفیات وجذبات میں گہرائی پیدا ہوجاتی ہے تو وہ جھک جاتا ہے، اور جب فرطِ بیخودی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے تو وہ اپنے بلند ترین حصۂ جسم (یعنی پیشانی) کو اپنے محسن اور معظم کے پست ترین حصۂ

[1] ابن ماجہ کتاب الصلوٰۃ باب التسبیح فی الرکوع والسجود،

جسم (یعنی پاؤن) پر رکھدیتا ہے، یہی سبب ہے کہ سجدہ نماز کی کیفیات کی انتہائی صورت ہے قرآن نے کہا؛

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ، (علق - ۱۰) اور سجدہ کر اور قریب ہو جا،

گویا سجدہ قربتِ الٰہی کی اخیر منزل ہے، شاید اسی لئے وہ ہر رکعت مین مکرر ادا کیا جاتا ہے،

نماز تمام جسمانی احکامِ عبادت کا مجموعہ ہے

قرآن پاک کی مختلف آیتون مین ہم کو مختلف قسم کی جسمانی، لسانی اور قلبی عبادتون کا حکم دیا گیا ہے، جسم کو ادب سے کھڑا رکھنے، پھر جھکانے اور سرنگون کرنے کا حکم ہے، مختلف دعاؤن کے پڑھنے کی تاکید ہے، خدا کی تسبیح و تحمید کا ارشاد ہے، دعا اور استغفار کی تعلیم ہے، دل کے خضوع و خشوع کا فرمان ہے، رسولؐ پر درود بھیجنے کا امر ہے، اس لئے نماز کی تشکیل اس طرح کی گئی کہ اس ایک عبادت کے اندر قرآن پاک کی تمام جسمانی، لسانی اور روحانی عبادتون کے احکام یکجا ہو گئے، اسی لئے ایک نماز قرآن کے تمام گوناگون جسمانی، لسانی اور روحانی عبادات کا مجموعہ ہے، دوسرے لفظون مین یون کہ سکتے ہین، کہ قرآنِ پاک مین مسلمانون کو قیام، رکوع، سجود، تہلیل، تسبیح، تکبیر، قرأتِ قرآن، ذکرِ الٰہی اور درود پڑھنے کے جو احکام عطا کئے گئے ہین، اُن کی مجموعی تعمیل کا نام نماز ہے، جس مین یہ تمام منفرد احکام مجموعی حیثیت سے انجام پاتے ہین، دوسری طرف ان احکام کی بجا آوری مین ایک ترتیب پیدا کی گئی ہے، کہ اگر وہ نہ ہوتی اور یہ کام انسانون کے ذاتی انتخاب پر چھوڑ دیا جاتا، کہ جو چاہے رکوع کرلے، جو چاہے سجدہ کرلے، جو چاہے صرف قیام کرے، جو چاہے زبان ہی سے ذکر و قرأت پر اکتفا کرلے اور جو چاہے صرف دل سے دھیان کر کے اس فرض سے ادا ہو جائے، تو ہر فرد سے فرائضِ الٰہی کے متعدد ارکان چھوٹ جاتے جن پر کبھی عمل نہ ہوتا، اور عجب نہین کہ افراد کی طبعی سُستی، اور

سہل انکاری ان پورے احکام کی تعمیل مین مانع آتی، سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مسلمانون کی عبادت کی واحد اور منظم شکل پیدا نہ ہوتی، نہ جماعت ہوسکتی، اور نہ نماز کو ایک مذہب کی عبادت خاص کہا جاسکتا، اور نہ جماعتی رمز وشعار کی وحدت کی شان اُس سے پیدا ہو کر مسلمانون کو واحد امت بناتی اور بتاتی،

اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے ذریعہ اپنے رسول کو اس عبادت کی عملاً تعلیم دی[1]، اور رسول نے امت کو سکھایا، اور امت نے نسلاً بعد نسلٍ موجودہ اور آیندہ نسل کو سکھایا، اور اس پورے تواترِ عمل کے ساتھ جس مین ذرا بھی شک وشبہہ نہین، وہ آج تک محفوظ ہے،

نماز کی دعا نماز کی مختلف حالتون مین اُن حالتون کے مطابق مختلف دعائین پڑھی جاتی ہین اور پڑھی جاسکتی ہین، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کی مختلف حالتون کی بیسیون مختلف دعائین مروی ہین، اور ہر مسلمان اُن مین سے جو چاہے پڑھ سکتا ہے، لیکن نماز کی وہ اصلی دعا جس سے ہمارے قرآن کا آغاز ہوتا ہے جس کے نماز مین پڑھنے کی تاکید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، جس کو آپ نے تمام عمر نماز کی ہر رکعت مین پڑھا ہے، اور اُس وقت سے لے کر آج تک تمام مسلمان پڑھتے آئے ہین، وہ سورۂ فاتحہ ہے، جو مقاصدِ نماز کے ہر پہلو پر حاوی اور محیط ہے، اسی لئے وہ اسلام مین نماز کی اصلی دعا ہے، یہ وہ دعا ہے، جو خدا نے بندون کی بولی مین اپنے منھ سے ادا کی،

حمد ہو اس اللہ کی جو سب جہانون کا	اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ

[1] مؤطا امام مالک و صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ،

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ يَوْمِ	پروردگار ہے، رحم والا مہربان ہے
الدِّيْنِ ۙ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ	ہمارے عمل کے بدلے کے دن کا مالک
نَسْتَعِيْنُ ۙ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ	(ہے) (اسے آقا!) ہم تجھی کو پوجتے ہیں
الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ	اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں، تو ہم کو سیدھا
عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ	راستہ چلا، ان کا راستہ جن پر تو نے فضل
وَلَا الضَّآلِّيْنَ ؀	کیا، اُن کا راستہ نہیں جنپر غضب آیا، اور
(فاتحہ - ۱)	نہ ان کا جو بہک گئے۔

(اس دعا کو ختم کر کے آمین کہتے ہیں یعنی اسے خدا تو اس کو قبول کر۔)

یہ وہ دعا ہے جس کو ہر مسلمان، ہر نماز میں دہراتا ہے جس کے بغیر ہر نماز ناتمام اور ادھوری رہتی ہے[1]، یہ دعا اسلام کی تمام تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے، خدا کی حمد و ستایش ہے، توحید ہے، اعمال کی جزا و سزا کا یقین ہے، عبادت کے مخلصانہ ادا کا اقرار ہے، توفیق و ہدایت کی طلب ہے، اچھوں کی تقلید کی آرزو اور بروں کی پیروی سے بچنے کی تمنا ہے، جس وقت اس حمد میں خدا کی پہلی صفت "کل جہانوں کا پروردگار" زبان پر آتی ہے، تو اُس کی تمام قدرتیں اور بخششیں جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں سب سامنے آجاتی ہیں، "جہانوں" کی وسعت کے تخیل سے اوسکی عظمت اور کبریائی کی وسعت کا تخیل پیدا ہوتا ہے، "سارے جہانوں کے ایک ہی پروردگار" کے تصور سے کل کائنات ہستی کی برادری کا مفہوم ذہن میں آتا ہے، انسان ہوں کہ حیوان،

---

[1] جامع ترمذی، قرأت فاتحہ،

چرند ہون کہ پرند، پھر انسانون مین امیر ہون یا غریب، مخدوم ہون یا خادم، بادشاہ ہون یا گدا، کالے ہون یا گورے، عرب ہون یا عجم، کل مخلوقات خلقت کی برادری کی حیثیت سے یکسان معلوم ہوتی ہے، خدا کو "رحمان ورحیم" کہکر پکارنے سے اس کی بے انتہا رحمت بے پایان شفقت، غیر محدود بخشش اور ناقابلِ بیان کیف محبت کا سمندر دل کے کوزہ مین موجین مارنے لگتا ہے، "روزِ جزا کے مالک" کا خیال ہم کو اپنے اپنے اعمال کی ذمہ داری اور مواخذہ سے باخبر، اور خدا کے جلال وجبروت سے مرعوب کردیتا ہے، "ہم تجھی کو پوجتے ہین" کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بیخ وبُن سے اکھاڑ دیتے ہین، "ہم تجھی سے مدد مانگتے ہین"، بول کر ہم تمام دنیاوی سہارون اور بھروسون کو ناچیز سمجھتے اور صرف خدا کی طاقت کا سہارا ڈھونڈھتے، اور سب سے بے نیاز ہوکر اسی ایک کے نیازمند بنجاتے ہین، سب سے آخر ہم اس سے سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہین، یہ سیدھی راہ (صراط مستقیم) کیا ہے؟ اس کی شریعت کے احکام ہین،

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ	کہدے (اے پیغمبر) آؤ مین تم کو پڑھ کر
عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا	سناؤن جو تمھارے رب نے تم پر حرام
وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ج وَ	کیا ہے، یہ کہ اس کے ساتھ شرک نہ
لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ	کرو، ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، غربت
اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ	کے سبب اپنی اولاد کو قتل مت کرو،
وَاِيَّاهُمْ ج وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ	ہم تم کو اور ان کو روزی دیتے ہین،

مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا
تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ
إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ، وَلَا تَقْرَبُوا
مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ
حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۖ وَأَوْفُوا
الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ
لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا
وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ
ذَا قُرْبَىٰ ۖ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا
ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُونَ ، وَأَنَّ هَٰذَا
صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ

(انعام - ۱۹)

بے حیائی کی باتوں کے نزدیک جاؤ
خواہ وہ ظاہر ہیں (فحش) ہوں یا
باطن میں اور جس جان کو خدا نے محترم
کیا ہے اس کو مت مارو، لیکن انصاف
کے ساتھ، یہ وہ باتیں ہیں جن کا حکم
خدا نے تم کو دیا ہے، شاید کہ تم سمجھو،
اور یتیم کے مال کے پاس مت جاؤ
لیکن اچھی نیت سے، یہانتک کہ وہ
اپنی قوت کو پہنچ جائے، اور ناپ اور
تول کو انصاف کے ساتھ پورا رکھو،
ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کا
حکم نہیں دیتے، جب تم بات بولو تو انصاف
کی، اگر وہ تمھارا عزیز ہی کیوں نہ ہو، اور
خدا کے عہد کو پورا کرو، یہ وہ باتیں ہیں
جن کا خدا نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت
پکڑو، اور بے شبہ یہی ہے میرا سیدھا راستہ (صراطِ مستقیم) تو تم اسی کی پیروی کرو،

ان آیات نے واضح کر دیا کہ وحیِ محمدیؐ کی اصطلاح میں "صراطِ مستقیم" کیا ہے، یعنی شرک نہ
کرنا، ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک، اولاد کے ساتھ اچھا برتاؤ، ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائیوں سے

بچنا، معصوم اور بے گناہ جانون کی عزت کرنا (ناحق قتل نہ کرنا) یتیم کے ساتھ احسان، ناپ تول مین ایمانداری، بلا رو رعایت سچ بولنا، اور عہد کا پورا کرنا، یہ وہ صفات عالیہ ہین جنکو "صراط مستقیم" کی مختصر سی ترکیب توصیفی مین ہم خدا سے روزانہ مانگتے ہین، جو اخلاق کا جوہر اور نیکی کی روح ہین۔

یہی وہ صفات حسنہ ہین جن سے خدا کے وہ خاص بندے متصف تھے، جن پر اُس کا فضل وانعام ہوا، یہ خاص بندے کون ہین؟ قرآن پاک نے اس کی تشریح بھی خود کر دی ہے،

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ		اور جو خدا اور رسول کے حکم پر چلتے
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ		ہین، تو وہ اُن لوگون کے ساتھ ہین
اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ	(نساء-۹)	جن پر خدا کا فضل اور انعام ہوا یعنی
وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ		نبی، صدیق، شہید، اور صالح لوگ
وَالصّٰلِحِيْنَ ج وَحَسُنَ		ان کی رفاقت کیسی اچھی ہے،

اس بنا پر ہر نمازی جس طراط مستقیم اور راہ راست کے لئے دعا کرتا ہے، وہ نیکی کی وہ شاہراہ ہے، جس پر خدا کے تمام نیک بندے (انبیاء، صدیقین، شہداء، اور صالحین) علی قدر مراتب چل چکے،

سیدھے راستہ سے ہٹنا دو طرح سے ہوتا ہے، (۱) افراط (زیادتی) کے سبب سے، اور (۲) تفریط (کمی) کے سبب سے، افراط یہ ہے کہ خدا کی شریعت مین ہم اپنی طرف سے بدعتون کا اضافہ کرین، یہ گمراہی ہے، اور تفریط یہ ہے کہ خدا کے احکام پر عمل چھوڑ دینا، اس سے خدا کا غضب قوم پر نازل ہوتا ہے، اور ہر قسم کا انعام واکرام چھین لیا جاتا ہے،

پہلی صورت کی مثال نصاریٰ ہین، جنھون نے دین مین اپنی طرف سے ہزارون باتین اضافہ کردین، دوسری کا نمونہ یہود ہین جنھون نے احکام الٰہی کو پسِ پشت ڈال دیا، اور ہر قسم کے انعام واکرام سے محروم ہوگئے، مسلمانون کی دعا یہ ہے، کہ الٰہی ہم کوان دونون غلط راستون سے بچانا اور اعتدال کی شاہراہ پر قائم رکھنا،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی یہ دعا، (سورۂ فاتحہ) دین و دنیا کی دعاؤن کی جامع، جسم و روح کی نیکیون پر مشتمل اور اخلاق و ایمان کی تعلیمات کو محیط ہے، اس مین خدا کی حمد بھی ہے اور بندے کی التجا بھی، اسی لئے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے صحابہؓ سے اس کی نسبت فرمایا،

"جو نماز مین اس سورہ کو نہ پڑھے، اس کی نماز ناقص اور نامکمل ہے، خدا فرماتا ہے کہ نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصّون مین بٹی ہوئی ہے، آدھی میرے لئے ہے، اور آدھی اس کے لئے، بندہ جب الحمد للّٰہ رب العٰلمین، (حمد ہو سارے جہانون کے پروردگار کی) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے" میرے بندہ نے میری ستایش کی"، پھر جب وہ الرحمٰن الرحیم (مہربان رحم والا) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے" میرے بندہ نے میری تعریف کی" پھر وہ کہتا ہے، مالک یوم الدین (نیک و بد کی جزا کے دن کا مالک) تو خدا فرماتا ہے" میرے بندہ نے میری بڑائی ظاہر کی" اتنا میرا حصہ ہے، اور میرے اور میرے بندہ کے درمیان مشترک یہ ہے، کہ" ایاک نعبد و ایاک نستعین" (ہم تجھی کو پوجتے ہین، اور تجھی سے مدد چاہتے ہین) اور اس کے بعد آخر تک (کہ ہم کو صراطِ مستقیم دکھا) میرے بندہ کی دعا ہے اور میرے بندہ نے جو مانگا وہ اس کو ملا[1]"

[1] جامع ترمذی تفسیر فاتحہ و مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۲۴۲ (مصر)

اس حدیثِ قدسی کے آئینہ مین اسلامی نماز کی اُس دعا کا جو دلکش و دلفریب نظارہ نظر آتا ہے وہ روح مین نشاط اور دل مین سرور پیدا کرتا ہے، یہ وہ کیفیت ہے جس کا ایک دھندلا سا تصور ایک عیسائی یوروپین فاضل اے جی وینسنک (A.G.WENSINCK) کو بھی جس نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مین اسلامی نماز پر ایک پُرمعلومات مضمون لکھا ہے، تھوڑی دیر کے لئے ہو جاتا ہے، وہ لکھتا ہے:-

"(اسلام کے روسے) نماز حضورِ قلب کے ساتھ ادا ہونی چاہئے، ایک دفعہ محمدؐ نے ایک پُرنقش و نگار کپڑے کو اس لئے اتار دیا کہ اس سے نماز مین توجہ بٹتی ہے، یہ واقعہ کہ نماز صرف ظاہری رسوم ادا کرنے کا نام نہین، بلکہ اس مین دلی خضوع و خشوع کی بھی ضرورت ہے، اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے، جس مین محمدؐ نے کہا ہے، کہ "مجھے تمھاری دنیا کی دو چیزین پسند ہین، خوشبو اور عورت اور میری آنکھون کی ٹھنڈک نماز ہے" محمدؐ پر نمازون مین گریہ طاری ہو جانا بھی بعض اوقات منقول ہے، نماز کی ایک سب سے اعلیٰ خصوصیت وہ ہے، جس کو ہم ان دو حدیثون مین پاتے ہین جن مین بیان ہے کہ "نماز خدا سے سرگوشی اور مکالمہ ہے" اور اس کی تشریح ہم کو اس حدیثِ قدسی مین ملتی ہے، کہ "سورۂ الحمد میرے اور میرے بندہ کے درمیان بٹی ہوئی ہے[1]"

اس دعاے محمدی کا موازنہ دوسرے انبیا کی منصوص دعاؤن سے

دنیا مین کوئی پیغمبر ایسا نہین آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو، اور نماز مین پڑھنے کے لئے کوئی دعا تعلیم نہ کی گئی ہو، کوہِ طور پر جلوۂ ربانی کے وقت

[1] یہ حدیث اوپر گذر چکی،

حضرت موسیٰؑ نے نماز میں جو دعا پڑھی تھی وہ توراۃ کی کتاب خروج میں موجود ہے، زبور تو شروع سے آخر تک دعاؤں کا مجموعہ ہی ہے، مگر اس میں ایک خاص دعا پر یہ عنوان بھی لکھا نظر آتا ہے کہ "داؤد کی نماز" انجیل میں حضرت عیسیٰؑ اپنی وداعی شب میں حواریوں کو ایک خاص دعا کی تعلیم دیتے ہیں، جو آج تک عیسائیوں کی نماز کا اصلی جزء ہے، ان دعاؤں کو سامنے رکھ کر محمد رسول اللہ کی زبانِ وحی ترجمان کے ذریعہ سے آئی ہوئی دعا کی تاثیری کیفیت، حسن تعبیر، جامعیت پاکیزگی، اور اختصار کا اندازہ ہوگا، اور پتہ چلیگا کہ اسکی کیا بے مثالی ہے جس کے سبب سے نمازوں میں پڑھنے کے لئے اسی کا انتخاب ہوا؟ اسی لئے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی نسبت اپنے ایک صحابی حضرت اُبیؓ سے فرمایا تھا کہ نماز میں جو سورہ تم پڑھتے ہو یعنی اُم القرآن قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ وہ نہ توراۃ میں اتری نہ انجیل میں نہ زبور میں، اور نہ اس کے مثل کوئی دوسری چیز خود قرآن میں موجود ہے[1] اس حدیث کی صحت اور صداقت کا یقین خود ان دعاؤں پر ایک نظر ڈالنے سے ہوگا،

حضرت موسیٰؑ کی نماز کی دعا

توراۃ کی کتاب الخروج میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ توراۃ لینے اور ربانی تجلی کا ایک تماشا دیکھنے کے لئے کوہ طور پر چڑھے، اور تجلی نظر آئی تو فوراً خدا کا نام لیتے ہوئے سجدہ میں گر پڑے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ دعا تعلیم کی،

> خداوند، خداوند، خدا، رحیم، اور مہربان، قہر میں دھیما اور لطف اور وفا میں ابدی، ہزار پشتوں کے لئے فضل رکھنے والا گناہ اور تقصیر اور خطا کا بخشنے والا لیکن وہ ہر حال میں معاف نہ کریگا

---

[1] جامع ترمذی، فضائلِ سورۂ فاتحہ،

بلکہ باپون کے گناہ کا بدلہ ان کے فرزندون سے اور فرزندون کے فرزندون سے،
تیسری اور چوتھی پشت تک لے گا" (۳۴-۶)

اس دعا کے ابتدائی فقرے اگرچہ نہایت مؤثر ہین لیکن خاتمہ نہایت مایوس کن ہے پہلے فضل و رحمت کی امید دلا کر آخر مین باب اجابت پر قفل چڑھا دیا ہے،

زبور مین حضرت داؤدؑ کی نماز کی دعا، | زبور باب ۸۶،

داؤد کی نماز

"اے خداوند! اپنا کان جھکا اور میری سُن کہ مین پریشان اور مسکین ہون، میری جان کی حفاظت کر کہ مین دیندار ہون، اے تو کہ میرا خدا ہے اپنے بندہ کو کہ جس کا توکل تجھ پر ہے، رہائی دے، اے خداوند مجھ پر رحم کر کہ مین تمام دن تیرے آگے نالہ کرتا ہون، اپنے بندہ کے جی کو خوش کر کہ اے خداوند مین اپنے دل کو تیری طرف اٹھاتا ہون، کیونکہ تو اے خداوند بھلا ہے، اور بخشنے والا ہے، اور تیری رحمت ان سب پر جو تجھ کو پکارتے ہین، وافر ہے،

اے خداوند! میری دعا سُن اور میری مناجات کی آواز پر کان دھر، مین اپنے بپت کے دن تجھ کو پکارون گا، کہ تو میری سنیگا، معبودون کے درمیان اے خداوند تجھ سا کوئی نہین، اور تیری صنعتین کہین نہین، اے خداوند! ساری قومین جنھین تو نے خلق کیا، آئینگی، اور تیرے آگے سجدہ کرین گی، اور تیرے نام کی بزرگی کرین گی کہ تو بزرگ ہے اور عجائب کام کرتا ہے، تو ہی اکیلا خدا ہے،

اے خداوند! مجھ کو اپنی راہ بتا، مین تیری سچائی مین چلون گا، میرے دل کو یکطرفہ کر، تاکہ مین تیرے نام سے ڈرون، اے خداوند! میرے خدا، مین اپنے سارے دل سے تیری ستایش کرون گا، اور ابد تک تیرے نام کی بزرگی کرونگا کہ تیری رحمت مجھ پر بہت ہے، اور میری روح کو اسفل پاتال سے نجات دی ہے،

اے خدا! مغرورون نے مجھ پہ چڑھائی کی ہے اور کٹر لوگون کی جماعت میری جان کے پیچھے پڑی ہے، اور انھون نے مجھ کو اپنی آنکھون کے سامنے نہین رکھا، لیکن تو اے خداوند خدا رحیم و کریم اور برداشت کرنے والا ہے، اور شفقت اور وفا مین بڑھ کر ہے، میری طرف توجہ ہو اور مجھ پر رحم کر، اپنے بندہ کو اپنی توانائی بخش، اور اپنی لونڈی کے بیٹے کو نجات دے، مجھے بھلائی کا کوئی نشان دکھا، تاکہ وہ جو میرا کینہ رکھتے ہین، دیکھین اور شرمندہ ہون، کیونکہ تو نے اے خداوند میری مدد کی اور مجھے تسلی دی"

اس دعا مین بھی وہی خدا کی حمد و صفت اور توحید و عبادت کا ذکر، راہِ راست کی ہدایت کی طلب اور شریرون اور گمراہون سے بچائے جانے کی درخواست ہے لیکن طول تکرار اور دعا مانگنے والے کی شخصیت کا رنگ غالب ہونے کے سبب سے یہ ہر انسان کی دعا نہین بن سکتی، اور نہ اس کا طول اس کو ہر وقت کی نماز مین پڑھے جانے کی سفارش کرتا ہے؛

انجیل مین نماز کی دعا | حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام حواریون کو دعا اور نماز کے آداب بتا کر یہ دعا تعلیم کرتے ہین،

"اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے، تیرا نام مقدس ہو، تیری بادشاہت آوے"

تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے، زمین پر بھی پوری ہو، ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے، ہم
ہمارے قرض ہمیں معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قرضدارون کو معاف کرتے ہین، اور ہمین
آزمایش مین مت ڈال بلکہ برائی سے بچا، کیونکہ بادشاہت اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرا ہی
ہے" آمین،

نام کی "تقدیس" خدا کی "حمد" ہے، "بادشاہت کے آنے" سے مقصود شاید قیامت، اور اعمال
کے فیصلہ کا دن ہے، جو دعاے قرآنی مین مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے لفظ سے ادا ہوا ہے،
نیز استعارہ کی زبان مین "روز کی روٹی" سے مراد دنیاوی روٹی نہ لیجاے، بلکہ روح کی غذا
صراطِ مستقیم لیجاے، اور "قرض" سے مراد فرائض اور حقوق لئے جائین جو خدا کی طرف سے انسانون
پر عائد ہین، "آزمایش" مین نہ پڑنے اور "برائی" سے بچنے کے معنی وہی لئے جاسکتے ہین، جو اسلامی
دعا کے خاتمہ مین مذکور ہے کہ "نہ اُن کا راستہ ہے جن پر تیرا غضب آیا اور جو سیدھے راستہ سے
بہک گئے ہین"

اس تشریح سے مقصود یہ ہے کہ یہ چارون دعائین جو چار اولوالعزم پیغمبرون کی زبان
نبوت سے ادا ہوئین، کسی قدر معنوی اشتراک کی وجہ سے باہم وہی نسبت رکھتی ہین، جو تکمیل
دین کے مختلف مدارج مین کسی کو نظر آسکتی ہے، دعاے محمدی تکمیلی شکل کی آئینہ دار ہے، وہ مختصر
تاثیر سے لبریز ہے، خدا کی تمام صفاتِ کاملہ کا مرقع ہے، تمام مقاصد اور احکامِ شریعت کی جامع
ہے، اس کے الفاظ مین ایسی عالمگیری ہے، جو ہر وقت اور ہر حالت مین ہر انسان کے دل کی
نمایندگی کرسکتی ہی، وہ ایسے استعارات سے پاک ہی، جو ظاہر بینون کی لغزش کا باعث ہون

اور خدا کو انسانون سے رحم و کرم کی صفت "قرض" لینے پر آمادہ کرتے ہون، نیز وہ خدا کی رحمتِ عام کو ایسے عنوان سے ادا کرتی ہے، جس مین کائنات کا ایک ایک ذرہ داخل ہے، خدا کی وہ تین صفتین جنکا تصور کئے بغیر خدا کا تصور پورا نہین ہو سکتا، (یعنی ربوبیت، رحمت، اور مالکیت) یہ سورہ ان سب کی جامع ہے، ربوبیت مین وہ تمام صفتین داخل ہین جنکا تعلق پیدائش سے لیکر موت تک ہر مخلوق کے ساتھ قائم رہتا ہے، رحمت اس کی وہ عالمگیر صفت ہے، جس مین اس کی تمام جمالی صفتون کی نیرنگیان ظاہر ہوتی ہین، مالکیت اس کی تمام جلالی صفتون کا مظہر ہے اور پوری سورہ دعا کے اغراضِ ثلاثہ حمد، اچھائیون کے لئے درخواست، اور برائیون سے بچنے کی التجا پر مشتمل ہے، طرزِ بیان خدا اور بندہ کے شایانِ شان ہے، درخواستین حد درجہ مودبانہ ہین اوصافِ الٰہی وہی ہین جو ایک دعا کے مناسب ہو سکتے ہین، دعا مین عموم ہے، وہ ذاتیات تک محدود نہین ہے، للٰہیت اور روحانیت کا کمال، منتہائے نظر ہے، اس لئے دنیاوی چیزون کا ذکر نظر انداز کیا گیا ہے، خدا کے اوصاف اور بندہ کی التجاؤن مین کمیت اور کیفیت دونون حیثیتون سے تناسب موجود ہے یعنی دونون حصون نے مناسبت کیساتھ جگہ گھیری ہے، اور دونون ٹکڑون کے مضامین مین ربط اور تعلق قائم ہے، خدا کے عظمت و جلال، رحم و کرم، قدرت و شوکت، شفقت و رافت، اور بندہ کے خشوع و خضوع، بلند حوصلگی، صداقت طلبی کا ایسا جامع، مختصر، اور پُر اثر بیان سورۂ فاتحہ کے سوا اور کہان مل سکتا ہے؟

نماز کے لئے تعیینِ اوقات کی ضرورت

نماز کے سلسلہ مین اسلام کا ایک اور تکمیلی کارنامہ اوقاتِ نماز کی تعیین ہے، ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی کام وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد نہین

ہو سکتا، اس لئے کسی کام کے کرنے کے لئے وقت سے بے نیازی ممکن نہین، اب سوال یہ ہے کہ کیا نماز کے لئے خاص خاص اوقات کی تعیین ضروری تھی ؟ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم جس دین کامل کو لے کر مبعوث ہوئے، اسکی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عملی ہے، محض نظری نہین اس نے نماز کی تعلیم دی، تو محض اصول اور نظریات کے لحاظ سے نہین، بلکہ اس لئے کہ انسان روزانہ مختلف اوقات مین اس فرض کو ادا بھی کرے، انسان کی نفسی (سائیکولاجیکل) خصوصیت یہ ہے کہ جو کام مداومت کیساتھ اس کو کرنا ہوتا ہے، جب تک وہ اس کے اوقات نہ مقرر کر لے کبھی وہ اس کو مستعدی کے ساتھ بلاناغہ انجام نہین دے سکتا، اسی لئے ہر منظم، باقاعدہ، اور دائمی عمل کے لئے اوقات کی تعیین ضروری ہے، اور یہی طریقہ تمام دنیا نے اپنے باقاعدہ اور منظم کامون کے لئے اختیار کیا ہے، اس مین اصلی راز یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی کام کے کرنے کے لئے ۲۴ گھنٹون کی مہلت ہے، تو وہ ہمیشہ سستی اور کاہلی سے اس کام کو ایک وقت سے دوسرے وقت پر ٹالتا جاتا ہے، یہانتک کہ دن تمام ہو جاتا ہے، اور آخری گھڑی بھی گذر جاتی ہے، اور وہ اس کام کو انجام نہین دیتا، لیکن جب کامون کے لئے اوقات متعین ہو جاتے ہین تو ہر مقررہ وقت کی آمد انسان کو اس وقت کا کام یاد دلاتی ہے، اور وہ وقت گذرنے نہین پاتا کہ دوسرے کام کا وقت آجاتا ہے، اس طرح وقت کا فرشتہ ہر وقت انسان کے فرائض کو یاد دلاتا رہتا ہے اور تمام کام پابندی کے ساتھ بلاناغہ انجام پاتے جاتے ہین،

اوقاتِ نماز کے تقرر مین وہ چیز بھی مدنظر ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے یعنی اصول وحدت جو اسلام کا اصلی رمز اور شعار ہے، مسلمان مختلف شہرون، ملکون، اور اقلیمون مین ہزارون

لاکھون اور کرورون کی تعداد مین آباد ہین، مگر یہ کثرت ایک خاص وقت اور ایک خاص حالت مین وحدت کا مرقع بنجاتی ہے، کرۂ ہوا مین لگی ہوئی دوربین سے اگر زمین کی طرف دیکھو تو ایک خاص وقت مین لاکھون کرورون انسانون کو ایک ہی وضع مین ایک ہی شکل مین خالق عالم کے سامنے سرنگون پاؤگے، اور جہانتک مطلع و مغرب مین نمایان فرق نہ ہوگا یہی منظر آنکھون کے سامنے رہیگا، مختلف ملکون مین طلوع وغروب کا اختلاف اگر اس وحدت کے رنگ کو کامل نہین ہونے دیتا، تو کم از کم اتنی وحدت تو یقینی ہے کہ جس وقت جس حالت مین ایک جگہ آفتاب ہوتا ہے، جب دوسری جگہ بھی اسی حالت مین ہوتا ہے تو نماز کا فرض اس وقت وہان ادا ہوتا ہے، یہ وحدت ظاہر ہے کہ اوقات کے تقرر کے بغیر ممکن نہ تھی، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو صفحۂ ارضی تو کجا ایک محلہ اور ایک گھر کے مسلمان بھی ایک جگہ اور ایک حالت مین نظر نہین آسکتے تھے،

نماز کے اوقات دوسرے مذہبون مین

اسی لئے اوقات کے تقرر اور تعیین کی اس مصلحت کو دنیا کے تمام مذہبون نے یکسان تسلیم کیا ہے، اور اپنے اپنے نظریون اور اصولون کے مطابق عبادتون کے مختلف اوقات مقرر کر رکھے ہین، ہندو آفتاب کے طلوع وغروب کے وقت پوجا پاٹ کرتے ہین، زردشتی صرف طلوع آفتاب کے وقت زمزمہ خوان ہوتے ہین، رومن کیتھولک عیسائی صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے، پھر شام کو پھر رات کو سوتے وقت دعا مانگتے ہین، یہودیون مین تین وقت کی نمازین ہین، جنکو "تفلا" کہتے ہین، دانیال نبی کی کتاب مین ہے،

"جب دانیال کو معلوم ہوا کہ نوشتہ پر دستخط ہوگئے تو وہ اپنے گھر آیا، اور اپنی کوٹھری کا

دروازہ جو بیت المقدس کی طرف تھا کھول کر اور دن بھر مین تین مرتبہ گھٹنے ٹیک کر خدا کے حضور مین جس طرح سے پہلے کرتا تھا دعا اور شکر گذاری (حمد) کرتا رہا . . . . . .

پہ ہر روز وہ تین بار دعا مانگتا ہے" (۶ - ۱۰ تا ۱۳)

حضرت داؤدؑ کی زبور مین ان تین وقتون کی تعیین ان لفظون مین ملتی ہے؛

"پر مین خدا کو پکارون گا، تب خدا مجھے بچا لے گا، شام کو اور صبح کو اور دوپہر کو مین فریاد کرونگی، اور نالہ کرون گا، سو وہ میری آواز سُن لیگا" (۵۵ - ۱۶ و ۱۷)

اسلامی اصطلاح مین ہم ان کو فجر، ظہر اور مغرب کی نمازین کہہ سکتے ہین،

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے دعاؤن اور نمازون کی اہمیت اور زیادہ بڑھائی، لوقا کی انجیل مین ہے،

" پھر اس نے (حضرت عیسیٰؑ نے) اس لئے کہ ان کو ہمیشہ دعا مین لگے رہنا اور سستی نہ کرنا ضرور ہے، ایک تمثیل کہی" (۱۸ - ۱)

حواریون کے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی شریعت مین بھی نماز کے کچھ اوقات وہی تھے جو یہودیون مین تھے، اور کچھ اور زیادہ تھے، ظہر کی نماز اُن کے ہان بھی تھی، چنانچہ اعمال مین ہے؛

"پطرس دوپہر کے قریب کوٹھے پر دعا مانگنے گیا" (اعمال ۱۰ - ۹)

لیکن ان کے علاوہ بعض اوقات بڑھائے بھی گئے، ایک جگہ ہے،

"پس پطرس اور یوحنا ایک ساتھ دعا کے وقت تیسرے پہر ہیکل کو چلے" (اعمال ۳ - ۱)

یونانی مین تیسرے پہر کے بجائے "نوین گھڑی کو" لکھا ہے جس کو ہم عصر کہتے ہین، پھر اسی وقت کی نماز کا ذکر اعمال ۱۰-۳۰ مین بھی ہے،

ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ کے کسی شاگرد نے نماز کی خاص دعا دریافت کی آپنے بتائی اور فرمایا کہ دعا کا بہترین وقت آدھی رات ہے،

"اور ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگ رہا تھا جب مانگ چکا ایک نے اس کے شاگردون مین سے اس سے کہا کہ اے خداوند ہم کو دعا مانگنا سکھا، جیسا کہ یوحنا (حضرت یحییٰؑ) نے اپنے شاگردون کو سکھایا، اس نے ان سے کہا جب تم دعا مانگو تو کہو . . . .

اس نے ان سے کہا تم مین سے کون ہے جس کا ایک دوست ہو اور وہ آدھی رات کو اسکے پاس آکے کہے اے دوست مجھے تین روٹی ادھار دے" (لوقا-۱۱)

اس تمثیل مین حضرت عیسیٰؑ نے رات کی نماز کی تعلیم دی ہے، چنانچہ جس شب کو انھین گرفتار کیا گیا، وہ ایک جماعت کے ساتھ اسی نماز تہجد مین مصروف تھے، (لوقا ۲۲-۳۹)

صبح کی نماز کا ذکر بھی انجیل مین موجود ہے، مرقس کے پہلے باب کی ۳۵ آیت مین ہے "اور بڑے تڑکے پو پھٹنے سے پہلے وہ اٹھ کے نکلا اور ایک ویران جگہ مین گیا اور وہان دعا مانگی" بلکہ عربی ترجمہ سے جو براہ راست یونانی سے ہوا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوامًا اس وقت نماز پڑھا کرتے تھے، چنانچہ اس مین اس آیت کا عربی ترجمہ یہ ہے، وفی الصبح باکرا قام وخرج الی موضع خلاء وکان یصلی ھناک، یعنی وہ وہان نماز پڑھا کرتے تھے،

لہ مطبوعہ لندن ۱۶۶۵ء ص ۲ مطبوعہ مطبعہ ادبیہ بیروت ۱۸۸۶ء و مطبع آکسفورڈ ۱۸۹۰ء،

اب ان اوقات کو جو یہودی اور عیسوی مقدس کتابون مین مذکور ہین ہم جمع کرلین تو وہی اسلامی نماز کے اوقات ہوجائین گے جن مین سے صبح (فجر) دوپہر (ظہر) اور شام (مغرب) کا ذکر زبور (۵۵-۱۶ و ۱۷) مین صبح کا مرقس (۱-۳۵) مین، عصر کا اعمال (۳-۱ و ۱۰-۳ و ۳۰) مین ہے اور عشا، رات کی نماز کا لوقا (۱ و ۲۲-۳۹) مین!

نماز کے لئے مناسب فطری اوقات

اصل یہ ہے کہ حق تو یہ تھا کہ انسان بھی فرشتون کی طرح شب و روز صرف دعا و نماز مین مصروف رہتا، مگر انسان کی فطری و نوعی ضرورتون کے سبب سے ایسا ہونا ممکن اور مناسب نہ تھا، اس لئے شریعت نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اس کیلئے چند مناسب اوقات مقرر کر دیئے، ہر انسان ہر روز مختلف قسم کے کامون مین اپنی عمر کے ۲۴ گھنٹے بسر کرتا ہے، صبح کو بیدار ہوتا ہے، دوپہر تک کام کرکے تھوڑی دیر سستاتا ہے، پھر سہ پہر تک وہ اپنا بقیہ کام انجام دیتا ہے، اور اس کو تمام کرکے سیر و تفریح اور دلچسپ مشاغل مین دل بہلاتا ہے، شام ہوتی ہے تو گھر آکر خانگی زندگی کا آغاز کرتا ہے، اور کھا پی کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام اور غفلت کی نیند کے لئے تیار ہوتا ہے، اسلامی نمازون کے اوقات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل کے ہر آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے، تاکہ پورے اوقات خدا کی یاد ہی مین محسوب ہون، نور ظہور کے وقت جب صبح کی نسیم سحری حیّ علی الصّلاۃ کا نغمۂ جانفزا سناتی ہے اور ہر شے کی زبان سے عالم کے صانع کی تسبیح و تحمید کا ترانہ بلند ہوتا ہے، تو یہ وقت غافل انسانون کے سر جھکانے کے لئے بھی نہایت موزون ہے، کہ کتاب زندگی مین حیات امروزہ کا ایک نیا ورق اس وقت

کھلتا ہے، اس لئے مناسب ہے، کہ اس دن کے کارناموں کی لوح پر سب سے پہلے سجدہ نیاز کا طغرا نقش ہو، اس کے بعد انسان اپنی محنت و مشقت کا آغاز کرتا ہے، اور دوپہر تک اس مین مصروف رہتا ہے، دوپہر کو روزانہ کاروبار کا نصف حصہ ختم کرکے آدمی تھوڑی دیر کے لئے آرام کرتا ہے، اس موقع پر بھی اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے، کہ دن کا آدھا کام بخیر و خوبی ختم ہوگیا، پھر سہ پہر کے بعد جب اپنے اس دن کا کام ختم کرکے سیر و تفریح اور ذاتی آرام کے کام شروع ہوتے ہین تو یہ وقت بھی ایک دفعہ خدا کا نام لینے کا ہے، اس کے بعد شام ہوتی ہے، جو دنیا کے انقلاب کا دوسرا منظر پیش کرتی ہے، دن بھر کے کامون کے بعد اب آرام و سکون کا دور شروع ہوتا ہے اس لئے ضرور ہے کہ اس کا سرنامہ بھی عبودیت کا سجدہ ہو، پھر سوتے وقت جب انسان اپنی یا احساس زندگی سے کچھ دیر کے لئے بے خبر ہونے لگتا ہے، تو مناسب ہے کہ وہ خدا کا نام لیکر اس جہان سے بے خبر ہو، کیونکہ اسے کیا معلوم کہ اس وقت کی ان بند ہونے والی آنکھون کو پھر کبھی کھلنا بھی نصیب ہوگا، اسی طرح آخر عمر تک روزانہ کام کے یہ پہیے اپنی جگہ پر گھومتے رہتے ہین،

صبح سے دوپہر تک انسان کی مصروفیت کے اصلی گھنٹے ہین، اسی لئے صبح سے زوال تک کوئی فرض نماز نہین رکھی گئی، اسی طرح عشا سے لیکر صبح تک کوئی فرض نماز نہین ہے یہ وقت صرف خواب راحت کے لئے موزون ہے، ان خاص اوقات کو چھوڑ کر بقیہ اوقات تمامتر انسان کے کام کے ہین ان ہی کام کے اوقات کے شروع مین نماز پنجگانہ مقرر ہوئی ہے،

اسلامی اوقاتِ نماز مین ایک نکتہ

اوقاتِ نماز کی تعیین مین اسلام کے لئے ایک اور اصول کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری تھا، دنیا کے مشرکانہ مذاہب کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ انسانون کے شرک کا سب سے بڑا مظہر جسدِ کائنات کا سب سے زیادہ تابناک چہرہ (آفتاب) ہے، ہندوستان، ایران، بابل، عرب، مصر، شام، روم، یونان، ہر جگہ سورج کی پرستش کیجاتی تھی، جس کی روشنی قلوبِ انسانی کی تاریکی کا سب سے بڑا سبب بنتی تھی، آفتاب پرست قومون مین آفتاب کی پرستش کے خاص اوقات مقرر تھے، جب وہ صبح کو اپنے شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوتا ہے، پھر جب وہ آہستہ آہستہ مملکتِ نیمروز کو فتح کرکے دنیا پر اپنے فاتحانہ تسلط کا اعلان کرتا ہے، پھر شام کو جب وہ عالمِ کائنات سے رخصت ہو کر نقابِ شب مین اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے،

سب سے پہلا موحّد جس نے آفتاب پرستی کا چراغ گل کیا، حضرت ابراہیم خلیل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے[1]، ملتِ ابراہیمی مین نماز کے وہ اوقات مقرر کئے گئے، جب ستارہ پرستون کے خدائے اعظم (آفتاب) کے ظہور اور عروج کا نہین، بلکہ اس کے زوال اور غروب کا وقت ہوتا ہے، تاکہ یہ اوقات خود زبانِ حال سے شہادت دین کہ یہ آفتاب پرستی کے باطل عقیدہ کے خلاف اُس خدائے برحق کی عبادت ہے، جس کے آستانۂ کمال کے سجدہ سے خود آفتاب کی پیشانی بھی داغدار ہے، دینِ محمدی ملتِ ابراہیمی کا دوسرا نام ہے، اس لئے اس مین بھی نماز کے اوقات وہی رکھے گئے جو ملتِ ابراہیمی مین تھے، دن نکلنے سے پہلے جب باطل پرستی

[1] قرآن پاک سورۂ انعام - ۹ ۔

کا یہ دیوتا (آفتاب) پردۂ عدم مین روپوش ہوتا ہے، دوپہر کے بعد جب یہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچکر انحطاط اور تنزل کی طرف جھکتا ہے اس انحطاط اور تنزل کے بھی تین دور ہوتے ہین، جب سر (سمت الراس) سے نیچے اترتا ہے، جس کو زوال کہتے ہین، جب آنکھون کے دائرۂ تقابل سے نیچے اترتا ہے، جس کو عصر کہتے ہین، اور پھر جب دائرۂ نظر (افق) سے نیچے گرتا ہے جس کو مغرب کہتے ہین، آفتاب کے ان تینون اوقاتِ انحطاط مین ایک ایک نماز ادا ہوتی ہے، خوب اچھی طرح ڈوبنے کے بعد جب وہ تاریکی کی قبر مین مدفون ہوجاتا ہے، اُس وقت عشا کی نماز ادا کی جاتی ہے، اسی لئے قرآن پاک مین نماز کے اوقات کے ذکر مین آفتاب کے ڈھلنے اور تاریک ہونے کا خاص طور سے ذکر آیا ہے،

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ	نماز کھڑی کر، آفتاب کے انحطاط کے وقت
إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْاٰنَ	رات کی تاریکی تک (ظہر، عصر، مغرب
الْفَجْرِ (اسرائیل - ۹)	عشاء) اور فجر کی نماز،

(تفصیل آگے آتی ہے)

غرض یہی سبب ہے کہ اسلام مین کوئی فرض نماز صبح سے دوپہر تک نہین رکھی گئی کہ یہ آفتاب کے عروج کا وقت ہے، بلکہ تمام نمازین آفتاب کے ہر تدریجی انحطاط، تنزل اور روپوشی کے اوقات مین ہین، نیز یہی سبب ہے کہ اسلام مین آفتاب نکلتے وقت اس کے عروج و کمال کے وقت، اور اس کے ٹھیک غروب کے وقت نماز پڑھنا منع ہے کہ آفتاب پرستون کی عبادت کے خاص اوقات ہین[1]،

[1] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ، الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا ۱۲

اسلام مین طریق و اوقاتِ نماز

نماز کس طرح اور کن کن اوقات مین اور کے کے رکعتین کرکے پڑھنی چاہئے اور اس کے کیا کیا آداب و شرائط ہین، ان سب کے لئے قرآنِ پاک مین ایک جامع آیت ہی، جو لڑائی کی حالت مین نماز ادا کرنے کی تفصیل کے سلسلہ مین مذکور ہے،

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلٰوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ	نمازون پر اور بیچ کی نماز پر پابندی کرو،
الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ	اور اللہ کے لئے (نماز مین) ادب سے
فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا	کھڑے ہو، پھر اگر (دشمنون کا) خوف
فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ	ہو تو پیادہ ہو کر، یا سوار ہو کر (نماز پڑھو)
كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا	پھر جب تم کو امن ہو جائے تو خدا کو
تَعْلَمُوْنَ ٥	اس طرح یاد کرو، جس طرح اس نے
(بقرہ - ۳۱)	تم کو سکھایا جس سے تم پہلے واقف نہ تھے

اس آیتِ پاک سے یہ بات بتصریح ظاہر ہوتی ہے، کہ ان باتون کی کہ ہم کو نماز کس طرح اور کن اوقات مین اور کتنی رکعتون کے ساتھ پڑھنی چاہیے، خود اللہ تعالیٰ نے اسی طرح تعلیم فرمائی ہے، جس طرح خود قرآنِ پاک کی، اس اجمال کی تفصیل سنّتِ نبویؐ کے ذریعہ احادیث مین تحریرًا، اور مسلمانون کے نسلًا بعد نسلٍ متفقہ تواترِ عمل مین عملًا موجود ہے، اور قرآنِ پاک مین اس کے عملی حوالے اور متعلقہ احکام مذکور ہین،

نمازون کی پابندی و نگرانی

اس سلسلہ مین سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نمازون کو پابندی سے ادا کرین، ان کی نگہداشت رکھین، اور ان پر مداومت کرین، قرآنِ پاک مین نماز کی

پابندی، نگہداشت اور مداومت کے لیے ایک خاص لفظ "محافظت" کا استعمال کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی نگرانی کے ہیں، اور جس کی وسعت میں پابندی سے ادا کرنا، وقت پر ادا کرنا، اور بشرائط ادا کرنا سب داخل ہیں، فرمایا،

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ، (بقرہ-۳۱)	نمازوں کی نگرانی رکھو،
وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ، (معارج-۱)	اور جو اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں،
وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُونَ، (مومنین-۱)	اور جو لوگ اپنی نمازوں کی نگرانی رکھتے ہیں،
وَهُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ، (انعام-۱۱)	اور وہ اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں،

ایک آیت میں یہ بھی فرمایا،

اَلَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ، (معارج-۱)	جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں،

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ نماز ایسا فرض ہے جو کسی مسلمان سے کسی حال میں معاف نہیں ہو سکتا اور اس کو ہمیشہ پابندی کے ساتھ وقت پر، اور اس کے سارے شرائط کے ساتھ ادا کرنا چاہیے،

نماز کے اوقات مقرر ہیں اس کے بعد یہ مسئلہ ہے کہ نماز کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ اوقات مخصوص فرمائے ہیں، ارشاد ہے،

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ	بے شبہہ نماز مسلمانوں پر مقررہ اوقات

كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا، (نساء - ۱۵) مین فرض ہے،

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ہماری فرض نمازون کے لئے اوقات مخصوص ہین،

وہ اوقات کیا ہین | ادائے نماز کے لئے قرآن نے زیادہ تر تین لفظ استعمال کئے ہین، صلوٰۃ یا اقامت صلوٰۃ، تسبیح، اور ذکر اللہ، پہلا لفظ اقامت صلوٰۃ نماز کے لئے مخصوص ہے لیکن دوسرا اور تیسرا لفظ عام تسبیح و تحمید اور یاد الٰہی اور نماز کے لئے بولا جاتا ہے، جس کا جزو اعظم تسبیح و تحمید ہے، احادیث مین بھی تسبیح کے معنی نماز پڑھنے کے ہین،[1] اور اشعار عرب[2] و لغت عرب[3] سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے، قرآن مین جب اس لفظ (تسبیح) کے ساتھ وقت کی تخصیص ہوگی تو اس سے کسی شبہہ کے بغیر نماز کے علاوہ کوئی اور چیز مراد نہین ہوسکتی، کیونکہ وقت مخصوص کے ساتھ اسلام مین نماز کے علاوہ کوئی عام تسبیح فرض نہین ہے، البتہ اوقات کی تخصیص کے بغیر قرآن نے جہان تسبیح کا حکم دیا ہے، اس سے خدا کی عام یاد و توصیف مراد ہوسکتی ہے،

اس تمہید کے بعد حسب ذیل آیتون پر نظر کرنی چاہئے،

۱- قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗٓ	۱- رات کو کھڑا رہا کر، مگر کچھ کم، یا آدھی
اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا اَوْ زِدْ	رات یا اس سے کچھ گھٹا دے یا بڑھا دے،

[1] صحیح مسلم باب صلوٰۃ الضحیٰ، ما رأیت رسول اللہ صلعم یصلی سبحۃ الضحیٰ قط، وانی لاسبحھا نیز صحیح مسلم باب جواز النافلۃ علی الدابۃ و باب وکنت اسبح فقام قبل ان اقضی سبحتی،

[2] اعشیٰ وائل کا شعر ہے:-

وسبح علی حین العشیات والضحی ولا تحمد الشیطان واللہ فاحمدا

(شعراء الجاہلیۃ جلد ۳ صفحہ ۳۶۵) [3] لسان العرب جلد ۳ صفحہ ۳۰۱، مصر

عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا، (مزمل-۱) اور قرآن (اس میں) ٹھہر ٹھہر کر پڑھو،

۲- وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ، (المومن-۲)	۲- اور اپنے پروردگار کی حمد سہ پہر اور صبح کو کرو،
۳- وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا، (احزاب-۶)	۳- اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو کیا کرو،
۴- وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا، (فتح-۱)	۴- اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو بیان کرو،
۵- وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ، (اعراف-۲۴)	۵- اور تو اپنے پروردگار کو اپنے دل میں گڑگڑا کر اور ڈر کر، اور پست آواز میں صبح کو اور سہ پہر کو یاد کر، اور بھولنے والوں میں سے نہ ہو،
۶- وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ (انعام-۶)	۶- اور (اے رسول) اُن کو مت نکال جو اپنے پروردگار کو صبح کو اور سہ پہر کو پکارتے ہیں،
۷- فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ،	۷- ان گھروں میں جن کے بلند کرنے کا حکم خدا نے دیا ہے، اور اس کا کہ ان میں خدا کا نام لیا جائے، اور اُن میں وہ لوگ

رِجَالٌ ، الآیۃ
(نور-۵)

جن کو دنیا کا کاروبار خدا سے غافل نہیں کرتا صبح اور سہ پہر کو خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں

۸- وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ ، (کہف-۴)

۸- اور تو (اے رسول) اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رہ جو اپنے پروردگار کو صبح اور سہ پہر کے وقت پکارتے ہیں

۹- وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ، (طور-۲)

۹- اور تو اپنے پروردگار کی حمد کی پاکی بیان کر، جب تو اٹھتا ہے، اور رات کے کچھ حصہ میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت ،

۱۰- وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ، (ھود-۱۰)

۱۰- اور نماز کو قائم کر دن کے دونوں کناروں میں، اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں

۱۱- اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ، وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ، (اسرائیل-۹)

۱۱- نماز قائم کر آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی ابتدائی تاریکی تک، اور فجر کا پڑھنا بیشک فجر کا پڑھنا حضوری ہے اور رات کو کچھ دیر جاگ کر مزید نماز پڑھ، (تہجد)

۱۲- وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّ

۱۲- اور اپنے پروردگار کا نام یاد کر،

اَصِیْلًا وَمِنَ الَّیْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ	صبح کو، سہ پہر کو، اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ
وَسَبِّحْهُ لَیْلًا طَوِیْلًا ، (دھر-۲)	کر، اور بڑی رات تک اسکی تسبیح کر،
۱۳- فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَ	۱۳- کافرون کے کہے پر صبر کر، اور اپنے
سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ	پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے
الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ	سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے،
اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ	اور رات کے کچھ حصون مین اس کی تسبیح
لَعَلَّكَ تَرْضٰی ، (طٰہٰ-۸)	پڑھ، اور دن کے کنارون مین، تاکہ تو خوش ہو۔
۱۴- فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ	۱۴- تو خدا کی تسبیح پڑھو جب شام کرو اور
وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ، وَلَهُ الْحَمْدُ	جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمانون اور
فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا	زمین مین، اور سہ پہر کو، اور جب تم دوپہر
وَّحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ ، (روم-۲)	کرو،
۱۵- فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ	۱۵- تو ان کافرون کے کہے پر صبر کر، اور
بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ	اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے
وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ، وَمِنَ الَّیْلِ	سے پہلے، اور ڈوبنے سے پہلے، اور کچھ
فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ، (ق-۳)	رات مین تسبیح پڑھ اور ڈوبنے کے بعد[1]
۱۶- مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِیْنَ	۱۶- فجر کی نماز سے پہلے، اور جب دوپہر

[1] جمہور کے نزدیک اس کا ترجمہ ہوگا "سجدہ کے بعد" اور عام اہلِ تفسیر نے اس سے فرض نمازون کے بعد کی تسبیح و تہلیل مراد لی ہی،

تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ — کی گرمی کے سبب سے کپڑے اتارتے ہو،

وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ، (نور-۸) — اور عشاء کی نماز کے بعد،

ان اوپر کی آیتوں میں نماز کے مختلف اوقات کا ذکر ہے، ان میں سے بعض مکرر ہیں، اور بعض نہیں، مکرر اوقات کو ملا دینے کے بعد یہ وہی پانچ وقت ہو جاتے ہیں جنہیں رسول اللہ صلعم تمام عمر نماز ادا فرماتے رہے، اور آپ کے بعد آپ کے صحابہؓ، اور اس وقت سے لیکر آج تک تمام روئے زمین کے مسلمان نسلاً بعد نسلٍ ادا کرتے آئے ہیں، اور جن کے مشہور نام فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشا ہیں، غدو، غداۃ، بکرہ، فجر، قبل طلوع الشمس، اور حین تصبحون کے معنی صبح کی نماز، اصیل، عشی اور قبل غروب شمس سے مراد عصر، دلوک الشمس (زوال) اور حین تظہرون (جب دوپہر کرو) سے مقصد ظہر، طرف النہار (دن کا کنارہ) اور تمسون (جب شام کرو) سے مراد مغرب، اور من آناء اللیل (کچھ رات گذرے) غسق اللیل (رات کی ابتدائی) تاریکی، اور صلوٰۃ العشاء سے مقصود عشا کی نماز ہے، اور یہی نماز کے پانچ اوقات ہیں جنہیں خدا کی یاد اور تسبیح و تحمید کا ہم کو حکم دیا گیا ہے،

اوقات کی تکمیل

نمازون کے اوقات کی تدریجی تکمیل

اسلام کا آغاز سب کو معلوم ہے، کہ کس غربت مظلومی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا تھا، اس لئے ابتدائی زمانہ مین دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی، لوگ صرف رات کو کہین ادھر اودھر چھپ کر دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے، سورۂ مزمل مین جو مکہ کی نہایت ابتدائی سورتون مین ہے، یہ آیتین آئی ہین،

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا
قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ
قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ
الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۭ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ
قَوْلًا ثَقِيْلًا ۭ اِنَّ نَاشِئَةَ
الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْـاً وَّاَقْوَمُ
قِيْلًا ۭ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ
سَبْحًا طَوِيْلًا ۭ (مزمل - ۱)

اے کملی اوڑھ کر سونے والے! تھوڑی دیر
کے علاوہ ساری رات اٹھ کر نماز پڑھا کر،
آدھی رات تک یا اس سے کچھ کم یا اس سے
(کچھ) زیادہ، اور اس مین قرآن ٹھہر ٹھہر کر
پڑھ، ہم تجھ پر عنقریب ایک بھاری بات
ڈالنے والے ہین یعنی (شریعت کے مفصل
احکام اتارنے والے ہین) بیشک رات کو
اٹھ کر نماز پڑھنے مین طمانیت قلب کا زیادہ موقع ہے
اور قرآن سمجھکر پڑھنے کیلئے زیادہ مناسب ہے، بے شبہہ تجھکو دن کے وقت آرام کی فرصت حاصل ہے،

نماز کا یہ طریقہ غالبًا ان تین برسوں تک رہا جب اسلام کی دعوت برملا نہیں دیجا سکتی تھی، کیونکہ جہاں وَاَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ، (شعراء ۱۱۰) (اپنے قریب کے اہلِ خاندان کو ہشیار کرو) کے ذریعہ سے دعوت کے اعلان کا حکم آیا ہے، وہیں پر بھی اسی کے بعد مذکور ہے،

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ	اور غالب مہربان پر بھروسہ رکھ، جو
الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ	تجھ کو اس وقت دیکھتا ہے جب تو
وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ	(نماز کے لئے) اٹھتا ہے، اور نمازیوں
إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ،	میں تیرا پھرنا دیکھتا ہے، بیشک وہی
(شعراء ۱۱)	سنتا اور جانتا ہے،

اس کا مقصد یہ ہے کہ اعلانِ دعوت کا حکم ملنے سے پہلے آنحضرت صلعم ان دشمنوں کے بیچ میں راتوں کو اٹھکر خود نماز پڑھتے تھے، اور مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے کہ کون نماز میں مصروف ہے، اور کون سویا ہوا ہے جس کو نماز کے لئے جگانا چاہئے، ایسی پرخطر حالت میں آپ کا راتوں کو تن تنہا یہ فرض انجام دینے کے لئے نکلنا اس اعتماد پر تھا کہ خدا آپ کو خود دیکھ رہا ہے، اور آپ کی حفاظت کر رہا ہے، اس کے بعد جب جب تہ اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکمیل کی طرف بڑھا، اور رات کی طویل نماز (تہجد) کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشا) اور تاروں کے جھلملاتے وقت بھی ایک نماز (فجر) اضافہ کی گئی،

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ	اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار رکھ، بیشک
بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ	تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، اور

حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ	اپنے رب کی تعریف کی تسبیح کر، جب تو
وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ،	نماز کو کھڑا ہو اور کچھ رات کے حصہ مین
(طور - ۲)	اُس کی تسبیح کر، اور ستارون کے پیٹھ پھیرتے وقت،

یہ آیت سورۂ طور کے آخر مین ہے، اور سورۂ طور کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مکہ مین نازل ہوئی تھی[1]، اور شاید اس وقت جب قریش نے آنحضرت صلعم کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا، کیونکہ اس سورہ مین اسی آیت سے پہلے آپ کے مصائب، اور اُن پر صبر کرنے اور فیصلۂ الٰہی کے انتظار کا حکم اور آپ کی ہر قسم کی حفاظت کی خوشخبری ہے، ابھی تک یہ رات کی نمازون کی تفریق ہے، سورۂ دہر مین جو جمہور کے نزدیک مکی ہے، اور غالبًا سورۂ طور کے بعد اتری ہے، ان ہی معنون کی ایک اور آیت ہے، جس مین ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب کی ایک نماز جس کو عصر کہئے اور بڑھتی ہے،

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ	تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا انتظار کر،
مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ، وَاذْكُرِ اسْمَ	اور ان مخالفون مین سے کسی گنہگار یا ناشکر گذار کا کہنا نہ مان، اور صبح کو
رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ،	اور تیسرے پہر کو اپنے پروردگار کا نام
وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَ	لیا کر، اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر، اور
سَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ،	رات کو دیر تک اس کی تسبیح کیا کر،
(دھر - ۲)	

[1] صحیح بخاری تفسیر طور واقعہ جبیر بن مطعم،

اب رات کی دیر تک کی نمازِ تہجد کے علاوہ تین وقتوں کی تصریح ہے یعنی صبح، اخیر دن اور ابتدائی شب، مگر ہنوز "اصیل"[1] میں ظہر و عصر اور مِنَ الَّيْلِ (رات) میں مغرب اور عشا کی تفریق نہیں ہوئی تھی، کیونکہ کل تین نمازیں تھیں، ایک فجر کے وقت، ایک سہ پہر کو، اور ایک رات کو، اسی لئے ابھی تک باقی دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا، جیسا کہ آیت بالا سے ظاہر ہے،

اب یہ ان تین وقتوں کی تسبیح وتحمید، باقاعدہ نماز کا قالب اختیار کرتی ہے حکم ہوتا ہے،

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَ	دن کے دونوں کناروں میں (یعنی فجر
زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ، (ھود-۱۰)	اور عصر) اور رات کے ایک ٹکڑے میں[2]

یہ آیت سورۂ ہود کی ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہے، اس میں اکثر انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ بیان کرکے کہ انھوں نے اپنی اپنی امت کو خدائے برحق کی عبادت کی دعوت دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نماز کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے، اور غالباً نماز کے اوقات کے سلسلہ میں پہلی آیت ہے، جس میں "تسبیح" کے بجائے باقاعدہ "صلوٰۃ" کی اقامت کا حکم آیا ہے، اس وقت مسلمانوں کی خاصی تعداد تھی، جیسا کہ اس سے پہلے کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے،

---

[1] "اصیل" دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں عام کتب لغت میں لکھا ہے کہ وہ وقت جو عصر کے بعد سے مغرب تک ہو اس کو اصیل کہتے ہیں، لسان العرب میں اصیل کے معنی "عشی" لکھے ہیں، جو عصر کے لئے سورۂ روم میں استعمال ہوا ہے، [2] طرفی النہار کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں ادا کیا گیا ہے، قبل طلوع الشمس و قبل غروبہا، بالعشی والابکار، بالغدو والآصال، اس میں پہلا طرف فجر، بکرۃ، اور غدوہ ہے، دوسرا طرف عصر، عشی اور اصیل ہے،

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا،
(ھود — ۱۰)

پس تو سیدھا چلا چل، جیسا کہ تجھکو حکم دیا گیا ہے، اور وہ جنھون نے تیرے ساتھ توبہ کی (وہ بھی سیدھے چلین) اور تم لوگ حد سے آگے نہ بڑھو،

اب رات کی طویل نماز کو چھوڑ کر تین نمازین باقاعدہ فرض ہوتی ہین، ایک دن کے ایک کنارہ مین یعنی رات کے خاتمہ کے قریب تارون کے جھلملاتے وقت، دوسری دن کے دوسرے کنارے مین دن کے خاتمہ کے قریب، اور تیسری رات کے ابتدائی حصہ مین، پہلی سے صبح کی نماز، دوسری سے عصر کی جس کو پہلے اصیل کہا گیا تھا، اور تیسری سے عشا کی نماز مراد ہے، ابھی تک دن اور رات کی نمازون مین اجمال اور ابہام تھا، دوسری مین ظہر و عصر، اور تیسری مین مغرب و عشا کی نمازین چھپی ہوئی تھین، اب رات کی نمازین سب سے پہلے علحدہ ہوتی ہین، سورۂ ق مین جو مکی سورہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے اوقات خلق کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے،

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ

[illegible]

پس ان (مخالفون) کے کہنے پر (اے رسول) صبر کر، اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور اسکے ڈوبنے سے پہلے (عصر) اپنے پروردگار کی حمد و تسبیح کر، اور کچھ رات گئے پر (عشا) اسکی تسبیح کر، اور (آفتاب کے) سجدہ کرنے

صبر کی تلقین سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جب کفار قریش ہنوز آپ کی ایذا و تحقیر کے درپے تھے، اس آیت پاک مین رات کی نماز کا ابہام دور کر کے مغرب اور عشا کی تعیین کر دی گئی، ایک کی نسبت کہا گیا وَمِنَ اللَّيْلِ (کچھ رات گئے) اور دوسری کی نسبت کہا گیا وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (آفتاب کے ڈوبنے پر) اوقاتِ نماز کی تفصیل کے سلسلہ مین رات سے آغاز اس لئے کیا گیا کہ یہ نسبتہً کفار سے محفوظ رہنے کا وقت تھا، زوال کے بعد سے غروب تک کی نماز جس کو پہلے اصیل، اور پھر طَرَفَيِ النَّهَارِ (دن کے دونون کنارون مین) اور یہان "قبل غروب" کی نماز کہا گیا ہے ہنوز تفصیل طلب ہے، جس کے اندر ظہر و عصر دونون نمازین داخل ہین، چنانچہ سورۂ روم مین جو مکہ مین نازل ہوئی ہے، اس کی تفصیل کی گئی ہے، اس سورہ کے اترنے کا وقت تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ رومیون کی شکست کامل کے بعد ہے جس کا زمانہ نبوت کے پانچوین چھٹے سال سے لیکر آٹھوین نوین سال تک ہے،

(حاشیہ صفحہ ۱۲۸) [1] آفتاب کا لفظ چونکہ پہلے آچکا ہی اس لئے ادبار السجود سے ادبار سجود الشمس مراد ہی، جیسا کہ قبل الغروب سے قبل غروب الشمس مقصود ہی، آفتاب کے سجدہ کرنے سے مراد اس کا ڈوب جانا ہی جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ کی احادیث مین ہی کہ غروب کے بعد آفتاب خدا کو سجدہ کرتا ہے، چونکہ آفتاب کے ڈوبنے کے لئے غروب کا لفظ پہلے آچکا تھا، اس لئے کلام کی فصاحت کا اقتضا یہ تھا کہ اب اس کے لئے دوسرا لفظ لایا جائے، چنانچہ اس معنی کیلئے سجود کا لفظ استعارۃً لایا گیا، سجود اصل مین زمین پر پیشانی رکھنے کو کہتے ہین، اور غروب کے وقت آفتاب کی یہی حالت ہوتی ہی، اس طرز ادا سے آفتاب پرستون کی تردید مقصود ہے، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نماز کے لئے سجود شمس کا ذکر کیا، کہ جس وقت آفتاب کا سر اپنے خالق کے آگے سجدہ مین ہو، تم بھی اپنا سر اپنے خالق کے آگے جھکاؤ، تفسیرون مین حضرت علیؓ سے روایتین ہین، کہ اس سے مراد مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتین ہین،

فَسُبْحَانَ اللّٰہِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَ	اللہ کی تسبیح کرو جب شام (یارات) کرو اور
حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ۔ وَلَہُ الْحَمْدُ	جب صبح کرو، اور اُس کی حمد آسمانون او
فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا	زمین مین ہے، اور آخیر دن کو اُس کی
وَّحِیْنَ تُظْہِرُوْنَ ۔ (روم-۲)	تسبیح کرو، اور جب ظہر کرو،

اس آیت پاک مین زوال کے بعد (ظہر) اور غروب سے قبل (عصر) کی مبہم نمازون کی توضیح کی گئی ہے، ایک کو عَشِیّ (عصر) اور دوسری کو ظہر کہا گیا ہے، تمام آیتون کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر کا بالتصریح ذکر، طٰہٰ، طور، دہر، ہود، قٓ، روم اور نور مین ظہر کا بالاجمال، دہر، قٓ، طٰہٰ اور اسراء مین اور بالتصریح اسراء، اور روم مین عصر کا بقرہ، دہر، ہود، طٰہٰ، قٓ، اور روم مین مغرب کا بالاجمال ہود، طٰہٰ، اور روم مین اور بالتصریح قٓ مین، عشا کا بصورت صلاۃ اللیل، مزمل، طور اور دہر مین، اور بصورت عشار بالاجمال طٰہٰ، ہود، اور روم مین اور بالتصریح قٓ اور ہود مین ہے، تمام نمازون کا بالاجمال تذکرہ بقرہ، اسراء، اور طٰہٰ مین ہے، طور سے فجر اور عشار دو وقتون کی نماز، اسراء ہود اور طٰہٰ سے کم از کم بظاہر تین وقتون کی، روم سے چار وقتون کی (اگر مسار سے صرف مغرب مراد لین) اور طٰہٰ اور روم سے پانچ وقتون کی نماز ثابت ہے،

ایک نکتہ

جمع بین الصلوتین

اوپر کی آیتون پر غور کی نظر ڈالنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے، پہلی آیتون مین ظہر اور عصر کی نمازین مجمل ہین یعنی دونون کو ایک لفظ "قَبْلَ الْغُرُوْبِ" یا "صَلَّ

یا طرفی النہار کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے، آخری آیت میں جو سورہ روم کی ہے، ظہر و عصر کی نمازوں کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے، مگر شام کی نماز میں اجمال ہے یعنی مغرب و عشا دونوں کو حِیْنَ تُمْسُوْنَ (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کر دیا گیا ہے، اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے، کہ یہ دونوں مل کر ایک بھی ہیں اور علیحدہ بھی ہیں، اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشا کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہیں[1]، اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علیحدہ ذکر کیگئی ہے، اس لئے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں ہے، احادیث میں جمع بین الصلوٰتین کے عنوان

---

[1] موطا امام مالک مسلم ترمذی باب القصر فی الصلوٰۃ فی السفر والحضر بعض مستشرقین کو جمع بین الصلوٰتین کی حدیثیں دیکھ کر یہ شبہہ پیدا ہوا ہے، کہ زمانہ نبوی میں شاید تین وقت کی نمازیں ادا ہوتی تھیں، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں فاضل ونیسنک کو بھی یہی شبہہ ہوا ہے، (دیکھو اس کا مضمون صلوٰۃ) مگر حقیقت یہ نہیں ہے، بلکہ نمازیں ہمیشہ پانچ وقتوں کی ہوتی تھیں البتہ بضرورت ظہر و عصر کو ایک ساتھ، اور مغرب و عشا کو ایک ساتھ ملا کر پڑھ لیتے تھے، لیکن اتنی ہی رہتی تھیں صرف وقت میں کمی ہو جاتی تھی، فقہا میں باہم اس کے متعلق اختلاف ہے کہ دو دو نمازوں کو یکجا کن صورتوں میں پڑھا جا سکتا ہے احناف کے نزدیک حقیقی طور سے صرف دو موقعوں پر ہے، اور دونوں حج میں، ایک عرفات میں ۹ ذی الحجہ کو ظہر اور عصر دونوں ظہر کے وقت ادا کیجاتی ہیں، کیونکہ اس دن عصر کا وقت خاص حج کی دعاؤں کے لیے ہے، اور دوسرے اسی تاریخ کو مزدلفہ میں مغرب اور عشاء دونوں عشاء کے وقت ایک ساتھ ادا کیجاتی ہیں کیونکہ مغرب کا وقت عرفات سے مزدلفہ تک آنے میں عموماً گذر جاتا ہے بقیہ نمازوں میں حنفیہ کے نزدیک حقیقی یکجائی نہیں، بلکہ محض صورۃً دو دو نمازیں ایک ساتھ ادا کیجا سکتی ہیں، اس کی صورت یہ ہے کہ ایک نماز اخیر وقت میں اور دوسری اوّل وقت میں پڑھی جائے، حنفیہ کے علاوہ دوسرے فقہا کے نزدیک سفر میں حقیقۃً دو نمازیں یکجا ایک وقت میں پڑھی جا سکتی ہیں، اور آنحضرت صلعم نے ایسا کیا ہے شیعوں میں ظہر و عصر ایک ساتھ اور مغرب و عشاء ایک ساتھ پڑھنے کا عام رواج ہے۔

سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی مثالین اس نکتۂ قرآنی کی تشریح مین موجود ہین،

اوقاتِ پنجگانہ اور آیتِ اسراء

محدثین اور مورخین کا اتفاقِ عام ہے کہ نماز کے اوقاتِ پنجگانہ کی تعیین معراج مین ہوئی ہے، جو ہماری تحقیق کے مطابق بعثت کے بارھوین سال اور ہجرت سے ایک سال پہلے واقع ہوئی تھی، گو اوقاتِ پنجگانہ کا ذکر سورۂ ق اور روم مین موجود ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھین، لیکن اقامتِ صلوٰۃ کے امر کے ساتھ سب سے پہلے اسی سورۂ اسراء (معراج) مین نمازِ پنجگانہ کا حکم ہوتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نمازِ پنجگانہ کی تکمیل بصورتِ صلاۃ اسی معراج مین ہوئی، جس طرح وضو پر عمل گو پہلے سے تھا، مگر اس کا حکم قرآن مین مدنی سورتون کے اندر نازل ہوا ہے، سورۂ اسراء (معراج) کی وہ آیت جسمین نمازِ پنجگانہ کا ذکر ہے حسبِ ذیل ہے،

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ	آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی تاریکی
اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ	تک نماز کھڑی کر، اور فجر کی قرأت قائم کر،
اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (اسراء-۹)	بے شک فجر کی قرارت مین حضور ہوتا ہے

یہ آیتِ کریمہ اوقاتِ پنجگانہ کی تعیین اور اس کے سبب کو پوری طرح بیان کرتی ہے، اس مین سب سے اہم تشریح کے قابل لفظ "دُلُوْك" ہے، دلوک کے اصلی معنی "جھکنے" اور "مائل ہونے" کے ہین، لیکن تحقیق طلب یہ ہے کہ دُلُوْكِ الشمس، یعنی آفتاب کے جھکنے سے کیا مراد ہے؟ اور اہلِ عرب اس کو کن معنون مین بولتے ہین حقیقت یہ ہے کہ عربی مین اس لفظ کا اطلاق تین[۳] اوقات یا آفتاب کی تین حالتون پر ہوتا ہے، زوال پر[۱]، مقابل نقطۂ نگاہ سے آفتاب کے ہٹ جانے پر[۲]، اور غروب پر[۳]، اور جب آیتِ مذکورہ مین یہ کہا گیا کہ آفتاب کے دلوک (جھکاؤ) پر

نماز پڑھو تو ان تینوں دلوکات یعنی آفتاب کے تینوں جھکاؤ پر ایک ایک نماز
لازم آئی، غرض یہ ہے کہ اوجِ کمال پر پہنچنے کے بعد جب آفتاب ڈھلنا شروع ہوتا ہے تو اس کے
تین دلوک یا جھکاؤ ہوتے ہیں، ایک نقطۂ سمت الراس سے، دوسرا نقطۂ تقابل سے، اور تیسرا
دائرۂ افق سے، پہلا ظہر کا وقت ہے، دوسرا عصر کا، اور تیسرا مغرب کا، اور اس کے ہر دلوک یعنی
انحطاط پر اس کی خدائی کی نفی و تردید، اور خدائے برحق کی الوہیت کے اقرار و اعلان کے لئے
ایک ایک نماز رکھی گئی ہے، اس طرح "دلوک" کے لفظ کے اندر تین نمازوں کے وقت بتائے
گئے ہیں، چوتھی نماز کا وقت "غسق الیل" (رات کی تاریکی) ہے، یہ عشا کی نماز ہے، اور اس کو
حقیقت میں نصف شب کو ادا ہونا چاہیئے، جب آفتاب کا چہرۂ نورانی تو بر تو حجاباتِ ظلمت
میں چھپ جاتا ہے، لیکن لوگوں کی تکلیف کے خیال سے وہ سونے سے پہلے رکھی گئی، تاکہ خواب
کی غفلت کی تلافی اس سے ہو جائے، اور پانچویں نماز کا وقت "قُرآنَ الفجر" (صبح کا پڑھنا) بتایا
گیا ہے، یہ آفتاب کے طلوع سے پہلے اس لئے ادا کی جاتی ہے کہ عنقریب وہ ظاہر ہو کر اپنے پرستاروں
کو اپنی طرف متوجہ کرے گا، اس لئے ضرور ہے کہ دُنیا اس کے طلوع سے پہلے ہی خالقِ اکبر کا نام
لے، اور اس باطل پرستی سے جس میں آفتاب پرست عنقریب مبتلا ہونے والے ہیں، بیزاری ظاہر
کرے، غرض اس آیتِ پاک سے اقامتِ صلوٰۃ کے اوقاتِ پنجگانہ کا ثبوت ملتا ہے، اب
ہم کو یہ دکھانا ہے کہ کلامِ عرب میں آفتاب کے ان تینوں جھکاؤ یا میلانات پر دلوک کا اطلاق
ہوتا ہے، اگر کلامِ عرب سے یہ ثابت ہو جائے تو اس آیت سے اوقاتِ پنجگانہ کی تشریح کے
قبول کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا۔

دلوک کی تحقیق | مفسرین میں سے بعض نے "دلوک" سے زوال کا وقت، اور بعض نے غروب کا وقت مراد لیا ہے، اور اہلِ لغت نے بھی اس کے یہ دونوں معنی لکھے ہیں، اور ایک تیسرے معنی اور بھی بیان کئے ہیں یعنی مقابل نقطۂ نگاہ سے ہٹ جانا، اور اس کے ثبوت میں ایک جاہلی شاعر کا شعر بھی پیش کیا ہے، چنانچہ لسان العرب میں ہے،

ودلکت الشمس تدلک دلوکاً غربت	آفتاب کا دلوک ہوا یعنی وہ غروب ہوا، اور
وقیل اصفرّت ومالت للغروب	کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آفتاب زرد ہو گیا
وفی التنزیل العزیز اقم الصلوٰۃ	اور غروب کے لئے جھک گیا، اور قرآن میں ہے کہ
لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ"	"دلوکِ شمس کے وقت رات کی تاریکی تک نماز
وقد دلکت زالت عن کبد	کھڑی کرو" اور آفتاب کو دلوک ہوا یعنی وہ
السّماء ۔۔۔۔۔۔۔۔	آسمان کے بیچ سے ہٹ گیا ۔۔۔۔
وقال الفرّاء عن ابن عباس فی	اور فرّاء نے کہا کہ ابن عباسؓ سے روایت ہے
دلوك الشمس انه زوالها الظهر	کہ دلوکِ شمس کے معنی ظہر کے وقت آفتاب
قال ورأيتُ العرب يذهبون	کے زوال کے ہیں اور اس نے بیان کیا کہ میں نے
بالدلوك الى غياب الشمس، قال	اہلِ عرب کو دلوک سے آفتاب کا غروب
الشاعر،	مراد لیتے دیکھا ہے، شاعر کہتا ہے،
٭ هذا مقام قدمَي رباحِ ٭	"یہ وہ جگہ ہے جہاں لڑائی میں رباح کے دونوں
٭ ذبّبَ حتّی دلکت براحِ ٭	قدم جمے تھے، اس نے دشمنوں سے اپنی عزت کی

يعني الشمس، قال ابو منصور وقد
روينا عن ابن مسعود انه قال
دلوك الشمس غروبها وروى
ابن هانئ عن الاخفش انه
قال، دلوك الشمس من زوالها
الى غروبها، وقال الزجاج
دلوك الشمس زوالها في
وقت الظهر، وذالك ميلها
للغروب وهو دلوكها ايضًا
يقال دلكت براح وبراح اي
قد مالت للزوال حتى كاد
الناظر يحتاج اذا تبصرها
ان يكسر الشعاع عن بصره
براحته .. ..
.. .. فان قيل
ما معنى الدلوك في كلام
العرب قيل الدلوك الزوال

ابو منصور نے کہا کہ ہم نے ابن مسعودؓ سے روایت
کی ہے، کہ "دلوکِ شمس آفتاب کا غروب ہے"
اور ابن ہانی نے اخفش سے نقل کیا کہ
"دلوکِ شمس زوال سے غروب تک ہے"
اور زجاج نے کہا کہ "دلوکِ شمس ظہر کے
وقت آفتاب کا زوال ہے، اور اس کے
معنی غروب کے لئے جھکنا بھی ہیں اور
یہ بھی اس کا دلوک ہے" محاورہ میں
کہا جاتا ہے کہ دلکت براح وبراح
یعنی آفتاب زوال کے لئے جھک
گیا، یہاں تک کہ دیکھنے والا جب
اس کو دیکھنا چاہے تو اس کی کرن کی
شدت کو توڑنے کے لئے اس کو آنکھ پر
ہتھیلی رکھنے کی ضرورت ہو۔ .. ..
.. .. تو اگر کہا جائے کہ عرب
کے محاورہ میں دلوک کے کیا معنی ہیں؟ تو
جواب دیا جائیگا کہ دلوک کے معنی زوال کے ہیں

ولذالك قيل للشمس اذا	اور اسی لئے آفتاب کو "دالکہ" کہتے ہین،
زالت نصف النهار دالكة	جب وہ دوپہر کو جھک جائے، اور
وقيل لها اذا افلت دالكة	جب آفتاب ڈوب جاتا ہے تب بھی
لانها في الحالتين زائلة	اس کو "دالکہ" کہتے ہین، کیونکہ ان دونون
.. ..	حالتون مین وہ جھک جاتا ہے .. ..
.. .. قال الفراء في	فرّاء نے کہا کہ اس قول (شعر یا محاورہ) مین
قوله براح جمع راحة وهي	جو براح کا لفظ ہے، یہ راحہ کی جمع ہے جسکے
الكف يقول يضع كفه على	معنی ہتھیلی کے ہین، کہنے والے کا مطلب یہ ہے کہ
عينيه ينظر هل غربت الشمس	وہ دونون آنکھون پر ہتھیلی رکھکر دیکھتا ہے کہ
بعد لا،	آفتاب ابھی غروب ہوا یا نہین،

شعرائے عرب نے آفتاب کے ڈھل کر آنکھون کے سامنے آجانے کے وقت آنکھون پر ہتھیلی رکھنے کا اکثر ذکر کیا ہے، عجاج[1] کہتا ہے،

والشمس قد كادت تكون دنفا　　　ادفعها بالراح كي تزحلفا

اور آفتاب قریب تھا کہ بیمار ہو کر دُبلا ہو جائے، مین اسکو ہتھیلی سے ہٹاتا تھا کہ وہ ہٹ جائے

اس دوسرے شعر سے، پہلے شعر کے معنی کھل جاتے ہین، کہ اس مین دلوک سے زوال اور غروب کے بجائے وہ وقت مراد ہے، جب آفتاب ڈھل کر آنکھون کے سامنے آجاتا ہے

[1] یہ شعر تفسیر طبری مین آیت مذکورہ کے تحت مین، اور لسان العرب مین دنف اور زحلف کے تحت مین مذکور ہے،

اور یہ عصر کا وقت ہوتا ہے، الغرض دُلوک کا لفظ آفتاب کے ہر جھکاؤ پر برابر بولا جاتا ہے، اس کا پہلا جھکاؤ زوال کے وقت ہوتا ہے جب وہ سمت الرّاس سے ہٹتا ہے، دوسرا جھکاؤ عصر کے وقت ہوتا ہے جب وہ مقابل کی سمت نظر سے ہٹتا ہے، اور مغرب کی طرف چلنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پڑتا ہے، اس وقت شعاعوں کی تیزی سے بچنے کے لئے آدمی کو آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھنے یا کسی اور چیز سے آڑ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، اور اس کا تیسرا جھکاؤ غروب کے وقت ہوتا ہے جب وہ سمتِ افق سے نیچے ہو کر ڈوب جاتا ہے، ان ہی تین مسلسل اوقات کی وجہ سے جو زوال سے لے کر غروب تک کے زمانہ پر مشتمل ہیں بعض اہل لغت نے جیسا کہ اوپر گذرا تسامحاً یہ کہدیا ہے کہ دلوک زوال سے غروب تک کے وقت کو کہتے ہیں، حالانکہ اس کا اطلاق تحقیقی طور سے آفتاب کے تین میلانات پر کیا جاتا ہے، اوّل اس میلان پر جو سمت الراس سے ہوتا ہے، پھر اس میلان پر جو سمتِ نظر سے ہوتا ہے، اور بالآخر اس کامل میلان پر جو سمتِ افق سے ہوتا ہے اور یہ اوقات زوال سے غروب تک مسلسل یکے بعد دیگرے چند چند گھنٹوں کے بعد آتے ہیں اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے، کہ

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ — آفتاب کے دلوک کے وقت نماز کھڑی کر،

سے مراد تین نمازیں ہیں، کیونکہ تین دلوک ہوتے ہیں، ظہر جب آفتاب کا دلوک (جھکاؤ) سمت الراس سے ہوتا ہے، عصر جب اس کا دلوک سمتِ نظر سے ہوتا ہے، اور مغرب جب اس کا کامل دلوک سمتِ افق سے ہوتا ہے[1] اس کے بعد غَسَقِ الَّیۡلِ (رات کی تاریکی) اور قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ (فجر کی

[1] تفسیروں میں بھی صحابہ کی روایتوں سے ان ہی نمازوں کا باختلاف روایت مراد ہونا مذکور ہے، حضرت ابن مسعودؓ

قرأت) سے ظاہر ہے کہ عشا اور فجر کی نمازین مراد ہین، اس طرح اس آیت پاک سے جو سورۂ اسرار مین واقع ہے، اوقات پنجگانہ مین اقامت صلوٰۃ کے اوقات کی تشریح ہو جاتی ہے،

اوقات نماز کا ایک راز | اس آیت کریمہ کو ایک دفعہ اور پڑھو تو معلوم ہوگا کہ نماز کے اوقات کا آغاز ظہر (میلان اول آفتاب) سے ہوتا ہے، اور یہی اُس حدیث سے بھی ثابت ہے جس مین بذریعۂ جبریل نماز کے اوقات پنجگانہ کی تعلیم کا ذکر ہے[1]، اس مین پہلے ظہر کا نام آتا ہے، پھر بہ ترتیب اور چارون نمازون کا، ظہر کے بعد عصر، پھر مغرب، پھر سونے سے پہلے عشا، یہ چار نمازین تقریباً دو تین گھنٹون کے فاصلہ سے ہین، اس کے بعد صبح کی نماز ہے، جو عشا سے تقریباً سات آٹھ گھنٹون کا فصل رکھتی ہے، اور پھر صبح سے ظہر تک تقریباً اسی قدر فصل ہے، چنانچہ اس آیت مین ظہر سے عشا تک ایک ساتھ نماز کا مسلسل حکم ہے، چند گھنٹے ٹھہر کر صبح کا حکم ہوتا ہے پھر خاموشی ہو جاتی ہے، یہانتک کہ آفتاب طلوع ہو کر ایک لمبے وقفے کے بعد پھر ظہر کا وقت آتا ہے، اور اُسی طرح دور قائم ہو جاتا ہے، غرض ظہر سے عصر، عصر سے مغرب، اور مغرب سے عشا تک مسلسل نمازین ہین، پھر صبح تک استراحت کا طویل وقفہ ہے، صبح اُٹھ کر خدا کی یاد ہوتی ہے، اور پھر انسانی کاروبار کے لئے ایک طویل وقفہ رکھا گیا ہے، جو صبح سے ظہر تک ہے، اور اس مین کوئی فرض نماز نہین رکھی گئی ہے،

اوقات پنجگانہ کی ایک دوسری آیت | سورۂ اسرار کی آیت کی طرح سورۂ طٰہٰ مین بھی ایک آیت ہے جس مین اوقات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۷) دلوک سے غروب آفتاب اور حضرت ابن عباسؓ زوال آفتاب مراد لیتے ہین، اسی طرح غسق اللیل کو بعض لوگ مغرب اور بعض عشا سمجھتے ہین، اور فیصلہ یہ کرتے ہین کہ دلوک شمس سے ظہر اور عصر اور غسق اللیل سے مغرب اور عشا اور قرآن الفجر سے نماز صبح مراد ہے، اور اس طرح اُن کے نزدیک بھی یہ آیت اوقات پنجگانہ کو بتاتی ہے،

[1] سیرت ابن ہشام باب ابتداء فرضیت صلوٰۃ،

پنجگانہ کی تفصیل ہی، وہ یہ ہی،

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ	اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب
الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا ج وَمِنْ	نکلنے سے پہلے، اور اس (آفتاب کے) ڈوبنے
آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ	سے پہلے اور رات کے کچھ وقت مین
النَّهَارِ (طٰہٰ - ۸)	تسبیح پڑھ، اور دن کے کنارون مین

آفتاب نکلنے سے پہلے فجر ہے، ڈوبنے سے پہلے عصر ہے، رات کے کچھ وقت سے عشا مراد ہی، اور دن کے کنارون مین ظہر اور مغرب ہے،

اطراف النہار کی تحقیق | یہ شبہہ کیا جا سکتا ہے کہ "اطراف" کا لفظ جمع ہی، جو کم سے کم تین پر بولا جاتا ہی، اس بنا پر دن کے تین طرف (کنارے) ہونے چاہئین، دن کے کنارے یا تو دو ہی ہین صبح اور شام، یا تین ہین، اگر وسط کا بھی اعتبار کیا جائے یعنی صبح، دوپہر اور شام پہلی شق لیجائے تو صبح کا ذکر مکرر ہو جاتا ہے، اور ظہر غائب ہو جاتی ہے، دوسری شق اختیار کیجائے تو گو ظہر آجاتی ہے مگر پھر بھی صبح مکرر ہی رہتی ہی،

اس لفظی اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اطراف گو جمع ہی مگر کلام عرب مین تثنیہ یعنی دو پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے، اور خود قرآن مجید مین اس کے استعمالات موجود ہین، مثلاً ایک جگہ مشرقین اور مغربین "دو مشرق" اور "دو مغرب" ہی، دوسری جگہ ان ہی کو مشارق اور مغارب کہا گیا ہے، سورۂ تحریم مین ہے فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا (تم دونون کے قلوب) ظاہر ہے کہ دو آدمیون کے دو قلب ہونگے، قلوب (بصیغۂ جمع) نہین ہو سکتا، مگر یہ زبان کا محاورہ اور بول چال ہے

اس مین قیاس اور عقلیت کو دخل نہین اس بنا پر اطراف سے مراد صرف دو طرف ہین، یہ سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ دن کے دو ہی ممتاز حصّے ہین، ایک صبح سے دوپہر تک، اور دوسرا دوپہر سے شام تک اطراف سے ان ہی دونون حصّون کے آخری کنارے یہان مراد ہین، صبح سے دوپہر تک کے حصّہ کا آخری کنارہ ظہر ہے، اور دوپہر سے غروب تک کے حصّہ کا آخری کنارہ عصر یا مغرب ہے لیکن چونکہ عصر کا ذکر قَبْلَ غُرُوْبِهَا کے اندر مستقل موجود ہے، اس لئے متعین ہو گیا کہ یہان اس سے مراد مغرب ہے[1]

ایک اور طریقۂ ثبوت | اگر ہم قرآن پاک کی علیحدہ علیحدہ آیتون سے اوقاتِ پنجگانہ پر استدلال کرنا چاہین تو کر سکتے ہین، مثلاً

۱- اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (اسراء) — زوالِ آفتاب کے وقت نماز کھڑی کر،

یہ ظہر کی نماز ہے،

۲- وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ، (ق-۳) — اور غروبِ آفتاب سے پہلے خدا کی تسبیح کر،

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (دھر-۲) — اور اپنے پروردگار کا نام لو صبح کو اور عصر کو[1]

یہ عصر کی نماز ہوئی، اور اسی کو وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى (بقرہ-۳۱) (بیچ کی نماز) سورۂ بقرہ مین اس لئے کہا گیا ہے، کہ یہ دن کی نمازون مین ظہر اور مغرب کے بیچ مین واقع ہے،

۳- وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ (ھود-۱۰) — اور دن کے دونون (ابتدائی اور انتہائی) کنارون مین نماز کھڑی کر،

دن کا ابتدائی کنارہ صبح اور انتہائی کنارہ مغرب ہے،

---

[1] الاصیل الوقت بعد العصر الی المغرب (صحاح جوہری و لسان العرب)

۴۔ سورۂ نور مین ہے، کہ صبح کی نماز سے پہلے بے پکارے زنانہ کمرہ یا مکان مین نہ جایا کرو،

مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ (نور ۸) صبح کی نماز سے پہلے،

اس سے نمازِ صبح کا عملی ثبوت بھی ملا، پھر اسی مین اسی موقع پر ہے،

۵۔ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ، اور عشا کی نماز کے بعد،

اس کے روسے مسلمانون کو عشا، کی نماز کے بعد جو سونے اور کپڑے اتار دینے کا وقت ہے کسی کے مکان مین بلا اجازت اندر جانے کا حکم نہین، یہ بھی نمازِ عشا کا عملی ثبوت ہے، اور یہی پانچون اوقاتِ نماز ہین،

نماز پنجگانہ احادیث وسنت مین

تمام انبیا، علیہم السلام مین آنحضرت صلعم کو جو خاص تفوق و امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ آپ جو شریعت لیکر آئے اس کی صورت صرف نظری اور خیالی نہ تھی، اور نہ وہ کسی حیثیت سے مبہم اور مجمل رہی، بلکہ آپ نے اپنے عمل اور طریق سے اس کی پوری تشریح فرما دی اور خود عمل فرما کر، اور اپنے تمام پیرو ون سے اس کی تعمیل کروا کر اس کے متعلق ہر قسم کے پیدا ہونے والے شک و شبہہ کی جڑ کاٹ دی، اسلام نے جب روزانہ طریقِ عبادت کو پیش کیا، آنحضرت صلعم نے اپنے عمل سے اس کے تمام ارکان و آداب و شرائط و اوقات و تعداد کی پوری تشریح فرما دی، اور ان مین سے ہر چیز ناقابلِ شک قولی و عملی تواتر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی، نماز کس طرح پڑھنی چاہیئے، اس مین کیا کیا پڑھنا چاہیئے، کن کن وقتون مین پڑھنی چاہیئے، کس وقت کی نماز کی کے رکعتین ہین، ان مین سے ہر چیز کی آپ نے زبانی تشریح فرمائی، صحابہؓ کو تلقین کی، اور عملاً نبوت کی پوری زندگی مین جو حکمِ نماز کے بعد گذری، ایک دن دو دن نہین کم از کم مدینہ مین

متصل دس برس تک ہر روز پانچ دفعہ تمام جماعت مسلمین کے سامنے پورے اعلان کے ساتھ ادا فرماتے رہے، یہانتک کہ مرض الموت مین بھی اس مین تخلّف نہ ہوا اور آخری سانس تک اسی طرح بدستور اس پر عمل ہوتا رہا، مدینہ کی مسجد نبوی اور تمام اسلامی مسجدون مین پنجوقتہ اعلانِ نماز کی آوازین بلند ہوئین، اور ہر روز پانچ دفعہ ہر جگہ جہان اسلام کا کلمہ پڑھا جاتا تھا، یہ فرض ادا ہوتا تھا، آپ کے بعد تمام خلفاے راشدین اور تمام پیروانِ محمدی جہان بھی رہے، اور جہان بھی پہنچے، اسی طرح دن مین پانچ بار علی الانتہا د سفر و حضر مین تمام عمر ادا کرتے رہے، کیا ایسی مستمر علی الاعلان، متواتر اور دائمی چیز مین کسی کو شک واقع ہو سکتا ہے، یہ اہتمام، یہ علانیہ استمرار، اور یہ تاکید بلیغ، اس لئے فرمائی تاکہ جس طرح دوسرے پیغمبرون کا طریق عبادت بعد کے پیروون کے ترکِ عمل سے مشتبہ اور عدم صحتِ نقل سے مشکوک ہوگیا، خاتم الانبیاء کی شریعتِ آخرین کا طریق عبادت اس سے محفوظ رہے، کیونکہ اگر اب اس شریعت مین شک پڑجاتا تو پھر کوئی دوسری نبوت آکر اس کی تجدید و اصلاح کرنے والی نہ تھی، چنانچہ اسی بنا پر آج تک تمام پیروانِ محمدی مین آپکی یہ نماز اور اس کے ضروری اور اہم متعلقہ ارکان و شرائط و احکام روایتہً متواتر اور عملاً محفوظ و قائم ہین، نماز وہ فریضۂ الٰہی ہے جس کی فرضیّتِ خمسہ کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس ساعتِ سعید مین دیا، جب آنحضرت صلعم معراج کے تقرب خاص سے ممتاز ہوئے، حکم ہوا کہ شب و روز مین پانچ نمازین تم پر اور تمہاری امّت پر لکھی گئین، جو پچاس[1] نمازون کے حکم مین ہین، قرآن پاک سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، ارشاد ہے کہ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا، (انعام-۲۰) یعنی جو ایک نیکی کریگا، اس کو دس گونہ

---

[1] بخاری و مسلم و ابوداؤد وغیرہ، کتاب الصلوٰۃ و کتاب الاسراء،

ثواب ملیگا، اس لیے پانچ نمازین یقیناً پچاس[۵] کے حکم مین ہین،

نماز کی فرضیت کے بعد فرشتۂ الٰہی نے اتر کر خود نماز کے طریق ادا اور اس کے اوقاتِ خمسہ[۵] کی تعلیم کی، اور ہر وقت کی ابتدا، اور انتہا پر ایک ایک نماز پڑھا کر عملاً ہر چیز کی تلقین کی[۱]، اور وہی آپنے اپنے پیروون کو بتایا، اور اس پر اُن سے عمل کرایا،

چنانچہ آپنے شیوعِ اسلام کے بعد ہر جگہ احکامِ شریعت کی تبلیغ و اعلان کے مبلغ جب متعین فرمائے تو ایک بدوی نے جو نجد کے دور دراز راستہ سے سفر کرکے آیا تھا، خدمتِ اقدس مین آکر عرض کی یا رسول اللہ! آپکے قاصد نے بتایا ہے کہ دن رات مین پانچ نمازین فرض ہین کیا یہ سچ ہے، فرمایا ہان سچ ہے، عرض کی کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بناکر بھیجا کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا ہان[۲]!

خود آنحضرت صلعم نے صحابہ سے فرمایا کہ جبریل اترے اور انھون نے میری امامت کی، تو مین نے اُن کے ساتھ نماز پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، یہ فقرے منہ سے کہتے جاتے تھے اور انگلی سے ایک، دو، تین، چار، پانچ گنتے جاتے تھے[۳]، ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کرکے فرمایا کہ اگر کسی کے گھر کے سامنے کوئی صاف شفاف نہر جاری ہو، اور وہ اس مین دن مین پانچ دفعہ نہاتا ہو، تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے؟ سب نے عرض کی نہین نہین رہیگا، فرمایا تو یہی مثال پانچون وقت کی نمازون کی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ گناہون کو دھو دیتا ہے[۴]، اوقات کی

---

[۱] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب اوقات الصلوات الخمس، [۲] صحیح بخاری کتاب الایمان باب الزکوٰۃ من الاسلام ص۱۱ و صحیح مسلم کتاب الایمان فی شرائع الدین ص۲۴ و ۲۵ مصر، [۳] صحیح بخاری و صحیح مسلم و موطا باب اوقات الصلوٰۃ الخمس، [۴] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ الخمس کفارۃ،

تعیین ہین فرمایا، کہ جب صبح کی نماز پڑھو تو اس کا وقت اس وقت تک ہے جب تک سورج کی پہلی کرن نہ نکل آئے، پھر جب ظہر پڑھو تو اُس وقت تک اُسکا وقت ہے جب تک عصر کا وقت نہ آجائے، پھر جب عصر کی نماز پڑھو تو اس کا موقع اُس وقت تک ہے کہ آفتاب زرد پڑ جائے، پھر جب مغرب پڑھو، تو شفق ڈوب جانے تک اس کا وقت ہے، پھر جب عشا پڑھو تو آدھی رات تک اس کا وقت ہے[1]۔

ابو برزہؓ ایک صحابی کہتے ہین کہ حضور صبح[2] کی نماز مین ساٹھ سے سو آیتین تک قرأت کرتے تھے، اور ظہر[3] زوال کے بعد ادا کرتے تھے، اور عصر[4] اس وقت پڑھتے تھے کہ ایک آدمی مدینہ کے آخری کنارہ تک جا کر لوٹ آتا تھا، پھر بھی آفتاب مین جان رہتی تھی، مغرب[1] کی بابت راوی کو سنا ہوا بیان یاد نہین رہا، اور عشا[5] کو تہائی رات تک ادا کرنے مین آپ تامل نہین فرماتے تھے[6]، حضرت جابرؓ دوسرے صحابی نقل کرتے ہین کہ آنحضرت صلعم ظہر[1] کی نماز دوپہر مین پڑھا کرتے تھے، اور عصر اس وقت جب سورج باقی رہتا تھا، اور مغرب[3] جب سورج ڈوب جاتا تھا، اور عشا[4] مین کبھی دیر کرتے اور کبھی عجلت، اور صبح[5] اندھیرے مین پڑھتے تھے[6]، صحابہ کہتے ہین کہ حضور ظہر اور عصر کی نمازون کی پہلی دو رکعتون مین آہستہ آہستہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورہ پڑھتے تھے، کبھی کبھی کوئی آیت سنا بھی دیتے تھے، مغرب مین سورۂ المرسلت پڑھی اور کبھی سورۂ طور پڑھی، عشا مین اذا السماء انشقت اور والتین والزیتون قرأت کی ہے، اور صبح مین سورۂ طور پڑھی ہو[7]،

[1] صحیح مسلم باب اوقات الصلوٰۃ الخمس [2] صحیح بخاری باب وقت الظہر عند الزوال [3] صحیح بخاری باب وقت العشاء اذا اجتمع الناس او تاخروا، [4] ایضاً باب القرأۃ فی الظہر والعصر والمغرب والعشاء والفجر بروایات متعددہ،

اس قسم کی اور بیسیون روایتین ہین، اور ان روایتون پر کیا موقوف ہے، اس وقت سے آج تک تمام امتیانِ محمد رسول اللہ صلعم کا عملی تواتر دوست و دشمن سب کے نزدیک ناقابلِ تردید حجت ہے،[1]

تہجد اب نفل ہوگئی لیکن کیون؟

نمازِ پنجگانہ کی تکمیل کے بعد صلوٰۃ اللیل (تہجد کی نماز) جو پہلے فرض تھی، عام امت کے لئے نفل ہوگئی، چنانچہ پوری آیت یہ ہے،

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى	نماز کو آفتاب کے جھکاؤ کے بعد کھڑی کر
غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۖ إِنَّ	(ظہر، عصر، مغرب) رات کی تاریکی تک
قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا، وَمِنَ	اور صبح کی قرأت قائم کر، بیشک صبح
اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً	کی قرأت مین حضور ہوتا ہے، اور رات
لَّكَ ۖ عَسٰى أَنْ يَّبْعَثَكَ	کے حصہ مین تو اٹھکر (اوقاتِ مقررہ سے)
رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا،	زیادہ نماز پڑھ شاید کہ تجھکو تیرا رب قابلِ
(اسراء - ۹)	تعریف مقام مین اٹھا لے،

غور کرو کہ جب تک اوقات مقرر نہ ہوئے تھے، رات کو دیر تک نماز اور نماز مین جتنا زیادہ قرآن پڑھا جاسکے پڑھنے کا حکم تھا، گویا یہ پانچون وقت کی ایک ہی وقت مین نماز تھی، یعنی نماز کی پانچ پتیون والا پھول ابھی تک غنچہ کی طرح ورق بر ورق تھا، جب دو اور تین وقتون کی نمازین الگ الگ ہوئین تو اُن کے بقدر رات کی طویل نمازین تخفیف ہوگئی، اور حکم آیا کہ

[1] چونکہ بعض مستشرقین نے (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ صلوٰۃ) دانستہ یا نادانستہ طور پر اوقاتِ نماز مین غلط فہمی پھیلانی چاہی ہے، اس لئے اتنی تفصیل کی ضرورت پڑی، تاکہ اُن کی غلط فہمی دور ہوجائے،

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ، یعنی قرآن سے اس قدر حصہ پڑھو جتنا آسانی سے پڑھ سکو،[1] اس کے بعد اس آیتِ پاک میں جب اقامتِ صلوٰۃ کے اوقاتِ پنجگانہ کا ذکر آیا تو رات کی نماز کی تہجد کی فرضیت ساقط ہو گئی، یہاں ایک قابلِ ذکر بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ شاید یہ آیتِ پاک اوقاتِ نماز کی تکمیل کی آخری اطلاع ہے، کیونکہ اس کے نازل ہونے سے پیشتر قدیم فرض نمازِ تہجد نفل نہ تھی اور اب نفل ہو گئی،

قبلہ | انسان کا کوئی کام جس طرح زمانہ سے خالی نہیں ہو سکتا جس کی بنا پر اوقاتِ نماز کی تعیین کی گئی ہے، اسی طرح مکان سے بھی خالی نہیں ہو سکتا، جب انسان کوئی کام کریگا تو ظاہر ہے کہ اس کا منہ کسی نہ کسی سمت ہوگا، اگر نماز میں کسی خاص سمت کا تعین نہ ہوتا، اور یہ عام اجازت دی جاتی کہ جس کا جدھر جی چاہے منہ کرکے نماز ادا کرے، تو جماعت کی یکسانی کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا اور نمازیوں کی وحدتِ صوری قائم نہ رہتی، بلکہ اگر ایک ہی مسجد میں ایک ہی وقت میں کوئی پورب کوئی پچھم، کوئی اُتر اور کوئی دکھن رخ کرکے کھڑا ہوتا تو یہ وحدتِ نظام کے خلاف ہونے کے علاوہ اچھا خاصہ مضحکہ انگیز تماشا بنجاتا، اس لئے ہر مذہب میں عبادت کے لئے کوئی نہ کوئی سمت خاص کر لی گئی ہے، صابی (ستارہ پرست) قطبِ شمالی کی طرف منہ کرتے تھے، کہ ستاروں میں وہی ہے جو نظر آنے کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا بلکہ برقرار رہتا ہے،[2] آفتاب پرست سورج کی طرف منہ کرتے ہیں، آتش پرست آگ کو سامنے رکھتے ہیں، اور بُت پرست کوئی

---

[1] صحیح مسلم جلد اوّل باب وجوب قرأۃ الفاتحہ حدیث ارجع فصلّ فانک لم تصلّ، نیز دیکھو فتح الباری جلد اوّل صفحہ ۳۹۳،
[2] الرد علی المنطقیین لابن تیمیہ،

نہ کوئی بُت آگے رکھ لیتے ہیں، اکثر شامی قومیں مشرق کی طرف رخ کرتی تھیں، یہانتک کہ یہودیوں کے ایک فرقہ اسینی نے آفتاب کے مطلع کو قبلہ بنالیا تھا، شامی عیسائی بھی اسی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے تھے[1] بنی اسرائیل میں بھی قبلہ ضروری تھا، توراۃ سے حضرت ابراہیمؑ حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا یہ دستور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں عبادت کرنا چاہتے تھے اس کو چند پتھروں سے گھیر کر خدا کا گھر بیت ایل بنا[2] لیتے تھے، قرآن مجید میں ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں تھے، تو حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے ان کو حکم ہوا تھا کہ اپنے گھروں کو قبلہ رخ بنائیں اور نماز ادا کریں؛

وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، (یونس-۹) — اور اپنے گھروں کو قبلہ رخ کرلو، اور نماز کھڑی کرو،

بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا ذکر عہد قدیم کے مجموعہ صحف میں متعدد موقعوں پر آیا ہے؛ حضرت داؤدؑ کے زبور میں ہے؛

"لیکن میں جو ہوں سو تیری رحمت کی کثرت سے تیرے گھر میں آؤنگا، اور تجھ سے ڈرکر تیری مقدس ہیکل کیطرف تجھے سجدہ کرونگا" (۵-۷)

سلاطین اوّل میں ہے،

"جب تیرا گروہ لڑائی کے لئے اپنے دشمن کے برخلاف نکلے، جہاں کہیں تو انہیں بھیجے اور خداوند کے آگے دعا مانگے، اس شہر کی طرف جس کو تو نے پسند کیا، اور اس گھر کی طرف

---

[1] یہ تفصیلات انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لفظ "قبلہ" میں ہیں، [2] سفر تکوین باب ۱۲-۸ و ۱۳-۴ و ۲۸-۱۷-۱۸-۱۹ و ۳۱-۱۳)

جسے مین نے تیرے نام کے لئے بنایا۔" (۷-۴۴)

اسی صحیفہ مین آگے چل کر ہے:-

"اور اس زمین کی طرف جو تو نے ان کے باپ دادون کو دی، اور اس شہر کی طرف جسے تو نے چن لیا اور اس گھر کی طرف جو مین نے تیرے نام کے لئے بنایا تجھ سے دعا مانگین" (۴۸)

اہل عرب مین کعبہ کو وہی حیثیت حاصل تھی جو بنی اسرائیل مین بیت المقدس کو تھی، اس لئے اہل عرب کا قبلہ کعبہ تھا، اس تمام تفصیل سے قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح ہوتی ہے،

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا	اور ہر ایک امت کا ایک قبلہ ہے، جدھر وہ
فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ	منہ پھیرتی ہے، تو اے مسلمانو نیکیون
(بقرہ -۱۸)	کی طرف دوڑو،

اوپر کے بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ دنیا کے تین مذاہب مین تین قسم کے قبلے تھے، ستارہ پرست یا ستارہ پرستی سے متاثر، پرستش کے لئے کسی وقت کسی ستارہ کو قبلہ بناتے تھے، مثلاً آفتاب پرست آفتاب کے طلوع کے رخ یعنی مشرق کو، اور صابی (ستارہ پرست) قطب شمالی کو، عناصر پرست یا بت پرست اپنی پرستش کے عنصر یعنی آگ یا کسی دریا یا کسی بت کو قبلہ قرار دیتے تھے، موحدین اپنی مرکزی مسجد کو قبلہ سمجھتے تھے،

ابراہیمی قومون مین اس قسم کی مرکزی مسجدین دو تھین، مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور مسجد حرام (خانۂ کعبہ) پہلی مسجد کی تولیت حضرت اسحٰقؑ اور ان کی اولاد کے سپرد ہوئی تھی، اس لئے وہ ان کا قبلہ تھی، دوسری مسجد کے متولی حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کے بیٹے تھے، جنھون نے اس کو قبلہ بنایا تھا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظمہ میں رہے، خانہ کعبہ کی طرف اس طرح منہ کرکے کھڑے ہوتے تھے، کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے پڑجاتے تھے، لیکن جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ صورت ممکن نہ تھی، کیونکہ بیت المقدس مدینہ سے شمال اور خانہ کعبہ جنوب کی طرف واقع تھا، تاہم چونکہ کعبہ کے قبلہ ہونے کی اب تک اجازت نازل نہیں ہوئی تھی، آپ بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے، کہ وہی انبیاے بنی اسرائیل کا قبلہ گاہ تھا، لیکن آپ کی طبعی خواہش یہ تھی کہ اس تازہ ملت ابراہیمی کے لئے وہی ابراہیمی مسجد (خانۂ کعبہ) قبلہ قرار پائے جس کی تولیت اس کے بانی (حضرت ابراہیمؑ) کی طرف سے بنی اسمٰعیل کے سپرد ہوئی تھی، چنانچہ سورۂ بقرہ کے وسط میں اس کے متعلق احکام نازل ہوئے جن میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا کہ خدا کو کسی خاص جہت اور سمت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ وہ بے سمت ہے، اور سب سمتیں اسی کی ہیں،

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا	اور خدا ہی کے لئے ہے پورب اور پچھم، تو
تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ	جدھر رخ کرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے،
وَاسِعٌ عَلِيمٌ	بیشک اللہ بڑی گنجایش اور وسعت
(بقرہ-۱۴)	والا، اور بڑے علم والا ہے،

اس کی گنجایش اور وسعت میں ہر سمت داخل ہے، اور ہر جہت کی اس کو خبر ہے، یہ آیت کریمہ قبلہ کے تعین کی ایسی تشریح کو جس سے شرک کا شائبہ پیدا ہو سکے قطعاً غلط قرار دیتی ہے، دوسری آیت میں بھی یہی مضمون ادا ہوا ہے،

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ	بے وقوف لوگ کہیں گے کہ ان (مسلمانوں)

مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا	کو اُن کے اس قبلہ سے کس نے ہٹا دیا،
عَلَیْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ	جس پر وہ تھے، کہدے کہ پورب اور پچھم
الْمَغْرِبُ ؕ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ	دونون خدا کے ہین، وہ جس کو چاہتا ہے
اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ، (بقرہ-۱۷)	سیدھا راستہ دکھاتا ہے،

یہود جن کو سب سے زیادہ یہ اعتراض تھا، کہ مشرقی مسجد یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر مغربی مسجد یعنی خانۂ کعبہ کو کیون قبلہ قرار دیا گیا، ان کو خطاب کرکے فرمایا،

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ	نیکی یہی نہین کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ	کی طرف پھیرو، البتہ نیکی یہ ہے کہ خدا،
الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ	قیامت، فرشتون، کتاب اور پیغمبرون
وَالْمَلٰٓىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ	پر ایمان لائے اور اپنی دولت کو اسکی
وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی	محبت کے باوجود (یا خدا کی محبت پر)
الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنَ	رشتہ دارون، یتیمون، غریبون، مسافرون،
وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآىِٕلِیْنَ	سائلون اور غلامون کو (آزاد کرانے مین)
وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ	دے، اور نماز پڑھے، اور زکوٰۃ دے اور
وَاٰتَی الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ	(نیکی یہ ہے) جو اپنے وعدہ کو پورا کرتے
اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ	ہین اور سختی اور تکلیف اور جنگ مین صبر
فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ	کرتے ہین، یہی وہ ہین جو سچے ہوئے

النَّاسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (بقرہ-۲۲) اور یہی پرہیزگار ہین،

اس تصریح سے یہ اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام مین قبلہ کی کیا حیثیت ہے، قبلہ یعنی وہ سمت یا جگہ جس کا رُخ کیا جائے فی نفسہ عبادت کے لئے کوئی ضروری چیز نہ تھی لیکن چونکہ نمازون مین اُمت کے نظام وحدت کو قائم رکھنے کے لئے کسی ایک رخ کی تخصیص کی حاجت تھی اس لئے ۲ھ مین خانہ کعبہ کے قبلہ بنانے کا حکم ہوا،

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ	پس تو اپنا منھ مسجدِ حرام (خانہ کعبہ) کی
الْحَرَامِ ط وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ	طرف پھیر، اور تم لوگ جہان بھی ہو اسی
فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (بقرہ-۱۷)	کی طرف اپنے منھ پھیرو،

اسلام نے قبلہ کے لئے کسی خاص سمت کا نہین، بلکہ ایک مرکزی مسجد کا انتخاب کیا جس کے چارون طرف چارون سمتون سے نماز پڑھی جا سکے، اس طرح مشرق، مغرب، جنوب، شمال سب بیک وقت مسلمانانِ عالم کا قبلہ ہین، جس سے ایک لطیف رمز یہ نکلتا ہے کہ مسلمانون کے خدا کی طرح ان کا قبلہ بھی بے جہت ہے، اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سمت کے تعیّن سے اس سمت کی مرکزی چیز (مثلاً آفتاب یا قطبِ شمالی وغیرہ) کی مسجودیت اور معبودیت کا جو تخیل پیدا ہوتا تھا اور جس سے بت پرستی، اور ستارہ پرستی کا رواج ہو گیا تھا، اس کا کلیۃً خاتمہ ہو گیا،

لیکن یہ مرکزی مسجد بیت المقدس کے بجائے مسجدِ حرام (کعبہ) قرار دی گئی جس مین بہت سی مصلحتین تھین،

۱- یہ ضرور تھا کہ قبلہ کوئی ایسی چیز ہو جس کی طرف ہر شخص ہر جگہ سے ہر ملک میں منہ پھیر سکے
ایسی چیز یا تو کوئی مصنوعی شے ہو سکتی تھی، مثلاً کوئی چراغ، کوئی مومی شمع، کوئی تصویر، کوئی مجسمہ،
کوئی کتاب، جیسا کہ اوپر گذر چکا بعض اہلِ مذاہب اُن چیزوں کو سامنے رکھتے تھے، جن کی وہ
پرستش کرتے تھے، مثلاً بُت، مجسمہ، آگ، پانی، آفتاب وغیرہ اشیاء و عناصر و کواکب ظاہر ہے کہ
اسلام اگر ایسا کرتا تو وہ بھی کھلی ہوئی بت پرستی میں گرفتار ہو جاتا، دوسری صورت یہ تھی کہ اشیاء
کو نہیں بلکہ سمت کو خاص کیا جاتا، مثلاً شمال یا مشرق کہ پہلی سمت میں "جگہ سے نہ ٹلنے والا" قطب تھا
اور دوسری چہرۂ خورشید کا مطلع اور بیاضِ سحر کا دیباچہ تھی، دینِ توحید کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا
کہ ستارہ پرستی کے ابطال کے ساتھ ساتھ ستارہ پرستی کے علامات اور امتیازات کو قائم رکھے
۲- یہ کہنا ممکن ہے کہ شمال اور مشرق کو چھوڑ کر جن کی طرف منہ کرنا ستارہ پرستی ہوتی کسی
اور سمت کا انتخاب کیا جا سکتا تھا، مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ چار سمتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب
کسی نہ کسی مرجح سبب ہی کی بنا پر ہو سکتا تھا، ورنہ خدا کے لحاظ سے تو ہر سمت برابر تھی، اب جو
بھی سمت اختیار کیجاتی اس کے لئے ضرور تھا، کہ اس کی تخصیص کی کوئی مناسب وجہ بھی ہوتی
سمت کی تعیین آفتاب یا دوسرے ممتاز ستاروں کے طلوع و غروب کا لحاظ کئے بغیر ممکن
ہی نہیں، کیونکہ ہر سمت میں کوئی نہ کوئی مشہور ستارہ ہے، جس کی سیدھ سے وہ سمت متعین
کی گئی ہے، اس لئے جو سمت بھی اختیار کیجاتی، اس سے اس سمت کے خاص ستارہ کے
متعلق وجوہِ ترجیح کا پیدا کرنا ضروری تھا، اور اس ترجیح سے دینِ توحید کا دینِ شرک بنجانا لازمی تھا
۳- اسی لئے ملتِ ابراہیمی نے ان صورتوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کسی قربان گاہ یا مسجد کو اپنا قبلہ

بنایا، تاکہ شرک کے ہر قسم کے شائبہ سے اس کی نماز محفوظ رہے، حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی مسجدون مین سے اُن کی نسل نے دو مرکزی مسجدون کو محفوظ رکھا تھا، ایک بیت المقدس جسکو حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے اپنے اپنے زمانون مین بڑے اہتمام سے تیار کرایا، اور یہ بنی اسرائیل کا قبلہ بنی، دوسری مسجد کعبہ جو بنی اسماعیل کا مذہبی مرکز تھی،

۴۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ خانۂ کعبہ بیت المقدس سے پہلے بنا تھا، وہ دنیا مین پہلا گھر تھا جو خدا کی عبادت کے لئے تعمیر ہوا، اور اس کے معمار خود حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ تھے،

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ	بے شک سب سے پہلا مبارک گھر جو
لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا،	انسانون کے لئے (خدا کا) بنا، وہ ہے
(آل عمران - ۱۰)	جو مکہ مین ہے،
وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ	اور جبکہ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ بیت اللہ کی
مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ ۔ (بقرہ - ۱۵)	بنیادین اٹھا رہے تھے،

خانۂ کعبہ کا قبلہ ہونا ایک ایسی حقیقت ہی جس کا انکار عہد اسلام کے یہود کو بھی نہ تھا چنانچہ قرآن پاک مین ہی،

وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ	اور جن کو کتاب دی گئی وہ جانتے ہین
لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ	کہ خانۂ کعبہ کا قبلہ ہونا حق ہے (اور وہ)
رَّبِّهِمْ (بقرہ - ۱۷)	اُن کے پروردگار کی طرف سے (ہی)

پولوس (پال) ایک خط مین جو گلیتون کے نام ہے لکھتا ہی،

کہ یہ لکھا ہے ابرہام (حضرت ابراہیمؑ) کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی (ہاجرہ) سے، دوسرا آزاد (سارہ) سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا، (اسمٰعیل) جسم کے طور پر پیدا ہوا، اور جو آزاد سے تھا (اسحٰق) سو وعدہ کے طور پر، یہ باتیں تمثیلی بھی مانی جاتی ہیں، اس لئے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں ایک تو سینا پہاڑ (حضرت ہاجرہ مصر کی تھیں، اور سینا مصر کے راستے میں ہی) پر سے جو ہو اور غلام جنتی ہیں، یہ ہاجرہ ہے، کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم (بیت المقدس) کا جواب ہے اور ہی اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے پر اوپر کا یروشلم آزاد ہے، (گلیتوں کے نام ۲۲-۲۶، باب ۴)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوگا کہ عیسائیت کا بانی بھی اس بھید سے آگاہ تھا کہ یروشلم اور بیت اللہ (یا عرب کا کوہ سینا) ایک دوسرے کا جواب ہیں، "اب کے یروشلم" سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم نیا ہے، اور بیت اللہ پرانا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عورتیں دو عہد تھیں، یعنی ان کی اولاد کے متعلق حضرت ابراہیمؑ سے خدا نے دو وعدے کئے تھے، ہاجرہ کا وعدہ کوہ سینا پر ہوا تھا جب وہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مصر سے آ رہی تھیں، اور راستہ میں سینا پڑتا تھا، اس وعدہ کے مطابق ہاجرہ کی "غلام اولاد" نے عرب میں عبادت کا ایک مرکزی گھر تعمیر کیا، اور یہ غلام اس پرانے مرکزی گھر کے متولی ہو گئے، یہ گھر بعد کو بنی اسرائیل کے نزدیک ان کے نئے مرکزی عبادت گاہ بیت المقدس کا پورا جواب تھا، سارہ کے وعدہ کا یہاں ذکر نہیں ہے لیکن یہ معلوم ہے کہ بیت المقدس کی تولیت بنی اسرائیل کو عطا ہوئی تھی، گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبر تک خدا کا عہد بیت المقدس اور بنی اسرائیل کے ساتھ تھا، چونکہ بنی اسرائیل نے اپنی

بغاوت، تمرد، سرکشی اور قساوت کے سبب سے اس عہد کو توڑ دیا تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد خدا نے ان کو متنبہ کیا جس کا ذکر سورۂ اسرا کی آیتوں مین ہی، اور جب بنی اسرائیل پر اس تنبیہ کا کچھ اثر نہ ہوا تو خدا نے ان سے اپنا عہد توڑ کر بنو اسماعیل کا وہ عہد شروع کیا جو سینا پر ہاجرہ کے متعلق باندھا گیا تھا،

معراج مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) مین نماز ادا کرنا اور اس کے چند سال بعد خانۂ کعبہ کا قبلہ بنجانا، گویا بنی اسرائیل کے عہد کی شکست اور بنو اسماعیل کے عہد کی ابتدا کا اعلان تھا، جیسا کہ اس کتاب کی تیسری جلد مین بسلسلۂ معراج

سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ	پاک ہی وہ خدا جو اپنے بندہ کو رات
لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی	کے وقت مسجد حرام (خانۂ کعبہ) سے اس
الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ	مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گیا
بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ ۔ (بنی اسرائیل-۱)	جس کی چارون طرف ہم نے برکت دی ہی

کی تفسیر مین لکھا گیا ہے،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ بیت المقدس جو عہد اسرائیلی کا نشان تھا، اسلام کے بعد اس مین قبلہ ہونے کی شان باقی نہین رہی، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی وہ مسجد قبلہ بنائی گئی، جسکا تعلق عہد اسماعیلی سے تھا، (یعنی خانۂ کعبہ) وہ عہد کیا تھا؟ اس کی تفصیل یہ ہے،

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّہٗ	اور جب خدا نے چند باتون مین ابراہیم
بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ ط قَالَ اِنِّیْ	کو آزمایا تو اس نے ان باتون کو پورا کیا

جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۔ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۔

(بقرہ - ۱۵)

خدا نے کہا میں تجھ کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں، (ابراہیم نے) کہا اور میری نسل میں سے (خدا نے) فرمایا میرا عہد ظالموں کو شامل نہ ہوگا، اور جب ہم نے گھر (کعبہ) کو لوگوں کے اجتماع کی جگہ اور امن بنایا، اور تم ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ، اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل سے عہد کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کیلئے

غرض یہ رمزِ الٰہی تھا جو ہزاروں برس پہلے سے خدا کے علم میں تھا، اور جس کی بنا پر رسول اللہ صلعم کی ہجرت کے بعد عالم کا روحانی مرکز بیت المقدس کے بجائے خانۂ کعبہ قرار پایا، جو تاریخی حیثیت سے وہ گھر تھا جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے توحید کی آواز بلند کی تھی، اور جو دنیا میں اس لحاظ سے خدا کا سب سے پہلا گھر تھا، اور روحانی حیثیت سے وہ گھر قبلہ قرار پایا جو اس دنیا میں عرشِ الٰہی کا سایہ اور زمین پر حظیرۃ القدس کا عکس تھا، اس لئے حکم ہوا،

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ

اور تو جہاں بھی نکلے مسجد حرام ہی کی طرف

شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، (بقرہ۔۱۸) منھ کر،

درحقیقت ہرمسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ بھی اسی جگہ کھڑا ہوکر فریضۂ عبودیت ادا کرے جہان حضرت ابراہیمؑ کھڑے ہوئے تھے لیکن چونکہ ہرمسلمان کو ہرجگہ اور ہروقت ایسا کرنا ممکن نہین تھا کم ازکم نماز کے وقت ادھر رُخ ہی کرے، ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت اور اس کی توجہ ہرطرف برابر ہے، اسی لئے قبلہ کی تعیین کے موقع پر فرمایا،

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (بقرہ۔۱۴) پس جدھر منھ پھیرو ادُھرہی خدا کا منھ ہے

خانۂ کعبہ کی دیوارین اور اس کی چھت کسی مسلمان کا معبود ومسجود نہین، نہ مشرکون بت پرستون اور ستارہ پرستون کی طرح نماز ودعا مین قبلہ سے خطاب ہوتا ہے، نہ اس سے کچھ مانگا جاتا ہے نہ اس کی دہائی دیجاتی ہے، نہ اس کو خدا سمجھا جاتا ہے، اور نہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا اس کے اندر بیٹھا ہے، خانہ کعبہ کی دیوارین اگر (بالفرض) ٹوٹ جائین، اس کی چھت گرجائے، اور صرف فضا باقی رہجائے، تب بھی کعبہ قبلہ رہیگا، اسی طرح خود خانہ کعبہ کے اندر جاکر بلکہ اس کی چھت پرکھڑے ہوکر بھی نماز جائز ہے، اگر سمتِ قبلہ کا پتہ نہ لگ سکے تو جدھر قبلہ کا گمان ہو اُدھرہی نماز پڑھی جاسکتی ہے، سواری مین نفل نماز ہرسمت جدھر سواری جارہی ہو پڑھ سکتے ہو، لڑائی کی حالت مین سخت خوف کی صورت مین بھی نماز کے لئے قبلہ کی قید نہین رہتی[1]، یہ باتین ان تمام مشرکانہ غلط فہمیون کی جو خانۂ کعبہ کے قبلہ ہونے سے پیدا ہوسکتی تھین قطعی تردید کرتی ہین، اور یہی اس باب مین دینِ محمدی کی تکمیلی حیثیت ہے،

---

[1] صحیح بخاری کتاب التفسیر تفسیر بقرہ باب قولہ عزوجل فان خفتم فرجالا او رکبانا،

یہ قبلہ گویا مسلمانوں کا ارضی مرکز، ملت ابراہیمی کے پیرو ہونے کا علی ثبوت، دنیا کے سامنے موحدون کی پہلی یادگار، محمد رسول اللہ کے پیرو ہونے کا شعار اور مسلمانانِ عالم کی وحدت کا شیرازہ ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف رخ کرنے کو قبولِ اسلام کی علامت قرار دیا، اور فرمایا کہ "جو ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھے اور ہمارے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھائے، وہ مسلمان ہے[1]" اگر خیال کے پر پرواز سے اڑکر اور فضاے آسمانی کی نیلگون سطح پر کھڑے ہوکر دنیا کے مسلمانوں کو نماز کی حالت مین کوئی شخص دیکھے تو نظر آئے گا کہ قبلہ ایک مرکزی نقطہ ہے، جس کے چارون طرف تمام مسلمانانِ عالم دائرہ کی صورت مین خدا کے آگے صف بستہ اور سربسجود ہین،

رکعتون کی تعداد ایک قیام اس کے بعد رکوع پھر سجدہ، اس مرتب صورت کا نام ایک رکعت ہے، نماز مین کم از کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ چار مقرر کی گئین، صبح کو دو، ظہر، عصر اور عشا کے وقت چار چار، اور مغرب مین تین، ایک رکعت کی مستقل نماز نہین رکھی گئی، اور نہ چار سے زیادہ رکعتین رکھی گئین، کیونکہ مصلحت یہ تھی کہ نماز نہ اتنی مختصر ہو کہ دل مین ذرا اثر بھی پیدا نہ ہوسکے، نہ اتنی لمبی کہ انسان کو بددل بنادے، ایک رکعت کی نماز اتنی مختصر تھی کہ اس سے قلب مین خضوع و خشوع پیدا نہ ہوتا، کیونکہ صرف چند سکنڈ مین تمام ہوجاتی، اور چار سے زیادہ رکعتون کی نماز بددلی کا باعث ہوتی، کیونکہ دیر لگنے کی وجہ سے جی گھبراجاتا، اس لئے فرض نماز کی رکعتین دو سے کم اور چار سے زیادہ نہین رکھی گئین،

[1] بخاری کتاب الصلوۃ باب فضل استقبال القبلہ،

مکہ مین مسلمانون کو جو بے اطمینانی اور بے سروسامانی تھی، اور جس طرح کفار کے ڈر سے چھپ چھپکر وہ نماز پڑھتے تھے، اس کے لحاظ سے اُس وقت نماز مین زیادہ رکعتین ہونا ممکن نہ تھا، اسی لئے مکہ معظمہ مین ہر نماز صرف دو رکعتون کی تھی، جب مدینہ منورہ آکر اطمینان نصیب ہوا تو ظہر، عصر اور عشا مین چار چار رکعتین کر دی گئین لیکن مسافر کے لئے وہی دو رکعتین قائم رہین کیونکہ اس کی عارضی پریشان حالی باقی رہتی ہے، جو اس تخفیف کی علت تھی، حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ مقیم کے لئے چار رکعتین ہین، مسافر کے لئے دو اور بحالت خوف ایک[2]، اس سے ظاہر ہوا کہ اطمینان کی زیادتی اور کمی کی بنا پر ان رکعتون کی تعداد گھٹتی بڑھتی ہے،

مغرب اور صبح کی نمازین قیام وسفر دونون حالتون مین یکسان ہین، مغرب کی تین رکعتون کا آدھا ممکن نہین، اور صبح مین خود دو رکعتین ہین، ان مین کیا کمی ہو سکتی ہے؟ لیکن مغرب اور صبح مین یہ تین اور دو رکعتین کیون ہین؟ اسکی گرہ کشائی ام المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمائی ہے، "مغرب مین تین اس لئے ہے کہ وہ دن کا وتر ہے، اور صبح مین دو اس لئے کہ اس مین دو رکعتون کے بڑھانے کے بجائے قرأت لمبی کر دیگئی ہے[3]"،

حضرت عائشہؓ کے ارشاد مین تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے، گذر چکا ہے کہ عین طلوع اور غروب کے وقت نماز کی ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ کفار (آفتاب پرستون)

---

[1] صحیح بخاری باب الہجرۃ و صحیح مسلم صلوۃ المسافر و مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۴۱ و ابن خزیمہ و ابن حبان والبیہقی (فتح الباری جلد اول صفحہ ۳۹۳) [2] صحیح مسلم صلوۃ المسافر، [3] مسند احمد بن حنبل ۶ - ۲۴۱،

کی عبادت کا وقت تھا[1]، مغرب کی نماز غروبِ آفتاب کے بعد فوراً ہوتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اہلِ توحید آفتاب پرستی کے شرک سے پوری برأت ظاہر کریں، اسی لئے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد وہ رکھی گئی جس سے خدا کے واحد اور وتر ہونے کا ثبوت مل سکے[2]، یہ عددِ واحد تو ہو نہیں سکتا کہ اس سے خضوع وخشوع اور تاثر کا مقصد فوت ہوتا، دو کا عدد بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ زوج اور جوڑا ہے، طاق نہیں، بنابریں توحید کا رمز آشکارا کرنے والا سب سے قریب ترین طاق عدد تین ہی ہے، جس سے خدا کا واحد ہونا اور وتر ہونا دونوں باتیں ثابت ہوتی ہیں، نیز نماز کے خشوع وخضوع کا کمال بھی فوت نہیں ہوتا، جو ایک رکعت ہونے میں فوت ہو جاتا، اس لئے مغرب میں رکعتوں کی تعداد تین رکھی گئی، اور چونکہ آفتاب کا کامل زوال وانحطاط جس کو غروب کہتے ہیں، اسی وقت ہوتا ہے، اس لئے اس توحید کے رمز کو اسی وقت آشکارا ہونا چاہئے، اس مفہوم کی تشریح اُس حدیث کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر نماز کی تاکید فرمائی ہے،

اوتروا یا اھل القرآن فانّ اللہ وتر یحب الوتر (ابوداؤد)	اے قرآن والو! وتر (طاق) پڑھا کرو، کیونکہ خدا بھی وتر (طاق) ہے، اور وہ وتر (طاق) کو پسند کرتا ہے،

صبح کا وقت وہ دلکش وقت ہے جب انسان پورے آرام اور سکون کے بعد بیدار

---

[1] صحیح مسلم النہی عن الصلوٰۃ فی الاوقات الثلث، [2] عشاء کی بعد کی وتر نماز کو بھی وتر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ طاق ہوتی ہے، یعنی تین جو رات کی وتر ہے،

ہوتا ہے، یہ بڑا سہانا وقت ہوتا ہے طبیعت موزون ہوتی ہے، دل مطمئن ہوتا ہے، تمام عالم اس وقت سراپا اثر اور مجسم کیف نظر آتا ہے، اس لئے یہ وقت نماز و دعا کے لئے خاص طرح سے موزون ہے، اور قرآن مجید مین اس کے اس خاص امتیاز کا ذکر ان لفظون مین کیا گیا ہے،

إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ۔ (بنی اسرائیل-۹)

صبح کی نماز کی قرأت کا وقت حضوری کا ہوتا ہے،

اس بنا پر شریعت محمدیہ نے اس وقت کی نماز مین رکعتون کی تعداد کے بجائے اس کی اصلی کیفیت کو پیش نظر رکھا، یعنی رکعتین تو دو ہی رہین، مگر حکم دیا گیا کہ قرأت لمبی کر دی جائے، اور سورتین بڑی بڑی پڑھی جائین، چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور نمازون کی ایک رکعت مین تقریبًا پندرہ آیتین تلاوت فرماتے تھے، مگر صبح کی نماز مین ساٹھ آیتون سے لیکر سو آیتون تک قرأت کرتے تھے[1]، اور اسی نسبت سے رکوع و سجود بھی ہوتا تھا[2]،

رکعتون کی تعداد اگرچہ آنحضرت صلعم اور صحابہ کی سنت متواترہ سے ثابت ہے، اور تمام مسلمان اس تواتر پر بلا استثناء عامل بھی ہین، تاہم اس کا عملی اشارہ قرآن پاک مین نماز خوف سے ظاہر ہوتا ہے جس مین یہ حکم ہے کہ اسلامی فوج کے دو حصے ہو جائین، پہلے اگلا حصہ امام کے پیچھے کھڑا ہو کر ایک رکعت ادا کرے اور دوسرا دشمن کے مقابل کھڑا رہے، پھر اگلا حصہ دشمن کے سامنے کھڑا ہو جائے اور دوسرا امام کے پیچھے آکر ایک رکعت ادا کرے، اس طرح امام کی دو رکعتین ہو جاتی ہین، اور مقتدیون کی جماعت کے ساتھ ایک ایک، اور اگر دوسری رکعت کا موقع ملتا ہے تو وہ ان کا

---

[1] صحیح مسلم کتاب الصلوۃ باب القراءۃ [2] مسلم کتاب الصلوۃ باب اعتدال ارکان الصلوۃ و تخفیفہا فی تمام،

کے ساتھ اور یہ ممکن نہ ہو تو اشاروں سے علیحدہ علیحدہ ادا کرتے ہیں[1]، جب نمازِ خوف میں قصر کی دو رکعتیں ثابت ہوئیں، تو اصل رکعتیں چار ہونگی، اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ قصر چار ہی رکعت والی نمازوں میں ہے، نمازِ قصر کی آیات سورۂ نسار کے پندرہویں رکوع میں ہیں،

نماز کے آداب باطنی | قرآنِ پاک اور احادیثِ نبویہ میں نماز کے لئے متعدد لفظ آئے ہیں، مثلاً صلوٰۃ، دُعا، تسبیح، اور ذکرِ الٰہی، اور یہ الفاظ خود نماز کے روحانی خصوصیات و آداب کو ظاہر کرتے ہیں، نماز جسم و روح دونوں کی عبادت ہے، اگر اس میں جسم کی حرکت کے ساتھ دل کی جنبش شامل نہ ہو، اور روح میں اہتزاز نہ پیدا نہ ہو جائے تو ایسی نماز گلِ بے رنگ اور شرابِ بے کیف سے زیادہ نہ ہوگی،

اقامتِ صلوٰۃ، نماز پڑھنے کے لئے قرآنِ پاک میں جابجا "اقامتِ صلوٰۃ" (نماز کو قائم کرنا) کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی صرف نماز پڑھنے کے نہیں، بلکہ نماز کو اس کے آداب و ارکان و سنن کیساتھ ادا کرنے کے ہیں، چنانچہ خوف کی حالت میں جہاں نماز کے بعض آداب و ارکان و شرائط کو معاف کر دیا گیا ہے، اس کے بعد ہی یہ کہا گیا ہے فَإِذَا اطْمَأْنَنتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ "پھر جب تم کو اطمینان ہو جائے تو نماز کو قائم کرو" اس سے معلوم ہوا کہ اقامتِ صلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نماز کو اس کے تمام آداب و ارکان و شرائط کے ساتھ بجا لایا جائے اس بنا پر نماز

---

[1] احادیث میں نمازِ خوف کی بہت سی صورتیں ہیں، جن میں سے ہر مجتہد نے اپنی اپنی دلیل کے رو سے ایک ایک صورت کو مخصوص کر لیا ہے، مگر محدثین میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ سب صورتیں جائز ہیں، میرا ناقص خیال یہ ہے کہ یہ سب مختلف صورتیں لڑائی کے مختلف حالات کی بنا پر ہیں، جب جیسی صورت پیش آئی اس کے مطابق نماز ادا کی گئی،

جنگ میں اشاروں سے نماز ادا کرنے کا مسئلہ امام بخاری اور بعض محدثین کا ہے،

مین اطمینان، ارکان کا اعتدال، باطنی خضوع وخشوع ملحوظ رہنا چاہیئے جس کے بغیر نماز ناقص رہتی ہے،

قنوت، نماز کے آداب باطنی مین دوسری چیز قنوت ہے، اللہ تعالی فرماتا ہے،

وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ، (بقرہ ع-۳۱) اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو،

صحابہؓ کہتے ہین کہ ہم لوگ پہلے نماز مین باتین کر لیا کرتے تھے، لیکن جب یہ آیت اتری تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا کہ یہ یکسوئی اور نماز کے باطنی آداب کے خلاف تھا، قرآن پاک مین جس قنوت کا حکم دیا گیا ہے وہ عجیب جامع لفظ ہے، لغت مین (دیکھو لسان العرب) اس کے حسب ذیل معنی ہین، چپ رہنا، بندگی کرنا، دعا مانگنا، عبادت کرنا، کھڑے رہنا، دیر تک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا، نماز کے جس قنوت کا اس آیت مین ذکر ہے، اس کے متعدد معنون مین سے ہر معنی نماز مین مقصود ہے، کیونکہ نماز مین ذکر و قرأت، تسبیح واستغفار، سلام وتشہد کے سوا تمام انسانی ضرورتون اور باتون سے خاموشی ہوتی ہے، وہ خدا کی بندگی بھی ہے دعا بھی ہے عبادت بھی ہے، اس مین دیر تک قیام بھی ہے، اور عاجزی کا اظہار بھی ہے اگر ان مین سے کوئی بھی کسی نماز مین کم ہو تو اسی قدر نماز کے اوصاف مین کمی ہو جائے گی،

خشوع، تیسری چیز خشوع ہے، چنانچہ قرآن پاک مین نمازیون کی یہ صفت آئی ہے:

اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ (وہ مومنین کامیاب ہین) جو اپنی

خَاشِعُوْنَ (مومنون-۱) نماز مین خشوع وخضوع کرتے ہین

خشوع کے لغوی معنی یہ ہین، بدن جھکا ہونا، آواز پست ہونا، آنکھین نیچی ہونا یعنی ہر ادا سے

مسکنت، عاجزی اور تواضع ظاہر ہونا، (لسان العرب) اس لئے نماز خدا کے سامنے اپنی مسکینی بیچارگی اور افتادگی کا اظہار ہے، اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو گویا نماز کی اصلی غرض فوت ہو گئی،

تبتل تبتّل کے اصلی معنی "کٹ جانے" کے ہیں، اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں خدا کے سوا ہر چیز سے کٹ کر صرف خدا کا ہو جانا، ظاہر ہے کہ یہ ایک مسلمان کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے، مگر قرآن پاک میں جہاں اس کا حکم ہے، سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی حالت سے متعلق ہے، چنانچہ سورہ مزمل میں ہے،

یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّیْلَ	اے کملی اوڑھنے والے! تھوڑی دیر
اِلَّا قَلِیْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ	کے سوا تمام رات اٹھ کر نماز پڑھا کر، آدھی
مِنْهُ قَلِیْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ	رات یا اس سے کچھ کم و بیش اور اس
وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ؕ اِنَّا	میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر
سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۙ	ایک بھاری بات اتارنے والے
اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ	ہیں، بیشک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے
وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا ؕ اِنَّ لَكَ	میں طمانیت قلب کا زیادہ موقع ہے
فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا ؕ	اور قرآن سمجھ کر پڑھنے کے لئے زیادہ
وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ	موزوں ہے، تیرے لئے دن کو بڑی
اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا ؕ	فرصت ہے، اپنے پروردگار کا نام
(مزمل - ۱)	لے اور ہر چیز سے کٹ کر اسکی طرف ہو جا،

یعنی نماز کی حالت مین خدا کا ذکر کرتے وقت اس کی عظمت اور اپنی عاجزی کے سوا ذہن سے تمام خیالات نکل جانے چاہئین، صحیح مسلم مین حضرت عمرو بن عبسہؓ سلمی سے روایت ہے کہ مجھے آنحضرت صلعم نے جو نماز سکھائی اس کے متعلق یہ فرمایا کہ وضو کرکے جب کوئی نماز کیلئے کھڑا ہوا، پھر خدا کی حمد کی، ثنا کی، اور خدا کی اس بزرگی کا اظہار کیا جس کا وہ سزاوار ہے، اور اپنے دل کو خدا کے لئے ہر چیز سے خالی کر لیا (وفرّغ قلبہ للہ) تو وہ نماز کے بعد ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس کی ماں نے اس کو اسی وقت[1] پیدا کیا ہو، یہ حدیث گویا اسی آیت کی تفسیر ہے،

تضرع، تضرُّع کے معنی زاری اور عاجزی اور عاجزی کے ساتھ درخواست کرنے کے ہین، (لسان العرب) نماز مین بندہ پر عاجزی، زاری اور عجز والحاح کے ساتھ سوال کرنے کی کیفیت طاری ہونی چاہئے، ورنہ اس حکم پر عمل نہ ہوگا،

اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً	تم اپنے پروردگار کو مسکنت اور زاری
(اعراف - ۷)	کے ساتھ اور دھیمی آواز سے پکارو،

اخلاص، نماز کے باطنی سنن و آداب کا اصلی جوہر "اخلاص" ہے، یعنی یہ کہ نماز سے مقصود خدا کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو، کیونکہ اگر ایسا نہین ہے تو نماز نماز نہین، بلکہ ریا، اور نمایش ہوگی اور بعض اہل حق کے نزدیک شرک لازم آئیگا، فرمایا،

وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ	اور تم ہر نماز کے وقت اپنے رُخ کو
مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ	ٹھیک رکھو اور خدا کو اخلاص کے

[1] صحیح مسلم اول باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا،

لَهُ الدِّیْنَ ط (اعراف-۳) ساتھ پکارو،

اس سے معلوم ہوا کہ نماز مین اخلاص کا پیدا کرنا اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہے،

ذکر "نماز" خدا کی یاد کے لئے ہے، اگر دل مین کچھ اور زبان پر کچھ ہو، تو خدا کی حقیقی یاد نہ ہوگی، اسی لئے فرمایا،

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ، (طٰہٰ-۱) میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر،

ظاہر ہے کہ "یاد" صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے کا نام نہین ہے، اس کے ساتھ دل کی نیت اور قلب کا حضور بھی ہونا چاہئے، اور یہی نماز کی بڑی غرض ہے،

فہم وتدبر، نماز مین جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے، اگر بے پروائی کی وجہ سے معنون کی طرف دل متوجہ نہ ہوا، تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا، اسی لئے نشہ کی حالت مین نماز پڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے، کہ اس حالت مین سمجھنے والا دل شرابی کے پہلو مین نہین، فرمایا،

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ، (نساء-۷)

نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تم نشہ مین ہو، یہانتک کہ (اتنا ہوش آجائے کہ) جو تم کہو اس کو سمجھو،

اس آیتِ پاک نے یہ واضح کیا کہ نماز مین جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے، اسی بنا پر آپ نے نیند کے غلبہ کی حالت مین نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے، کہ اس مین بھی انسان فہم اور تدبر سے عاری ہو جاتا ہے، چنانچہ حدیث مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ "نماز میں جب تم پر نیند غالب آئے تو سو جاؤ، کیونکہ اگر نیند کی حالت میں نماز پڑھو گے تو ممکن ہے کہ دعا کے بجائے اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگو[۱]" دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا "نماز کو جب نیند آئے تو سو جانا چاہیئے، تاکہ وہ جو کہتا ہے وہ سمجھے[۲]" حاکم کی مستدرک میں ہے، کہ آپ نے فرمایا "جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر اس طرح نماز پڑھے کہ جو وہ کہتا ہے اس کو سمجھتا بھی ہے، یہاں تک کہ نماز ختم کر لے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اسی دن وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا[۳]"

یہ نماز کے وہ باطنی آداب ہیں جن کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی، جس طرح نماز کے ظاہری شرائط سے غفلت برتنا، نماز سے غفلت ہے، اسی طرح نماز کے ان باطنی آداب کا لحاظ نہ کرنا بھی نماز سے غفلت ہے، اور اس لئے اس آیت ذیل کے مصداق دونوں ہیں،

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ	پس پھٹکار ہو ان نمازیوں پر جو اپنی نماز
عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ	سے غفلت برتتے ہیں، جو دکھاوے
الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (ماعون - ۱)	کی نماز پڑھتے ہیں،

ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے "ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل ہیں پھٹکار ہو" نمازی ہونے کے باوجود نماز سے غافل ہونے کے یہی معنی ہیں، کہ نماز کے لئے جو ظاہری آداب، مثلاً وقت کا لحاظ، اور ادائے ارکان میں اعتدال وغیرہ، اور جو باطنی آداب مثلاً خشوع و خضوع، تضرع و زاری

---

[۱] مسلم کتاب الصلوٰۃ باب امر من نعس فی صلاتہ جلد اصفحہ ۲۹۳ [۲] بخاری و ابوداؤد و مسند احمد عن انس رض [۳] مستدرک (ترغیب و ترہیب حافظ منذری جلد اوّل ص۔ مصر) اس سے ان مسلمانوں کو جو عربی زبان نہیں سمجھتے عبرت حاصل کرنی چاہیئے، اور چاہیئے کہ نماز میں جو سورتیں اور دعائیں وہ پڑھتے ہیں، اُن کے معنی ذہن نشین کر لیں، اور یہ ہر مسلمان کے لئے بہت آسانی سے ممکن ہے، بشرطیکہ وہ تھوڑی توجہ کرے،

اور فہم و تدبر وغیرہ ضروری ہین، ان سے نماز مین تغافل برتا جائے،

نماز کے گذشتہ آداب کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات تعلیمات اور عملی مثالین ہین جنمین آپنے نماز کی اصلی حقیقت کو آشکارا کیا ہے، ایک دفعہ مسجد نبوی مین ایک شخص نے آکر نہایت عجلت مین نماز پڑھی، آپنے فرمایا "اے شخص اپنی نماز پھر پڑھ کیونکہ تونے نماز نہین پڑھی" اس نے دوبارہ اسی طرح نماز ادا کی، آپنے پھر وہی ارشاد فرمایا، جب تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے عرض کی یا رسول اللہ، کیسے نماز پڑھون؟ فرمایا "اس طرح کھڑے ہو، اس طرح قرأت کرو، اس طرح اطمینان وسکون کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرو"[1]

نماز مین سر اٹھا کر اوپر دیکھنا خشوع کے خلاف ہے، اس سے انسان کی توجہ ہٹتی اور حضور قلب مین خلل پڑتا ہے، اس لئے آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "نماز مین سر اوپر اٹھا کر نہ دیکھا کرو، کیا تمھین یہ ڈر نہین کہ تمھاری نظر پھر واپس نہ آسکے"[2] آپنے یہ بھی فرمایا کہ "جب تک بندہ نماز مین دوسری طرف ملتفت نہین ہوتا خدا اس کی طرف ملتفت رہتا ہے، اور جب وہ خدا کی طرف سے منھ پھیر لیتا ہے، تو خدا بھی اپنا منھ اس کی طرف سے پھیر لیتا ہے"[3] طبرانی مین ہے کہ آپنے ارشاد فرمایا "جب تم مین سے کوئی شخص نماز کے لئے کھڑا ہو، تو وہ خدا کی طرف پوری طرح متوجہ رہے، یہان تک کہ نماز سے فارغ ہو جائے، اور نماز مین منھ پھیر کر ادھر اودھر نہ دیکھو، کیونکہ جب تک تم نماز مین ہو خدا سے باتین کر رہے ہو"[4] مسند بزاز مین ہے کہ "جب بندہ نماز مین ادھر اودھر دیکھتا ہے

[1] صحیح بخاری، صحیح مسلم و ابوداؤد کتاب الصلوۃ، [2] مسند احمد عن جابر بن سمرہ، [3] مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۱۷۲ و ابوداؤد باب الالتفات فی الصلوۃ، [4] طبرانی فی الاوسط عن ابی ہریرہ بحوالہ کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۱۰۱،

تو خدا فرماتا ہے تو کدھر دیکھتا ہے؟ کیا تیرے نزدیک مجھ سے بھی بہتر کوئی چیز ہے، تو میری طرف دیکھ۔ دوسری دفعہ بھی خدا یہی فرماتا ہے، پھر تیسری دفعہ جب اس سے یہ حرکت صادر ہوتی ہے تو خدا اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیتا ہے[1]۔

ایک دفعہ آپ نے فرمایا "سب سے بڑا چور وہ ہے جو نماز کی چوری کرتا ہے"، صحابہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! نماز کی چوری کیا ہے، فرمایا "رکوع اور سجدہ اچھی طرح نہ کرنا، اور خشوع نہ ہونا[2]" ایک دفعہ آپ نے نماز سے فارغ ہو کر آخری صف کے ایک شخص کو آواز دی کہ "اے فلاں تو خدا سے نہیں[3] ڈرتا کس طرح نماز پڑھتا ہے، جب کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو اپنے رب سے باتیں کرتا ہے پس سوچنا چاہیے کہ اس سے کس طرح باتیں کرے[3]" صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "کیا تو نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھتا، کیا نماز پڑھنے والا جب نماز پڑھتا ہے تو یہ نہیں سمجھتا کہ وہ کس طرح نماز پڑھ رہا ہے؟ تو اپنے ہی فائدہ کے لئے نماز پڑھتا ہے[4]۔" نماز کی حالت میں تھوکنا اور خصوصاً سامنے تھوکنا ادب کے خلاف ہے، آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ "نماز کی حالت میں خدا تمھارے سامنے ہوتا ہے، تو کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اس کے سامنے تھوکو[5]۔" دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا "نماز میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کہ اس وقت وہ خدا سے باتیں کرتا ہوتا ہے[6]" مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا "نماز میں خدا تمھارے منہ کے سامنے ہوتا ہے[7]۔"

---

[1] کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۱۰۲ [2] مسند احمد عن قتادہ، ودارمی باب من لا یتم الرکوع والسجود، وابن ابی شیبہ وابن خزیمہ وابن حبان، وعبد ابن حمید وعبد الرزاق، وطبرانی فی الاوسط، اخیر لفظ بعض روایتوں میں نہیں ہے، [3] مستدرک حاکم فی الصلوٰۃ جلد اول صفحہ ۲۳۶ (علی شرط مسلم) [4] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الامر بتحسین الصلوٰۃ [5] صحیح مسلم کتاب المساجد باب النہی عن البصاق فیہا، وحاکم فی المستدرک وابو داؤد، [6] صحیح بخاری ومسلم کتاب الصلوٰۃ والمساجد [7] ایضاً باب النہی عن البصاق فیہا

نماز مین سکون اور اطمینان پیدا کرنے کی بھی آپ نے ہدایتین فرمائی ہین، ارشاد ہوا کہ جب نماز ہو رہی ہو (اور تم باہر سے آؤ) تو دوڑ کر مت آؤ، بلکہ اس طرح آؤ کہ تم پر سکون اور وقار طاری ہو[1] اس سے اوّل تو یہ مقصود ہے کہ خود اس شخص پر سکون و اطمینان طاری رہے، دوسرے یہ کہ اُس کی دوڑ یا چال سے دوسرے نمازیون کے سکون مین خلل نہ آئے، اسی طرح بے اطمینانی کے اگر طبعی اسباب ہون تو نماز سے پہلے اُن سے بھی فراغت کر لیجائے، مثلاً بھوک ہو اور کھانا رکھا ہو، اور ادھر جماعت کھڑی ہو رہی ہو، تو پہلے کھانا کھا لینا چاہئے تاکہ نماز اطمینان سے ادا ہو[2]، اسی طرح اگر استنجا یا قضاے حاجت کی ضرورت ہو تو پہلے اس سے فراغت کر لیجائے تب نماز پڑھی جائے[3]،

آغازِ اسلام مین لوگ نماز کی حالت مین ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیتے تھے لیکن مدینہ آکر یہ اجازت منسوخ ہو گئی، ایک صحابی نے جن کو اس کی خبر نہ تھی، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو کئی دفعہ نماز مین سلام کیا، اور جب آپ نے جواب نہ دیا، تو نماز کے بعد انھون نے اس کا ذکر کیا فرمایا[4]،

اِنَّ فِی الصَّلٰوۃِ لَشُغۡلاً، نماز مین اور ہی مصروفیت ہوتی ہے،

نماز پڑھتے وقت ایسے کپڑے پہننا یا سامنے ایسا پردہ لٹکانا جن کے نقش و نگار مین دل محو ہو جائے، اور توجہ ہٹ جائے مکروہ ہے، ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے گل بوٹون کی ایک

---

[1] صحیح مسلم باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار، [2] صحیح بخاری و مسلم و ابو داؤد و ترمذی باب کراہیۃ الصلوٰۃ بحضرۃ الطعام، [3] صحیح مسلم و ابو داؤد و موطاے امام مالک و ترمذی و حاکم فی الصلوٰۃ، [4] صحیح مسلم باب تحریم الکلام فی الصلوٰۃ،

چادر اوڑھ کر نماز پڑھی، پھر فرمایا "اس کے گل بوٹوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا، اس کو ابوجہم (ان کا جم
کا نام) کے پاس لیجاؤ اور انبجانی سادہ چادر لے آؤ"[1] اسی طرح ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے سامنے
دیوار پر ایک منقش پردہ لٹکا دیا تھا آپ نے نماز پڑھی تو خیالات میں یکسوئی نہ رہی، آپ نے اسکو اتروا دیا[2]

نماز کے اوقات کی تعیین میں بھی یہ اصول مدِنظر رکھا گیا ہے، کہ وہ ایسے ہونے چاہئیں
جن میں نسبتہً سکون میسر ہوتا ہو، اسی لئے ظہر کی نماز کا اصلی وقت اگرچہ فوراً بعدِ زوال ہونا چاہئے
تاہم چونکہ اس وقت گرمی سخت ہوتی ہے، اس لئے ذرا توقف کا حکم دیا گیا، گرمی کے دنوں میں
چونکہ اور بھی زیادہ شدت ہوتی ہے، اس لئے فرمایا کہ یہ دوپہر کی گرمی جہنم کی آگ ہے، اس لئے
ذرا ٹھنڈک کے بعد ظہر کی نماز پڑھو،

فَاِنَّ الصَّلٰوۃَ مَشْہُوْدَۃٌ مَحْضُوْرَۃٌ[3] کیونکہ نماز میں حضور[4] ہوتا ہے،

نماز کی روحانی کیفیت کا سب سے اعلیٰ منظر یہ ہے کہ انسان پر ایسی حالت طاری ہو جائے
کہ اُسے معلوم ہو کہ وہ اس وقت خدا کے سامنے کھڑا ہے، گذر چکا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے
دریافت کیا تھا کہ احسان کیا ہے؟ فرمایا یہ ہے کہ "جب تم عبادت کرو تو تم کو یہ معلوم ہو کہ تم
خدا کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم خدا کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو بہرحال دیکھ رہا ہے"[5] کبھی کبھی
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز میں رقت طاری ہو جاتی تھی، اور چشم مبارک سے آنسو نکلنے لگتے
تھے، ایک صحابی جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کیفیت کو ایک دفعہ دیکھا تھا، کہتے
ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، روتے

[5] صحیح بخاری کتاب الایمان،

[1] صحیح مسلم باب کراہیۃ الصلوٰۃ فی ثوب لہا اعلام، [2] صحیح بخاری و مسلم کتاب اللباس، [3] محدثین نے اس حضور سے فرشتوں کا حاضر ہونا مراد لیا ہے
[4] صحیح مسلم باب النہی عن الاوقات الثلث،

ہچکیاں بندھ گئی ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چکی چل رہی ہے، یا ہانڈی ابل رہی ہے[1]

رات کی نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عجیب ذوق و شوق کا عالم طاری ہوتا تھا، قرآن پڑھتے چلے جاتے، جب خدا کی عظمت و کبریائی کا ذکر آتا پناہ مانگتے، جب رحم و کرم کی آیتیں آتیں، تو دعا کرتے[2] تے، آپ نے فرمایا کہ "نماز دو دو رکعت کر کے ہے، اور ہر دوسری رکعت میں تشہد ہے، اور تضرع و زاری ہے خشوع اور خضوع ہے، عاجزی اور مسکنت ہے، اور ہاتھ اٹھا کر اے رب اے رب کہنا ہے، جس نے ایسا نہ کیا، تو اس کی نماز ناقص رہی[3]"

ایک دفعہ آپ اعتکاف میں تھے اور لوگ مسجد میں زور زور سے قرأت کر رہے تھے، آپ نے فرمایا "لوگو! تم میں سے ہر ایک خدا سے مناجات کر رہا ہے، تو وہ سمجھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، اور ایک دوسرے کی مناجات میں اپنی آواز سے خلل انداز نہ ہو[4]"

ایک صحابی نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کچھ ہدایت فرمایئے ارشاد ہوا کہ جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تمہاری نماز ایسی ہونی چاہیئے کہ یہ معلوم ہو کہ تم اسی وقت مر رہے ہو اور دنیا کو چھوڑ رہے ہو[5]" کیا نماز کی اس کیفیت کا کوئی شخص اندازہ کر سکتا ہے؟

اس پوری تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی نماز کیا ہے؟ قرآن کس نماز کو لے کر اترا ہے؟ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس نماز کی تعلیم دی ہے؟ اور اس کی اصلی کیفیتیں کیا کیا ہیں؟

---

[1] ترمذی و ابو داؤد باب البکاء فی الصلوٰۃ [2] مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۹۲، [3] ابو داؤد باب صلوٰۃ النہار، و ترمذی باب ما جاء فی التخشع فی الصلوٰۃ صفحہ مطبوعہ دہلی، [4] ابو داؤد صلوٰۃ اللیل، [5] مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۴۱۲ عن ابی ایوب،

اور اگر نماز یہ نماز ہو تو وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاحات کا کتنا مؤثر ذریعہ ہے، اسی لئے قرآن پاک نے نماز کی محافظت یعنی پابندی اور آداب کیساتھ ادا کرنے کو ایمان کا نتیجہ بتایا ہے،

وَالَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ	اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں
یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ وَہُمۡ عَلٰی صَلَاتِهِمْ	وہ قرآن کو مانتے ہیں، اور وہ اپنی نماز
یُحَافِظُوۡنَ ۔ (انعام۔ ۱۱)	کی نگہداشت کرتے ہیں،

نماز کی اس نگہداشت اور محافظت کے دو معنی ہیں، اور دونوں یہاں مقصود ہیں یعنی ایک تو اس کے ظاہری شرائط کی تعمیل اور دوسرے اس کے باطنی آداب کی رعایت،

نماز کے اخلاقی تمدنی اور معاشرتی فائدے

نماز تو درحقیقت ایمان کا ذائقہ، روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی، اخلاقی، تمدنی، اور معاشرتی اصلاحات کا بھی کارگر آلہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اخلاق و تمدن و معاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا، اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے بدوی، وحشی اور غیر متمدن ملک کو جس کو پہننے اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا چند سال میں ادب و تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا، اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے، تو وہ کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف مذہب کے اثر سے، مہذب متمدن ہو جاتا ہے متمدن قوموں میں جب وہ پہنچ جاتا ہے، تو ان کے تخیل کو بلند سے بلند تر، پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا دیتا ہے اور ان کو اخلاص کی وہ تعلیم دیتا ہے جس کے سبب سے ان کا وہی کام جو پہلے مٹی تھا، اب اکسیر بنجاتا ہے۔

۱۔ نماز کے ان معاشرتی فائدوں میں بالکل ابتدائی چیز ستر پوشی کا خیال ہے انسان کا

شرم و حیا کی نگہداشت کے لئے اپنے جسم کے بعض حصّون کو چھپانا نہایت ضروری ہی، عرب کے بدّو اس تہذیب سے ناواقف تھے، بلکہ شہرون کے باشندے بھی اس سے بے پروا تھے، یہانتک کہ غیر قریشی عورتین جب حج کے لئے آتی تھین تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھین، اور اکثر ننگی ہو کر طواف کرتی تھین، اسلام آیا تو اس نے سترپوشی کو ضروری قرار دیا، یہانتک کہ بغیر اس سترپوشی کے اُسکے نزدیک نماز ہی درست نہین، آیت نازل ہوئی،

خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف ۳) ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو،

مردون کے لئے کم از کم ناف سے گھٹنے تک اور عورتون کے لئے پیشانی سے لیکر پاؤن تک چھپانا نماز مین نہایت ضروری قرار پایا، اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربون کو اور جہان جہان اسلام گیا، وہان کے برہنہ باشندون کو ستر عورت پر مجبور کیا، اور نماز کی تاکید نے دن مین پانچ دفعہ ان کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لئے ان کو سترپوش بنا دیا، افریقہ اور ہندوستان مین مسلمانون اور غیر مسلمانون کے لباسون پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو جا سکتا ہی کہ اسلام نے تمدّن کے اس ابتدائی سبق مین دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے، دوسری طرف متمدن قومین زیب و زینت اور حسن و آرایش اور تمدّن کی بے اعتدالی سے بیحیائی پر اتر آتی ہین، مرد گھٹنون سے اونچا لباس اور عورتین نیم برہنہ یا نہایت باریک لباس پہنتی ہین، نماز ان کی بھی اصلاح کرتی ہے اور ان متمدن قومون کو اعتدال سے تجاوز نہین کرنے دیتی، چنانچہ عورتون کو تیز خوشبو لگا کر مسجد مین جانے سے منع فرمایا، اور بے حیائی کے کپڑون کے پہننے سے عموماً روک دیا ہے، اور کہدیا ہے کہ ستر عورت کے بغیر نماز نہین ہوتی،

طہارت

۲- اس کے بعد تمدن کا دوسرا ابتدائی سبق طہارت اور پاکیزگی ہے، جو اسلام کے اولین احکام مین سے ہے، اقرا کے بعد دوسری ہی وحی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس مین یہ حکم تھا،

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، (مدثر-۱) اور اپنے کپڑون کو پاک رکھ،

چنانچہ اسلام نے اس طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات سے اس کے حدود متعین فرمائے، اور نماز کی درستی کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان کا بدن، اس کے کپڑے اور اس کی نماز پڑھنے کی جگہ نجاستون اور آلودگیون سے پاک ہون، اہل عرب کو دوسری وحشی قومون کی طرح طہارت ونظافت کی مطلق تمیز نہ تھی یہانتک کہ ایک بدو نے مسجد نبوی مین آکر سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کر دیا، صحابہؓ اس کو مارنے کو دوڑے آپ نے ان کو روکا، اور اس بدو کو اپنے پاس بلا کر نہایت مہربانی سے فرمایا کہ "یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے، اس قسم کی نجاستون کے لئے یہ موزون نہین ہے" اور صحابہؓ سے فرمایا کہ اس نجاست پر پانی بہا دو، ایک دفعہ ایک قبر کے پاس سے آپ گذرے تو فرمایا کہ "اس قبر والے پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹون سے پرہیز نہین کرتا تھا" غرض اس تعلیم نے جو صرف نماز کے لئے تھی، اہل عرب اور عام مسلمانون کو پاک وصاف رہنے کا خوگر بنایا، اور استنجا، بیت الخلا، اور طہارت کے وہ آداب سکھائے جن سے آج کی بڑی بڑی متمدن قومین بھی ناآشنا ہین نجاستون سے اپنے بدن، کپڑے اور مکان کو صاف رکھنے کی تعلیم دی، جو صحابہ طہارت کا اہتمام کرتے تھے، خدا نے ان کی مدح فرمائی،

فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ، (توبہ ۔ ۱۳)

اس مسجد مین کچھ لوگ ایسے ہین جو پسند کرتے ہین کہ وہ پاک وصاف رہین اور اللہ تعالیٰ پاک وصاف رہنے والون کو پیار کرتا ہے ،

جب اسلام نے طہارت وپاکیزگی کو خدا کے پیار کرنے کا ذریعہ ٹھرایا تو اس نعمت سے محرومی کو کون پسند کرسکتا ہے ،

صفائی

۳ ۔ نماز کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے جسم اور اعضاء کے پاک اور ستھرا رکھنے پر مجبور کرتی ہے، دن مین عموماً پانچ دفعہ ہر نمازی کو منھ، ہاتھ، پانون جو اکثر کھلے رہتے ہین اُن کے دھونے کی ضرورت پیش آتی ہے ناک مین پانی ڈال کر ناک صاف کرنی ہوتی ہے، ایک بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے یہ کہا کہ آج کل کے جراثیم کے نظریہ کی بنا پر بہت سی بیماریان ناک کی سانس کے ذریعہ جراثیم کے بدن کے اندر جانے سے پیدا ہوتی ہین اور ناک کے نتھنون کو پانی ڈالکر صاف کرنے سے یہ جراثیم دور ہوتے ہین ،

دنیا مین اسلام کے سوا اور کوئی مذہب نہین ہے جس نے ناک مین پانی ڈالنا ضروری قرار دیا ہو، حالانکہ طبّی حیثیت سے یہ سب سے زیادہ ضروری چیز ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام کس قدر طبّی اصول پر مبنی ہین، نمازیون کو پنجوقتہ وضو کی ہدایت کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم نازل ہوا اس ملک مین جہان پانی سب سے زیادہ کمیاب ہے ،

اہلِ عرب اور خصوصاً بدو دانتوں کو بہت کم صاف کرتے ہیں جس سے گندہ دہنی اور بدنمائی کے علاوہ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کی اتنی تاکید فرمائی ہے کہ گویا وجوب کے قریب پہنچ گئی اور فرمایا کہ "اگر میری امت پر یہ شاق نہ گذرتا تو میں اس کو ضروری قرار دیتا"

اسی پانی کی کمی کی وجہ سے اہلِ عرب نہاتے کم تھے، اُن کے کپڑے عموماً اُون کے ہوا کرتے تھے، وہ محنت مزدوری کرتے تھے جس سے پسینہ میں شرابور ہو جاتے تھے، اور چونکہ ایک ایک کپڑے کو مہینوں پہنے رہتے تھے، اس لئے جب مسجد میں نماز پڑھنے آتے تو اُن کے بدن اور کپڑوں سے بدبو آتی تھی، اس بنا پر اسلام نے ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جمعہ کو نماز سے پہلے غسل کرنے کی بڑی تاکید کی ہے، آنحضرت صلعم نے فرمایا،

غسل یوم الجمعة واجب علی کل محتلم، (بخاری کتاب الجمعہ)	جمعہ کے دن نہانا ہر بالغ پر ضروری ہے،

اسی کے ساتھ اس دن دھلے ہوئے کپڑے پہننا، خوشبو ملنا، اور صفائی و نظافت کے دوسرے امور کو مستحسن قرار دیا، بعض حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا جس کے بغیر کوئی نماز ممکن ہی نہیں، فرمایا،

وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا، (مائدہ-۲)	اور اگر تم ناپاک ہو گئے ہو تو نہا کر اچھی طرح پاک ہو جاؤ،

پابندیٔ وقت

۴۔ انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس کے تمام کام مقررہ

اوقات پر انجام پائیں، انسان فطرۃً آرام پسند اور راحت طلب پیدا ہوا ہے، اس کو پابند اوقات بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بعض کاموں کے اوقات جبراً مقرر کر دیئے جائیں جیسا کہ کاروبار کے کاموں میں آپ کو یہ اصول نظر آتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کاموں کے اوقات بھی اُن کی خاطر مقرر کر لیتا ہے اور اس طرح اُس کی زندگی باقاعدہ ہو جاتی ہے، اور اُس کا وقت فضول برباد نہیں ہوتا، نماز کے اوقات چونکہ مقرر ہیں، اس لئے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں خصوصاً نماز باجماعت کے، اُن کے اوقات خود بخود منظم ہو جاتے ہیں، ان کے دن رات کے کام باقاعدہ انجام پاتے ہیں، اور نماز کے اوقات اُن کے کاموں کا معیار ہو جاتے ہیں، وقت پر سونا اور وقت پر اٹھنا اُن کے لئے ضروری ہو جاتا ہے، مشہور صحابی حضرت سلمان فارسیؓ کا مقولہ ہے،

الصلوٰۃ مکیال فمن اوفیٰ اوفی	نماز ایک پیمانہ ہے جس نے اس سے
بہ ومن طفف فقد علمتم	پورا ناپا، اس کو پورا ناپ کر دیا جائیگا
ما للمطففین،[1]	اور جس نے ناپنے میں کمی کی تو تمہیں کم
	ناپنے والوں کی سزا معلوم ہے،

اس قول کے جہاں اور مطلب ہو سکتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نماز ہر مسلمان کے کام کا پیمانہ ہے، اسی سے اس کی ہر چیز ناپی جا سکتی ہے،

صبح خیزی

۵۔ طب اور حفظانِ صحت کے اصول سے رات کو سویرے سونا اور صبح کو طلوعِ آفتاب

[1] کنز العمال مندوبات الصلوٰۃ، جلد چہارم ص ۲۳۰ بحوالہ مصنف عبد الرزاق،

سے پہلے بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے وہ مخفی نہین، جو لوگ نماز کے پابند ہین وہ اس اصول
کی خلاف ورزی کبھی نہین کرسکتے، جب تک رات کو وقت پر سو یا نہ جائیگا صبح کو وقت پر
آنکھ نہین کھل سکتی، اسی لئے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے رات کو نمازِ عشا کے بعد بے کار باتین کرنے
سے اور قصہ کہانی کہنے سے منع فرمایا[1] ہے، تاکہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے، اور
صبح خیزی مسلمانون کی عادت ہو جائے، اور صبح کو مؤذن کی پرتاثیر آواز:-

الصلوٰۃ خیر من النوم، سونے سے نماز بہت بہتر ہے،

ان کو بے تابانہ اپنے خواب کے بستر سے اٹھا دے،

خدا کا خوف

۶- ایک مسلمان جو نماز پڑھتا ہے، جب کبھی غلطی سے یا بشری کمزوری سے اس کا قدم
ڈگمگاتا ہے تو رحمتِ الٰہی اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے، اس کو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے، اسکو
اپنے خدا کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے، اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے، وہ لوگون
سے اس بنا پر شرماتا ہے کہ وہ کہین گے کہ یہ نمازی ہو کر اس قسم کے افعال کا مرتکب ہوتا ہے،
اس کے پاؤن بدی کے راستہ پر پڑتے وقت کانپتے ہین، غرض نماز انسان کے اخلاقی حاسہ کو
بیدار کرتی ہے، اور برائیون سے بچاتی ہے، اور خود خدا نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے،

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (عنکبوت - ۵) بے شک نماز بے حیائی اور بری باتون سے روکتی ہے،

ہشیاری

۷- نماز عقل و ہوش بیداری اور آیاتِ الٰہی مین تدبّر اور غور، خدا کی تسبیح و تہلیل اور اپنے لئے دعا

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب ما یکرہ من السمر بعد العشاء،

مغفرت کا نام ہے، اس لئے وہ تمام چیزیں جو انسان کی عقل و ہوش اور فہم و احساس کو کھو دیں نماز کی حقیقت کی منافی ہیں، اسی لئے اس وقت بھی جب شراب کی ممانعت نہیں ہوئی تھی، سکر یعنی نشہ کی حالت میں نماز پڑھنا جائز نہ تھا،

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى	نشہ کی حالت میں تم نماز کے قریب نہ جاؤ،
تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ، (نساء - ۷)	یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو، جو کچھ تم کہتے ہو،

اس بنا پر ایک نماز کا پابند تمام ایسی چیزوں سے جو اس کی عقل و ہوش کو گم کر دیں قطعاً پرہیز کرے گا،

مسلمان کا امتیازی نشان،

۸۔ مذہبی بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی اسلام کو سب سے زیادہ مخلصین اور منافقین کے امتیاز کی ضرورت تھی، قانون ان دونوں گروہوں میں کوئی امتیاز نہیں کرسکتا تھا، احکام میں حج ایک ایسی چیز ہے جس کے اہل عرب مدت سے خوگر تھے، اس کے ساتھ وہ ان کے مذاق کی چیز بھی، خلائق کا اجتماع ایک میلے کی صورت اختیار کرلیتا تھا، جو عرب کے تمدن کا ایک لازمی جزء تھا، فخر و امتیاز کے موقعے بھی اس میں حاصل ہو سکتے تھے، گو اسلام نے اس کی اصلاح کر دی، زکوٰۃ بھی کوئی حدِ فاصل نہیں ہوسکتی تھی، کیونکہ اکثر منافقین متمول تھے اور یہ جاہ و فخر کا بھی ذریعہ ہوسکتی تھی، اسکے ساتھ یہ عرب کی فیاض طبیعت بھی گراں نہیں ہوسکتی تھی فقراء کیساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی فطری ہے، صرف معمولی تحریک کی ضرورت تھی، روزہ بھی اسکا معیار نہیں قرار دیا جاسکتا کیونکہ روزہ میں چھپے چوری کھا پی لینے کا موقع بآسانی حاصل ہوسکتا ہے، صرف نماز ایک ایسی چیز ہے جو ان دونوں گروہوں میں حدِ فاصل ہوسکتی ہے، چنانچہ قرآن پاک نے اسی فریضہ میں سستی کو منافقین کی خاص پہچان قرار دیا،

وَاِذَا قَامُوْآ اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى لا (نساء-۲۱)

اور جب یہ نماز پڑھنے کو اٹھتے ہیں تو کسلمندی کے ساتھ اٹھتے ہیں،

نیز فرمایا،

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (بقرہ-۵)

اور خضوع وخشوع والون کے علاوہ نماز سب پر گران ہے،

خصوصاً عشا اور فجر کی نماز کی نسبت کہ یہ راحت کے اوقات ہین، آنحضرت صلعم نے فرمایا،

لیس صلاۃ اثقل علی المنافقین من الفجر والعشاء[1]،

منافقین پر فجر وعشا سے زیادہ کوئی نماز گران نہین ہے،

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہین کہ جب ہم (صحابہ) کسی کو عشا اور صبح کی نمازون مین غیر حاضر پاتے تھے، تو ہم اس سے بدگمان ہوجاتے تھے[2]"

مدینہ آکر نماز مین قبلہ کی تبدیلی جہان اور مصلحتون سے تھی، وہان ایک مصلحت یہ بھی تھی، کہ اس سے مخلصین اور منافقین کی تمیز ہوسکے، مکہ معظمہ کے لوگ جو کعبہ کی عظمت کے قائل تھے بیت المقدس کی طرف منہ کرنا جائز نہین سمجھتے تھے، مدینہ مین یہود آباد تھے جن مین کچھ مسلمان ہوگئے تھے، وہ بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے، اور کعبہ کی عظمت تسلیم نہین کرتے تھے، اس لئے عرب منافقین کی پہچان بیت المقدس کے قبلہ بنانے سے اور یہود منافقین کی پہچان کعبہ کے قبلہ بنانے سے ہوسکتی تھی، چنانچہ قرآن پاک مین ہے،

---

[1] بخاری کتاب الصلاۃ باب فضل صلاۃ العشاء فی الجماعۃ، [2] مستدرک حاکم (علی شرط الشیخین) جلد اول ص ۲۱۱،

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ	اور جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے قبلہ نہیں
عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ	بنایا لیکن اس لئے تاکہ ہم ان کو جو رسول
مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ وَ	کی پیروی کرتے ہیں اُن سے الگ کر دیں
إِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ	جو الٹے پاؤں پھر جائیں گے، اور یہ قبلہ
هَدَى اللّٰهُ ط (بقرہ-۱۷)	گراں ہوا لیکن ان پر جن کو خدا نے راہ دکھائی

یہ پہچان اور شناخت اب قیامت تک قائم رہیگی اسی لئے آپ نے فرمایا کہ جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا اور ہمارے قبلہ کی طرف منھ کر کے نماز پڑھی، وہ مسلمان ہے[1]،

جنگ کی تعلیم

۹- باطل کی شکست اور حق کی خاطر لڑنا انسان کا فرض ہے، اس فرض کے انجام دینے کے لئے انسان کو ہر وقت تیار رہنا چاہئے، اس تیاری کا نقشہ ہماری روزانہ کی نمازیں ہیں چنانچہ ابوداؤد میں ہے،

كان النبي صلى الله عليه وسلم	آنحضرت صلعم اور آپ کا لشکر جب پہاڑی
وجيوشه اذا علوا الثنايا	پر چڑھتا تھا تو تکبیر اور جب نیچے اترتا تھا
كبروا و اذا هبطوا سبحوا فوضعت	تو تسبیح کہتا تھا، نماز اسی طریقہ پر قائم
الصلوٰة على ذالك ، (ابوداؤد)	کی گئی،

صف بندی، ایک افسر (امام) کی اطاعت، تمام سپاہیوں (نمازیوں) کی باہم محبت اور دستگیری، اور ایک تکبیر کی آواز پر پورے صفوف کی حرکت اور نشست و برخاست مسلمانوں کو

[1] بخاری باب فضل استقبال القبلہ،

صفِ جنگ کے اوصاف سکھاتی ہے، اوران کے قوائے عمل کو بیدار کرتی ہے، جاڑوں مین پانچ وقت وضو کرنا، ظہر کے وقت دھوپ کی شدت مین گھر سے نکل کر مسجد کو جانا، عصر کے وقت لہو ولعب کی دلچسپیون سے وقت نکال کر خدا کو یاد کرنا، رات کو سونے سے پہلے دعا وزاری کرلینا صبح کو خوابِ سحر کی لذت کو چھوڑ کر حمد باری مین مصروف ہونا اس کے بغیر ممکن نہین کہ ہم فرضی راحت وتکلیف سے بے پروا ہو کر عمل کی طاقت اپنے مین پیدا کرین، اور کام کی ضرورت کے وقت احساسِ فرض کے تقاضے کو بجالانا ضروری سمجھین اور اس کے لئے عارضی تکلیفون کی برداشت کا اپنے کو خوگر بنائین، ہفتہ مین ایک دن نمازِ جمعہ کے لئے شہر کے سب مسلمانون کا ایک جگہ جمع ہونا، دن رات کے پُر آرام سے پُر آرام وقت مین ممکن تھا، مگر اس کیلئے بھی دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا تاکہ اس اجتماع اور مظاہرہ مین بھی مسلمان سپاہیانہ خصائص کے خوگر رہین، اور نمازِ جمعہ کا ہر پابند شہادت دے گا کہ اس کی اتنی سی یہ عادت مشکلاتِ وقت کے اتفاقات مین اس کے لئے کس قدر ممدِ ثابت ہوتی ہے،

دائمی تنبہ اور بیداری

۱۰- تمام عبادات، بلکہ تمام مذاہب کا اصل مقصد تکمیلِ اخلاق ہے، لیکن اصلاحِ اخلاق کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ نفس ہر وقت بیدار، اور اثر قبول کرنے کے لیے آمادہ رہے، تمام عبادات مین صرف نماز ہی ایک ایسی چیز ہے جو نفس کو بیدار رکھ سکتی ہے، روزہ، حج، زکوٰۃ اوّلاً تو ہر شخص پر فرض نہین ہین، اس کے ساتھ روزہ سال مین ایک بار فرض ہوتا ہے، زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے، حج عمر مین ایک بار ادا کرنا پڑتا ہے، اس لئے یہ فرائض نفس کے تنبہ اور بیداری کا دائمی اور ہر روزہ ذریعہ نہین ہو سکتے، برخلاف ان کے نماز دن مین پانچ بار ادا کرنی ہوتی ہے، ہر وقت

وضو کرنا پڑتا ہے، سجدہ، رکوع، قیام وقعود، جہر، خفا، تسبیح وتہلیل تکبیر وتشہد نے اس کے ارکان
واعمال مین تنوع وامتیاز پیدا کردیا ہے، جن مین ہر چیز نفس مین تدریجی اثر پذیری کی قابلیت
پیدا کرتی ہے، اور ہر چوبیس گھنٹہ مین چند گھنٹون کے وقفہ سے نفسِ انسانی کو ہشیار اور قلبِ خفتہ
کو بیدار کرتی ہے، اس طرح نفس کو رات دن تنبیہ ہوا کرتا ہے،

الفت و محبت

۱۱- نماز مسلمانون مین باہمی الفت ومحبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، محلہ کے تمام مسلمان جب
کسی ایک جگہ دن مین پانچ دفعہ جمع ہون، اور باہم ایک دوسرے سے ملین تو اُن کی بیگانگی
دور ہوگی، ان مین آپس مین محبت اور الفت پیدا ہوگی، اس طرح وہ ایک دوسرے کی امداد
کے لئے ہر وقت تیار رہین گے، قرآنِ پاک نے نماز کے اس وصف اور اثر کی طرف خود
اشارہ کیا ہے،

وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا	اور خدا سے ڈرتے رہو اور نماز کھڑی رکھو
تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ لا مِنَ	اور مشرکون مین سے نہ بنو، ان مین
الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا	سے جنھون نے اپنے دین مین پھوٹ
شِيَعًا (روم-۴)	ڈالی، اور بہت سے جتھے ہوگئے،

اس سے معلوم ہوا، کہ نماز کا اجتماع مسلمانون کو جتھابندی اور فرقہ آرائی سے بھی روک سکتا
ہے، کہ جب ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی رہے گی، تو غلط فہمیون کا موقع کم ملیگا،

غمخواری

۱۲- بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نماز مسلمانون مین باہمی ہمدردی اور غمخواری کا ذریعہ بھی بنتی
ہے، جب امیر وغریب سب ایک جگہ جمع ہون گے، اور امراء اپنی آنکھ سے غریبون کو دیکھینگے

تو اُن کی فیاضی کو تحریک ہوگی، ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر ہوگی، اور اس کی تلافی کی صورت پیدا ہوگی،

ابتدائے اسلام مین اصحابِ صفہ کا ایک گروہ تھا، جو سب سے زیادہ مستحقِ اعانت تھا، یہ گروہ مسجد مین رہتا تھا، صحابہ نماز کو جاتے تو ان کو دیکھ کر خودبخود ہمدردی پیدا ہوتی تھی، چنانچہ اکثر صحابہ کھجور کے خوشے لیجا کر مسجد مین لٹکا دیتے تھے، جس پر یہ گروہ گذراوقات کرتا تھا، اکثر صحابہؓ اور خود آنحضرت صلعم نماز سے فارغ ہو کر ان لوگون کو ساتھ لاتے اور اپنے گھرون مین کھانا کھلاتے تھے، اب بھی مساجد خیرات و صدقات کا ذریعہ ہین، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید مین نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے،

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا	اور نماز قائم کرتے ہین، اور جو کچھ ہم نے
رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ، (بقرہ-۱)	دیا ہے اس مین سے صرف کرتے ہین،

اجتماعیت

۱۳- اجتماعیت چونکہ ایک فطری چیز ہے، اس لئے تمام قومون نے اس کے لیے مختلف اوقات اور تہوار مقرر کئے ہین، جن قومون کو مذہبی قیود سے آزاد کہا جاتا ہے، ان مین بھی اس اجتماعیت کی نمایش کلبون، کانفرنسون، انیورسریون، اور دوسرے جلسون، جلوسون، اور مظاہرون سے کیجاتی ہے، لیکن یہ اجتماعیت جہان فائدے پہنچاتی ہے، وہان اپنے مضر اثرات بھی ضرور پیش کرتی ہے، اجتماعیت کام چاہتی ہے، اگر مفید کام پیشِ نظر نہ ہوا تو وہی رنگ رلیون رقص و سرود، شراب خواری، قمار بازی، چوری، بدنظری، بدکاری، رشک و حسد بلکہ قتل و غارت تک پہنچ جاتی ہے، میلے ٹھیلے، عرس، ہولی، تہوار جن کی مثالین عرب مشرکون مین بھی ملتی تھین،

اور اب بھی ملتی ہین، قبور پر ناجائز اجتماع، غرض تمام اجتماعی بدعات بدترین گناہون اور فسادون کا مرکز بنجاتے ہین، اب اگر ان خطرناک رسوم کا صرف انسداد ہی کیا جاتا اور ان کی جگہ اسلام ان کے سامنے کوئی چیز پیش نہ کرتا، تو محض یہ سلبی علاج کافی نہ ہوتا، ضرورت تھی کہ وہ اپنے قومی اجتماع کے لئے کوئی مشغلہ مقرر کرے، جس سے قلبِ انسانی اپنی فطری پیاس کو بجھا سکے، اور اجتماعیت پیدا ہو کر بدی کے بجائے نیکی کے رُخ کی طرف بہے، چنانچہ اسلام نے اسی لئے روزانہ جماعت کی عام نمازین، ہفتہ مین جمعہ کی نماز اور سال مین ۲ دو دفعہ عیدین کی نمازین مقرر کین، کہ اجتماعیت کا فطری تقاضا بھی پورا ہو، اور مشرکانہ بدیون اور اخلاقی برائیون سے بھی احتراز ہو کہ اس اجتماع کی بنیاد ہی دعوتِ خیر پر رکھی گئی ہے، حج کے عالمگیر مذہبی اجتماع مین دوسرے اجتماعی اور اقتصادی مقاصد کے برقرار رکھنے کے ساتھ اس کے مشاغل بھی خدا کے ذکر اور اسکی بارگاہ مین توبہ وانابت کو قرار دیا، اس طرح اسلام کا ہر اجتماع پاکیزگیِ خیال اور اخلاصِ عمل کی بنیاد پر قائم ہے،

کاموں کا تنوع

۱۴- انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ وہ ہمرنگی کے باوجود تفنن اور تجدد کا طالب ہے، لیکن اگر انسان کے دل و دماغ، اعضاء و جوارح ہر وقت اسی ایک کام مین مصروف رہین تو سکون و اطمینان عیش و راحت، اور دلچسپی کی لذت، جو ہر عمل کا آخری نتیجہ ہے مفقود ہو جائے، مفید سے مفید کام سے بھی دنیا چیخ اٹھے، اسی لئے قدرت نے اوقات کی تقسیم ایسے مناسب طریقے پر کی ہے جس مین انسان کو حرکت و سکون دونون کا یکسان موقع ملتا رہتا ہے، رات اور دن کا اختلاف اسی بنا پر آیاتِ الٰہی مین شمار کیا گیا ہے کہ اس تغیر و تبدل سے نظامِ عالم مین نیرنگی پیدا ہوتی ہے، اور اس تقسیم سے انسانون مین اپنے ہر کام کی لذت قائم

رہتی ہے، نماز ایک ایسا فریضہ ہے جو نہ تو ہر لمحہ اور ہر لحظہ انسان پر فرض ہے، اور نہ سال مین ایک دفعہ یا عمر بھر مین صرف ایک دفعہ فرض ہے، بلکہ ہر روز پانچ دفعہ اس کو ادا کرنا پڑتا ہے، صبح سے کام شروع کیا تو ظہر پر آکر توڑ دیا، پھر مشغولیت ہوئی، اور عصر پر پہنچکر ختم ہوئی، پھر جو سلسلہ چھڑا اس کا مغرب پر خاتمہ ہوا، بعد ازین خانگی مصروفیت شروع ہوئی اور عشا پر جاکر منتہی ہوئی اب نیند آگئی، اور صبح تک بے خبری رہی، اٹھے تو دعاؤن کے افتتاح سے پھر اپنا کاروبار شروع کیا" وہ دولتمند جو جسمانی یا دماغی محنت و مشقت اور مزدوری سے اپنی روزی نہین حاصل کرتے، وہ اس روحانی "انٹرول" (وقفہ) کے لطف سے آگاہ نہین، یہ معلوم ہوتا ہے، کہ انسان چند گھنٹون تک ایک ہی قسم کی محنت کے بوجھ سے جو دبا جاتا تھا، وہ چند منٹ مین ہاتھ منہ دھوکر دعاء تسبیح اور نشست و برخاست کے ذریعہ اس سے ہلکا ہوگیا اور پھر سے اس نے اپنے کام کیلئے نئی قوت پیدا کرلی،

تربیت

۱۵۔ انسان کی عملی کامیابی، استقلال اور مواظبت پر موقوف ہے، کہ جس کام کو انسنے شروع کیا، پھر اس پر عمر بھر قائم رہے، اسی کا نام عادات و اخلاق کی استواری، اور کیرکٹر کی مضبوطی ہے، جس کام مین اس خلق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی کی تربیت ہو وہ ضرور ہے کہ روزانہ ہو، بلکہ دن مین کئی دفعہ ہو، نماز ایک ایسا فریضہ ہے جس کے بار سے عہدہ برآ ہونے کیلئے انسان مین استقلال، مواظبت اور مداومت شرط ہے، اس لئے انسان مین اس اخلاقی خوبی کے پیدا کرنے کا ذریعہ نماز سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہین ہوسکتی، اس لیے قرآن پاک نے صحابہ کی مدح مین کہا،

اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ	وہ جو اپنی نماز مداومت کے ساتھ
دَآئِمُوْنَ ۝ (معارج-۱)	ادا کرتے ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

احب العمل الی اللہ ادومه وان قل	محبوب ترین عمل خدا کے نزدیک وہ ہے جو
(ابو داؤد باب ما یؤمر به من القصد فی الصلوٰۃ)	ہمیشہ کیا جائے گو وہ کم ہو،

نظم جماعت

۱۶- کسی قوم کی زندگی، اس کی نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے، اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا، اور بتایا کہ مسلمانوں کا یہ صف بہ صف کھڑا ہونا، ایک دوسرے سے شانہ سے شانہ ملانا، اور یکساں حرکت و جنبش کرنا ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے جس طرح نماز کی درستی اس صف اور نظام جماعت کی درستی پر موقوف ہے، اسی طرح پوری قوم کی زندگی اسی باہمی تعاون، تضامن، مشارکت میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفوف کی درستی پر بہت زور دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ جب تک تم خوب مل کر کھڑے نہ ہو گے تمہارے دل بھی آپس میں نہ ملیں گے۔[۱]

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف عند الاقامۃ وبعدہا و ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف،

مساوات

۱۷- یہی جماعت کی نماز مسلمانون مین برادرانہ مساوات اور انسانی برابری کی درسگاہ ہے، یہان امیر و غریب، کالے گورے، رومی حبشی، عرب وعجم کی کوئی تمیز نہین ہے سب ایک ساتھ ایک درجہ اور ایک صف مین کھڑے ہو کر خدا کے آگے سرنگون ہوتے ہین جماعت کی امامت کے لئے حسب ونسب، نسل و خاندان، رنگ روپ، قومیت اور جنسیت عہدہ او منصب کی ضرورت نہین ہوتی، بلکہ علم و دانش، فضل و کمال، اور تقویٰ و طہارت کی ضرورت ہوتی ہے، یہان شاہ و گدا، اور شریف و رذیل کی تفریق نہین سب ہی ایک زمین پر ایک امام کے پیچھے، ایک صف مین دوش بدوش کھڑے ہوتے ہین، اور کوئی کسی کو اپنی جگہ سے نہین ہٹا سکتا، اور اس برادرانہ مساوات اور انسانی برادری کی مشق دن مین پانچ دفعہ ہوتی ہے، کیا مسلمانون کی معاشرتی جمہوریت کی یہ درسگاہ کہین اور بھی قائم ہے ؟

مرکزی اطاعت

۱۸- جماعت کی سلامتی بغیر ایک مفترض الطاعۃ امام کے ناممکن ہے جس کے اشارہ پر تمام قوم حرکت کرے، نماز باجماعت مسلمانون کی اس زندگی کا رمز ہے، کہ جس طرح اُن کی اس عبادت کا ایک امام ہے، جس کے اشارہ پر وہ حرکت کرتے ہین، اسی طرح قوم کی پوری زندگی کا بھی ایک امام ہونا چاہیے، جس کے اللہ اکبر کی آواز قوم کے کاروان کیلئے بانگِ درا اور صدائے جرس ثابت ہو،

اطاعتِ امام کے لئے ایک طرف تو قوم مین فرمانبرداری کی قابلیت موجود ہونی چاہیے جس کی تعلیم مقتدیون کو نماز مین ہوتی ہے، دوسری طرف امام کو اخلاقِ صالحہ کی ایک ایسی مثال پیش کرنی چاہیے جو ہمیشہ لوگون کے پیشِ نظر رہے، نماز ان دونون چیزون

کا مجموعہ ہے، وہ ایک دائمی حرکت ہے، جو قوم کے اعضاء و جوارح کو ہر وقت اطاعت گذاری کیلئے تیار رکھتی ہے اس کے ساتھ نماز پنجگانہ اور جمعہ و عیدین کی امامت خاص امام کا حق ہے، اس لئے ہر وقت قوم کو اس کے اعمال کے احتساب، اس پر نکتہ چینی، اس سے اثر پذیری کا موقع ملتا ہے، نماز کے اوقات خاص طور پر ایسے موزون ہیں جو ایک عیاش اور راحت طلب شخص کا پردہ فاش کر دیتے ہیں، ایک ایسا شخص جو شب بھر عیش و عشرت میں مصروف ہو، نمازِ صبح میں شریک نہیں ہو سکتا، ایک راحت طلب آدمی ظہر کے وقت دھوپ کی شدت برداشت کر کے شریکِ جماعت ہونا پسند نہیں کر سکتا، چنانچہ خلافتِ راشدہ کے بعد جب بنوامیہ کا زمانہ آیا تو صحابہؓ کو خاص طور پر اس کا احساس ہوا، اور بے خوف نگاہوں نے ان پر نکتہ چینیاں کیں، احادیث میں بھی اس زمانہ کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا ہے، جس میں ائمہ وقت پر نماز ادا کرنے میں غفلت کریں گے،

معیارِ فضیلت

۱۹- نماز کی امامت کے لئے چونکہ سوائے علم و فضل اور تقویٰ کے کوئی اور قید نہیں ہے، اس لئے امامت کے رتبہ اور درجہ کو حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے ہر وقت ممکن ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جماعت میں جو سب سے زیادہ صاحبِ علم (اقرء) ہے وہ امام بننے کا سب سے زیادہ مستحق ہے، ایک دفعہ ایک مقام سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لئے آئے، آپ نے ان سے فرمایا کہ تم میں سے جسکو قرآن زیادہ یاد ہو وہ امام بنے، اتفاق یہ کہ ان میں سے جو صاحب سب سے زیادہ کمسن تھے، انہی کو قرآن زیادہ یاد تھا، چنانچہ لوگوں نے انہی کمسن صحابی کو اپنا امام مقرر فرمایا[۱]، اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں میں اس کے ذریعہ سے علمی و عملی فضائل کے

[۱] سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ،

حاصل کرنے کی تشویق و ترغیب بھی پیدا ہوتی ہے،

روزانہ کی مجلس عمومی

۲۰- آنحضرت صلعم اور خلفاے راشدین کے زمانہ مین یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا، یا کوئی سیاسی و قومی مشکل پیدا ہوتی، یا کوئی مذہبی بات سنانی ہوتی، تو مسلمانون مین منادی کرائی جاتی تھی کہ الصّلوٰۃ جامعۃٌ (نماز جمع کرنے والی ہے) سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے اور اس امر اہم سے اطلاع پاتے، یا اس کے متعلق اپنے مشورے عرض کرتے، یہ گویا مسلمانون کے مذہبی، اجتماعی، سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا بھی ذریعہ تھا جس کے لئے نماز کے تعلق سے ہر مسلمان کا کسل و سستی کے بہانہ بغیر جمع ہونا ضروری تھا،

ان تمام امور کو سامنے رکھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعار، اور اسکے مذہبی و اجتماعی و تمدنی و سیاسی و اخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے، اسی کی شیرازہ بندی سے مسلمانون کا شیرازہ بندھا تھا، اور اسی کی گرہ کھل جانے سے ان کی نظم و جماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے، مسجد مسلمانون کے ہر قومی اجتماع کا مرکز، اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی جس طرح آج ہر جلسہ کا افتتاح اس کے نصب العین کے اظہار و تعیین کے لئے صدارتی خطبات سے ہوتا ہے، اسی طرح مسلمان جب زندہ تھے اُن کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا، ان کی ہر چیز اس کے تابع اور اسی کے زیر نظر ہوتی تھی، ان کی نماز کا گھر ہی ان کا دارالامارۃ تھا، وہی دارالشوریٰ تھا، وہی بیت المال تھا، وہی صیغۂ جنگ کا دفتر تھا، وہی درسگاہ اور وہی معبد تھا،

جماعت کی ہر ترقی کی بنیاد، افراد کے باہمی نظم و ارتباط پر ہے، اور جماعت کے فائدہ کے لئے افراد کا اپنے ہر آرام و عیش اور فائدہ کو قربان کر دینا، اور اختلافِ باہمی کو تہ کر کے صرف ایک مرکز پر

جمع ہو کر جماعتی ہستی کی وحدت مین فنا ہوجانا اس کے حصول کی لازمی شرط ہے، اسی کی خاطر کسی ایک کو امام و قائد و سر لشکر مان کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کرلینا ضروری ہے، اسلام کی نماز انہی رموز و اسرار کا گنجینہ ہے، یہ مسلمانون کو نظم وجماعت، اطاعت پذیری و فرمانبری، اور وحدت قوت کا سبق دن مین پانچ بار سکھاتی ہے، اسی لئے اس کے بغیر مسلمان مسلمان نہین، اور نہ اس کی کوئی اجتماعی وحدت ہے، نہ انقیادِ امامت ہے، نہ زندگی ہے، اور نہ زندگی کا نصب العین ہے، اسی بنا پر داعیِ اسلام علیہ السلام نے یہ فرما دیا،

العھد الذی بیننا و بینھم	ہمارے اور اُن کے درمیان جو معاہدہ
الصلوٰۃ فمن ترکھا فقد کفر،	ہے، وہ نماز ہے، توجس نے اسکو چھوڑا
(احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)	اُس نے کفر کا کام کیا،

کہ نماز کو چھوڑ کر مسلمان صرف قالبِ بے جان، شرابِ بے نشہ اور گلِ بے رنگ و بو ہو کر رہجاتا ہے اور رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کا ایک ایک شعار اور ایک ایک امتیازی خصوصیت اس سے رخصت ہوجاتی ہے، اسی لئے نماز اسلام کا اولین شعار ہے، اور اسی کی زندگی سے اسلام کی زندگی ہے،

عرب کی روحانی کایا پلٹ

وہ عرب جو خدا کی عبادت سے بےگانہ تھا، وہ جس کی پیشانی خدا کے سامنے کبھی جھکی نہ تھی، وہ جس کا دل خدا کی پرستش سے لذت آشنا نہ تھا، وہ جس کی زبان خدا کی تسبیح و تحمید کے ذائقہ سے واقف نہ تھی، وہ جس کی آنکھون نے شبِ بیداری کا اضطراب انگیز منظر نہین دیکھا تھا، وہ جس کی روح ربانی تسکین و تسلی کے احساس سے خالی تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے دفعۃً کیا ہو گیا؟ اب عبادتِ الٰہی اوس کے ہر کام کا مقصد تھی، اب اس کو

اپنے ہر کام میں اخلاص کے سوا اور کوئی چیز مطلوب نہ تھی، اسکی پیشانی خدا کے سامنے جھک کر پھر اٹھنا نہیں چاہتی تھی، اس کے دل کو اس لذت کے سوا دنیا کی کوئی لذت پسند نہیں آتی تھی، اسکی زبان کو اس مزہ کے سوا اور کوئی مزہ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا، اس کی آنکھیں اس منظر کے سوا اور کسی منظر کی طالب نہ تھیں، اسکی روح یادِ الٰہی کی تڑپ اور ذکرِ الٰہی کی بے قراری کے سوا کسی اور چیز سے تسلّی نہ پاتی تھی،

دل را کہ مردہ بود حیاتے ز نو رسید | تا بوئے از نسیم مئیش در مشام رفت

• وہ عرب جن کی حالت یہ تھی، کہ

وَلَا يَذْكُرُونَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (نساء ۲۱) | اور جو خدا کو بہت کم یاد کرتے ہیں،

دعوتِ حق اور فیضِ نبوت کے اثر و برکت نے ان کی یہ شان نمایاں کی، کہ دنیا کی کاروباری مشغولیتیں بھی اُن کو ذکرِ الٰہی سے غافل نہ کر سکیں،

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ، (نور ۔ ۵) | ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید و فروخت کا شغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتا،

اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، غرض ہر حال میں ان کے اندر خدا کی یاد کے لئے بیقراری تھی،

يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ، (آل عمران ۔ ۲۰) | جو خدا کو اُٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے یاد کرتے ہیں،

راتوں کو جب غافل دنیا نیند کے خمار میں ہوتی، وہ بستروں سے اٹھ کر خدا کے سامنے سرِ سجود اور راز و نیاز میں مصروف ہوتے تھے،

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ	جن کے پہلو (رات کو) خوابگاہوں سے
يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا،	علحدہ رہتے ہیں، وہ خوف اور امید کے
(سجدہ ۲-۲)	ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں،

وہ جن کا یہ حال تھا کہ

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے
(مرسلات-۲)	آگے جھکو تو نہیں جھکتے،

اب ان کی یہ صورت ہوگئی کہ

تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا	تم ان کو دیکھو گے کہ رکوع میں جھکے ہوئے
مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ز	اور سجدہ میں پڑے ہوئے، خدا کے فضل
(فتح-۴)	اور خوشنودی کو تلاش کرتے ہیں،

وہ جن کے دلوں کی یہ کیفیت تھی کہ

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ	اور جب تنہا خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے
قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ	دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے،
بِالْاٰخِرَةِ ج (زمر-۵)	مکدر ہو جاتے ہیں،

آفتابِ نبوت کے پرتو نے ان مکدر آئینوں میں خشیتِ الٰہی کا جوہر پیدا کر دیا،

اَلَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ	وہ لوگ کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو
قُلُوْبُهُمْ، (انفال ۱-وج-۵)	اُن کے دل دہل جاتے ہیں،

یہ خود قرآنِ پاک کی شہادتین ہین جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ کے عمل اور تعلیم نے عرب کی روحانی کائنات مین کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا، وہ تمام لوگ جو حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے تھے، خواہ وہ کھیتی کرتے ہون، یا تجارت، یا محنت مزدوری، مگر ان مین سے کوئی چیز ان کو خدا کی یاد سے غافل نہین کرتی تھی، قتادہ کہتے ہین کہ یہ لوگ (صحابہ) خرید و فروخت اور تجارت کرتے تھے، لیکن جب خدا کا کوئی معاملہ پیش آتا تھا، تو یہ شغل و عمل ان کو یادِ الٰہی سے غافل نہین کرتا تھا، بلکہ وہ اس کو پوری طرح ادا کرتے تھے[1] حضرت ابن عمرؓ کہتے ہین کہ ایک دفعہ وہ بازار مین تھے، نماز کی تکبیر ہوئی، دیکھا کہ صحابہؓ نے فوراً دکانین بند کر دین اور مسجد مین داخل ہو گئے[2]،

صحابہؓ تمامتر راتین خدا کی یاد مین جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے، یہانتک کہ مکہ معظمہ کی غیر مطمئن راتون مین بھی وہ عبادتِ الٰہی مین مصروف رہتے تھے، خدا نے گواہی دی،

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ	بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو دو تہائی
اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ	رات کے قریب، اور آدھی رات اور
وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ	ایک تہائی رات تک کھڑا رہتا ہے اور
مَعَكَ ط	تیرے ساتھ کی ایک جماعت بھی اٹھ کر
(مزمل ۲۰)	نماز پڑھتی ہے،

اس زمانہ مین صحابہ کو راتون کے سوا خدا کے یاد کرنے کا موقع کہان ملتا تھا، جلوۂ دیدار کے

---

[1] صحیح بخاری باب التجارۃ فی البر مرسلاً، [2] فتح الباری جلد ۴ ص ۲۵۳ بحوالۂ عبد الرزاق،

مشتاق دن بھر کے انتظار کے بعد رات کو کہیں کسی مخفی گوشہ میں جمع ہوتے تھے، ذوق وشوق سے اپنی پیشانی خدا کے سامنے زمین پر رکھ دیتے تھے، دیر تک سجدہ میں پڑے رہتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے اس والہانہ انداز عبادت کو دیکھتے پھرتے تھے، قرآن پاک نے اس نظارہ کی کیفیت اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کی ہے،

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ	اور اس غالب رحم والے پر بھروسہ کر
الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ	جو رات کو جب تو نماز کے لئے اٹھتا ہے
وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ،	اور سجدہ میں پڑے رہنے والوں کے
(شعراء - ۱۱)	درمیان آنا جانا تیرا دیکھتا ہے،

مدینہ منورہ میں آکر سب سے پہلا فقرہ جو آپ کی زبان مبارک سے نکلا وہ یہ تھا،

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اَطْعِمُوا الطَّعَامَ	اے لوگو! غریبوں کو کھانا کھلاؤ، اور
وَاَفْشُوا السَّلَامَ وَصَلُّوْا وَالنَّاسُ	سلام کو پھیلاؤ، اور نماز پڑھو جب کہ لوگ
نِيَامٌ، (ترمذی)	سوتے ہوں،

بعض صحابہ نے اس حکم پر اس شدت سے عمل کیا کہ انھوں نے راتوں کا سونا چھوڑ دیا، آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کو اعتدال اور میانہ روی کا حکم دینا پڑا، چنانچہ حضرت عثمان بن مظعونؓ رات بھر نماز میں مصروف رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ "عثمان! تمھارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔" حضرت ابن عباسؓ

---

[1] ابوداؤد باب القصد فی الصلوٰۃ،

کہتے ہین کہ صحابہ راتون کو اُٹھ اُٹھ کر نماز پڑھتے تھے، اور بہت کم سوتے تھے[1]، حضرت ابوہریرہؓ نے رات کے تین حصّے کر دیئے تھے، ایک مین خود نماز پڑھتے تھے، دوسرے مین اُن کی بیوی اور تیسرے مین ان کا غلام، اور باری باری سے ایک دوسرے کو جگاتا تھا[2]، حضرت عبداللہ بن عمرؓ ساری رات نماز پڑھا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا، تو ان کو جاکر نصیحت فرمائی[3]، حضرت ابو دردأؓ صحابی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ رات رات بھر نماز مین گذار دیتے تھے، حضرت سلمانؓ فارسی اُن کے اسلامی بھائی تھے، ایک شب وہ اُن کے ہان جاکر مہمان ہوئے، جب رات کو حضرت ابو دردأؓ عبادت کے لئے اٹھنے لگے تو حضرت سلمانؓ نے منع کیا، پچھلے پہر جب سنّاٹا چھایا ہوا تھا، حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا، کہ اب نماز کا وقت ہے[4]، کوئی صحابی ایسا نہ تھا جس نے اسلام لانے کے بعد پھر ایک وقت کی بھی نماز عمداً قضا کی ہو، یہانتک کہ لڑائی اور خطرہ کی حالت مین بھی وہ اس فرض سے غافل نہین رہتے تھے، ایک صحابی کو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے ایک پرخطر کام کے لئے کہین بھیجا تھا جب وہ منزلِ مقصود کے قریب پہنچے تو عصر کا وقت ہوچکا تھا، ان کو خوف تھا کہ اگر کہین ٹھہر کر عصر پڑھنے کا اہتمام کیا جائے گا، تو وقت نکل جائے گا، اور اگر عصر مین تاخیر کیجائے تو حکمِ الٰہی کی تعمیل مین دیر ہو جائے گی، اس مشکل کا حل انھون نے اس طرح کیا، کہ وہ اشارون مین نماز پڑھتے جاتے اور چلتے جاتے تھے[5]، سخت سے سخت مجبوری کی حالت مین بھی نماز اُن سے ترک نہین ہوتی تھی، چنانچہ بیماری کی حالت مین

---

[1] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ فی وقت قیام النبی صلعم من اللیل [2] صحیح بخاری کتاب الاطعمہ باب الحشف، [3] صحیح بخاری کتاب الصوم، [4] صحیح بخاری کتاب الصوم، [5] ابوداؤد باب صلوٰۃ الطالب،

وہ دوسرون کا سہارا لے کر مسجد مین حاضر ہوتے تھے[1]، پھر وہ جس خضوع وخشوع محویت اور استغراق کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے، اس کا نظارہ بڑا پر اثر ہوتا تھا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو اُن پر اس شدت سے رقت طاری ہوتی کہ کافر عورتون اور بچون تک پر بھی اس کا اثر ہوتا تھا[2]، حضرت عمرؓ نماز مین اس زور سے روتے تھے، کہ ان کے رونے کی آواز پچھلی صف تک جاتی تھی[3]، حضرت تمیمؓ داری ایک رات تہجد کے لئے کھڑے ہوئے تو صرف ایک آیت کی تلاوت مین صبح کر دی، بار بار اس کو دہراتے تھے، اور مزے لیتے تھے[4]، ع

شب شود صبح وہمان محو تماشا باشم

حضرت انسؓ قیام اور سجدہ مین اتنی دیر لگاتے تھے، کہ لوگ سمجھتے کہ کچھ بھول گئے ہین[5]، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب نماز مین کھڑے ہوتے تھے تو کئی کئی سورتین پڑھ ڈالتے تھے اور اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کوئی ستون کھڑا ہے، اور جب سجدہ مین جاتے تو اتنی دیر تک سجدہ کرتے تھے، کہ حرم محترم کے کبوتر ایک سطح جامد سمجھکر ان کی پیٹھ پر آکر بیٹھ جاتے تھے[6]،

ایک رات میدان جنگ مین ایک پہاڑی پر دو صحابی پہرہ دینے کے لئے متعین ہوتے ہین، ایک صاحب سو جاتے ہین، اور دوسرے نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے ہین، دشمن انکو تاک کر تیر مارتا ہے جو بدن مین ترازو ہو جاتا ہے، کپڑے خون سے تر بتر ہو جاتے ہین، مگر نماز کا استغراق اسی طرح قائم رہتا ہے، نماز تمام کرکے اپنے رفیق کو بیدار کرتے اور واقعہ سناتے ہین

---

[1] نسائی کتاب الامامہ باب المحافظۃ علی الصلوۃ [2] صحیح بخاری کتاب الصلوۃ باب اذا بکی الامام فی الصلوۃ [3] صحیح بخاری کتاب الہجرۃ، وکتاب الصلوۃ، باب المسجد یکون فی الطریق، [4] اسد الغابہ تذکرہ حضرت تمیمؓ داری، [5] صحیح بخاری باب المکث بین السجدتین، [6] حالات عبداللہ بن زبیرؓ اصابہ واسد الغابہ وغیرہ ،

ساتھی کہتے ہیں کہ تم نے اس وقت مجھے کیوں نہ جگایا، جواب ملتا ہے، میں نے ایک پیاری سورہ[1] شروع کی تھی، پسند نہ آیا کہ اس کو ختم کئے بغیر نماز توڑ دوں،

اس سے بھی زیادہ پُر اثر منظر یہ ہے کہ دشمنوں کی فوجیں مقابل کھڑی ہیں، تیروں کا مینہ برس رہا ہے، نیزوں اور تلواروں کی بجلیاں ہر طرف کوند رہی ہیں، سر و گردن، دست و بازو کٹ کٹ کر گر رہے ہیں، کہ دفعۃً نماز کا وقت آجاتا ہے، فوراً جنگ کی صفیں نماز کی صفیں بنجاتی ہیں اور ایک "اللہ اکبر" کی آواز کے ساتھ موت و حیات سے بے پروا ہو کر گردنیں جھکنے اور اٹھنے لگتی ہیں،

نور کا تڑکا ہے، اسلام کے دائرہ کا مرکز فاروق اعظمؓ امام نماز ہے، پیچھے صحابہ کی صفیں قائم ہیں، دفعۃً ایک شقی خنجر بکف آگے بڑھتا ہے، اور خلیفہ پر حملہ آور ہو کر شکم مبارک کو چاک چاک کر دیتا ہے، آپ غش کھا کر گر پڑتے ہیں، خون کا فوارہ جاری ہو جاتا ہے، یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر نماز کی صفیں اپنی جگہ پر قائم ہیں، حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ نماز پڑھانے کو آگے بڑھتے ہیں، پہلے صبح کا دوگانہ ادا ہو لیتا ہے، تب خلیفۂ وقت کو اٹھایا جاتا ہے[2]،

حضرت عمرؓ کو جس صبح کی نماز میں زخم لگا اس کے بعد کی صبح کو لوگوں نے ان کو نماز کے لئے جگایا، تو بولے "ہاں جو شخص نماز چھوڑ دے، اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں"۔ چنانچہ اسی حالت میں کہ زخم سے خون جاری تھا، آپ نے نماز پڑھی[3]،

حضرت علی مرتضیٰؓ صبح کی نماز کے لئے مسجد میں داخل ہوتے ہیں، یا صبح کی نماز میں ہوتے ہیں[4] کہ ابن ملجم کی تلوار ان کو گھائل کرتی ہے، اور کچھ دیر کے بعد وہ داعیِ اجل کو لبیک کہتے ہیں، امام

---

[1] ابوداؤد کتاب الطہارۃ باب الوضوء من الدم، [2] صحیح بخاری واقعہ شہادت عمرؓ، [3] موطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب العمل فیمن غلب علیہ الدم، [4] الریاض النضرۃ للمحب الطبری جلد ۲ ص ۲۴۶، مصر،

مظلوم حسینؓ بن علیؓ کربلا کے میدان مین رونق افروز ہوتے ہین، عزیزون اور دوستون کی لاشین میدانِ جنگ مین نظر کے سامنے پڑی ہوتی ہین، ہزارون اشقیا آپ کو نرغہ مین لیے ہوتے ہین، اتنے مین ظہر کا وقت آجاتا ہے، آپ دشمنون سے اجازت چاہتے ہین، کہ "وہ اتنا موقع دین کہ آج شب ظہر کی نماز ادا کرسکین[1]"

نماز مین جس خضوع وخشوع کا حکم ہے، صحابۂ کرامؓ نے اس کے یہ نمونے پیش کئے کہ عزیز سے عزیز چیز بھی اگر اُن کے اس روحانی ذوق وشوق مین خلل انداز ہوئی تو انھون نے اسکو اس ذوق پر نثار کردیا، حضرت ابوطلحہؓ انصاری اپنے باغ مین نماز پڑھ رہے تھے ایک خوشنا چڑیا نے اُڑنا شروع کیا حضرت ابوطلحہؓ دیر تک ادھر ادھر دیکھتے رہے، پھر جب نماز کا خیال آیا تو رکعت یاد نہ رہی، دل مین کہا اس باغ نے یہ فتنہ برپا کیا، یہ کہکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین آئے اور واقعہ بیان کیا، اور کہا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ باغ راہ خدا مین نذر ہے،

اسی طرح ایک اور صحابی اپنے باغ مین نماز مین مشغول تھے، باغ اُس وقت نہایت سرسبز وشاداب اور پھلون سے لدا ہوا تھا، پھلون کی طرف نظر اٹھ گئی، تو نماز یاد نہ رہی جب اسکا خیال آیا تو دل مین نادم ہوے کہ دنیا کے مال و دولت نے اپنی طرف متوجہ کرلیا، یہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ تھا، انکی خدمت مین حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یہ باغ جس نے مجھے فتنہ مین مبتلا کردیا راہِ خدا مین دیتا ہون، چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اس کو بیت المال کی طرف سے بیچا تو ۵۰ ہزار مین فروخت ہوا[2]،

---

[1] تاریخ طبری کبیر ص ۲۲۷ جلد ۷ واقعات سنہ ۶۱ھ، [2] یہ دونون واقعے موطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب ما یشغلک عنہا مین مذکور ہین،

زکوٰۃ

وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ

زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم نماز کے بعد جس کا اصل تعلق خالق و مخلوق کے باہمی سلسلہ اور رابطہ سے ہے اور جس کا ایک بڑا فائدہ نظامِ جماعت کا قیام ہے، اسلامی عبادت کا دوسرا رکن زکوٰۃ ہے جو آپس میں انسانوں کے درمیان ہمدردی، اور باہم ایک دوسرے کی امداد، اور معاونت کا نام ہے، اور جس کا اہم فائدہ نظامِ جماعت کے قیام کے لئے مالی سرمایہ بہم پہنچانا ہے، زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے جس کا اطلاق تعمیم کے ساتھ ہر مالی اور جسمانی امداد اور نیکی پر بھی ہوتا ہے لیکن فقہی اصطلاح میں "زکوٰۃ" صرف اُس مالی امداد کو کہتے ہیں، جو ہر اُس مسلمان پر واجب ہے، جو دولت کی ایک مخصوص مقدار کا مالک ہو،

زکوٰۃ گذشتہ مذاہب میں زکوٰۃ بھی اُن عبادات میں سے ہے، جو تمام آسمانی مذاہب کے صحیفوں میں فرض بتائی گئی ہے لیکن اُن کے پیرووں نے اس فرض کو اس حد تک بھلا دیا تھا، کہ بظاہر انکے مذہبی احکام کی فہرست میں اس کا نام بھی نظر نہیں آتا، حالانکہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفوں سے ہوتی ہے، کہ جس طرح نماز ہر مذہب کا جزء لاینفک تھی اسی طرح زکوٰۃ بھی

تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزو رہی ہے، بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا اُس میں نماز اور زکوٰۃ دونوں تھیں

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ،	(ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا تھا)
(بقرہ ع ۱۰)	کہ کھڑی رکھیو نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ،
لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَیْتُمُ	(اے بنی اسرائیل) اگر تم کھڑی رکھتے نماز
الزَّکٰوۃَ، (مائدہ ۳)	اور دیتے رہتے زکوٰۃ،

حضرت اسمٰعیلؑ کے ذکر میں ہے،

وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِسْمٰعِیْلَ اِنَّہٗ	اور قرآن میں اسمٰعیل کا ذکر کر، بے شک
کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَکَانَ	وہ وعدہ کا سچا تھا، اور وہ خدا کا بھیجا ہوا
رَسُوْلًا نَّبِیًّا وَکَانَ یَاْمُرُ	پیغمبر تھا، اور وہ اپنے لوگوں کو نماز اور
اَھْلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ وَ	زکوٰۃ کی تاکید کرتا تھا اور وہ اپنے رب
کَانَ عِنْدَ رَبِّہٖ مَرْضِیًّا، (مریم ۲)	کے نزدیک پسندیدہ تھا،

حضرت عیسیٰؑ کہتے ہیں،

وَاَوْصَانِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ	اور خدا نے مجھ کو زندگی بھر نماز پڑھنے
مَادُمْتُ حَیًّا، (مریم ۲)	اور زکوٰۃ دینے کی تاکید کی،

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانوروں میں ایک عشر یعنی دسواں حصہ (احبار ۲۷-۳۰-۳۲) نیز ہر بیس برس یا اس سے زیادہ عمر والے پر خواہ امیر ہو یا غریب آدھا مثقال دینا واجب تھا، (خروج ۳۰-۱۳-۱۵) ساتھ ہی غلہ کاٹتے وقت گرا پڑا

اناج، کھلیان کی منتشر بالین اور پھل والے درختون مین کچھ پھل چھوڑ دیتے تھے، جو مال کی زکوٰۃ تھی، اور یہ عملاً ہر تیسرے سال واجب الادا ہوتی تھی، یہ رقم بیت المقدس کے خزانہ مین جمع کیجاتی تھی، اس کا ساٹھوان حصہ مذہبی عہدہ دار پاتے تھے، دسوان حصہ حضرت ہروںؑ کی اولاد (لاوین) قومی خاندانی کاہن ہونے کی حیثیت سے لیتی تھی، اور ہر تیسرے سال مین دسوان حصہ بیت المقدس کے حاجیون کی مہمانی کے لئے رکھا جاتا تھا، اسی مد سے عام مسافرون، غریبون بیواؤن اور یتیمون کو روزانہ کھانا پکا کر تقسیم کیا جاتا تھا[1]، اور نقد آدھے مثقال والی زکوٰۃ کی رقم، جماعت کے خیمہ (یا مسجد بیت المقدس) اور قربانی کے ظروف وآلات کی خریداری کے خرچ کے لئے رہتی تھی[2]،

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شریعت موسوی کے ان ظاہری قواعد مین کوئی ترمیم نہین کی، بلکہ ان کی روحانی کیفیت پر زیادہ زور دیا، انجیل لوقا (۱۸-۱۰) مین ہے کہ "جو اپنا عشر (زکوٰۃ) ریا، نمایش، اور فخر کے لئے دیتا ہے اس سے وہ شخص بہتر ہے جو اپنے قصور پر نادم ہے"

اسی انجیل کے ۲۱ وین باب کی پہلی آیت مین ہے:-

"اگر کوئی دولتمند ہیکل کے خزانہ مین اپنی زکوٰۃ کی بڑی رقم ڈالے، اور اس کے مقابلہ مین کوئی غریب بیوہ خلوص دل سے دو دمڑی ڈالے، تو اس کی زکوٰۃ کا رتبہ اس دولتمند کی زکوٰۃ سے کہین بڑھ کر ہے"

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برطانیکا طبع یازدہم مضمون "خیرات" (CHARITY) باب یہودیون مین "خیرات"

[2] توراۃ خروج ۳۰-۱۶ و ۳۸-۲۶،

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے لوگون کو ترغیب دی، کہ جس کے پاس جو کچھ ہو وہ خدا کی راہ
مین لٹا دے،

کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گذر جانا آسان ہے، مگر دولتمند کا خدا کی بادشاہت
مین داخل ہونا مشکل ہے، (متی ۱۹-۲۴)

ساتھ ہی انھون نے خود اپنی طرف سے نیز اپنے رفیق کی طرف سے اپنی ناداری کے باوجود
آدھے مثقال والی زکوٰۃ ادا کی ہے، (متی ۱۷-۲۴)

توراۃ کے زمانہ مین چونکہ دولت زیادہ تر صرف زمین کی پیداوار اور جانورون کے گلون
تک محدود تھی، اس لئے ان ہی دونون چیزون کی زکوٰۃ کا زیادہ ذکر آیا ہے، سونا چاندی اور
ان کے سکون کی چونکہ قلت تھی اس لئے اُن کی زکوٰۃ کا ذکر ایک ہی دو جگہ ہے، اسی بنا پر یہود نو
نے نقد زکوٰۃ کی اہمیت محسوس نہین کی، علاوہ برین زکوٰۃ کی مدت کی تعیین کہ وہ ہر سال یا دوسرے
یا تیسرے سال واجب الادا ہے، تصریحاً معلوم نہین ہوتی، نیز یہ کہ اس زکوٰۃ کا مصرف کیا ہے
یعنی وہ کہان خرچ کیجائے، اس کی تفصیل بھی خود توراۃ کی زبان سے کم سنائی دیتی ہے،

غرض وجوہ جو کچھ ہون، مگر حالت یہ تھی کہ یہود نے اس فرض کو بھلا دیا تھا، اور خصوصًا عرب
مین جہان کی دولت کے وہ تنہا مالک بن بیٹھے تھے، چند کے سوا اکثر کو اس فرض کا دھیان
بھی نہ تھا، قرآن نے ان کو یاد دلایا کہ

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ

(اور تم بنی اسرائیل سے معاہدہ تھا کہ) نماز کھڑی رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا،

وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ، پھر تم پھر گئے، مگر تم مین سے تھوڑے

(بقرہ ۴-۱۰) اور تم دھیان نہین دیتے،

عیسوی مذہب مین گو سب کچھ دینے کا حکم تھا، مگر یہ حکم ہر ایک کے لئے موزون نہین ہو سکتا تھا، اور نہ ہر شخص اس پر عمل کر سکتا تھا، دوسرے مذہبون مین بھی اگرچہ خیرات اور دان کرنے کے احکام موجود تھے، تاہم ان کے لئے کوئی نظام اور اصول مقرر نہین کیا گیا تھا، اور نہ ہر شخص پر قانوناً کوئی رقم واجب الادا تھی جس کے ادا کرنے پر وہ مجبور ہو سکتا تھا،

اسلام کی اس راہ مین تکمیل

محمد رسول اللہ صلعم کی شریعت نے اس بارے مین بھی اپنا تکمیلی کارنامہ انجام دیا، اس نے نہایت خوبی اور وقتِ نظر کے ساتھ زکوٰۃ کا پورا نظام تیار کیا، انسان کے مالی کاروبار کا معیار عموماً سالانہ آمدنی سے قائم ہوتا ہے، اس لئے اسلام نے زکوٰۃ کی مدت سال بھر کے بعد مقرر کی، اور ہر سال اس کا ادا کرنا ضروری قرار دیا، ساتھ ہی اس نے دولت کے تین سرچشمے قرار دیئے، سونا چاندی[۱] اور جانور[۲] اور پیداوار[۳]، اور ان مین سے ہر ایک کی علحدہ علحدہ شرحین مقرر کین، سونے چاندی مین چالیسوان حصہ اور پیداوار مین دسوان حصہ معین کیا، جانورون کی مختلف قسمون مین ان کی مختلف تعداد پر ان کی قدر و قیمت کی کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف شرحین قرار دین، پھر اس زکوٰۃ سے ہر قسم کے مصارف کی تعیین و تحدید کی، اور اس کی تحصیل وصول اور جمع و خرچ کا کام بیت المال سے متعلق کیا،

یہ تو اجمال تھا، اب تفصیلی حیثیت سے اُن مین سے ہر ایک پہلو پر شریعتِ محمدی کی تکمیلی حیثیت کو نمایان کرتا ہے،

اسلام مین زکوٰۃ کی اہمیت

اسلام کی تعلیم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفۂ وحی مین نماز کے ساتھ تنہا جو فریضہ سب سے اہم نظر آتا ہے، وہ زکوٰۃ ہے، نماز حقوقِ الٰہی مین سے ہے، اور زکوٰۃ حقوقِ عباد مین، ان دونون فریضون کا باہم لازم وملزوم اور مربوط ہونا اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے، کہ اسلام مین حقوق اللہ کے ساتھ حقوقِ عباد کا بھی یکسان لحاظ رکھا گیا ہے، قرآنِ پاک مین جہان کہین نماز کا ذکر ہے، اس کے متصل ہی ہمیشہ زکوٰۃ کا بھی بیان ہے، چنانچہ قرآنِ پاک مین بیس مقامات پر اقام الصّلوٰۃ" کے بعد ہی اِیتَاءِ الزَّکوٰۃ، آیا ہے، مثلاً اَقِیمُوا الصَّلوٰۃَ وَاٰتُوا الزَّکوٰۃَ یا اَقَامُوا الصَّلوٰۃَ وَاٰتَوُا الزَّکوٰۃَ اور زکوٰۃ ادا کرنے کی مدح یا اُس کے دینے اور نہ دینے والون کا تذکرہ اس کے علاوہ ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام مین زکوٰۃ کی کیا اہمیت ہے بارگاہِ نبوی مین آکر جب کسی نے اسلام کے احکام دریافت کئے ہین، تو ہمیشہ آپ نے نماز کے بعد زکوٰۃ کو پہلا درجہ دیا ہے، صحیحین کی کتاب الایمان مین اس قسم کی متعدد حدیثین ہین جنمین یہ ترتیب ملحوظ رہی ہے، بلکہ کبھی کبھی وہ اسلام کے شرائطِ بیعت مین داخل کیگئی ہے، چنانچہ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضؓ کہتے ہین کہ مین نے رسول اللہ صلعم سے بیعت تین باتون پر کی تھی، نماز پڑھنا[1]، زکوٰۃ دینا، اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا" وفد عبدالقیس نے ۸ھ مین نبوت کے آستانہ پر حاضر ہوکر جب اسلام کی تعلیمات دریافت کین تو آپ نے اعمال مین پہلے نماز، پھر زکوٰۃ کو جگہ دی[1]،

۹ھ مین جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو اسلام کا داعی بنا کر یمن بھیجا ہے، تو اسلام کے مذہبی فرائض کی یہ ترتیب بتائی کہ "پہلے ان کو توحید کی دعوت دینا جب وہ

---

[1] یہ دونون حدیثین صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول ص۱۸۸ مین ہین،

یہ جان لین تو ان کو بتانا کہ دن مین پانچ وقت کی نماز اُن پر فرض ہے، جب وہ نماز پڑھ لین تو اُنھین بتانا کہ اللہ تعالٰی نے اُن کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو ان کے دولتمندون سے لیکر اُن کے غریبون کو دی جائے گی،[1]

صحابہ مین جو لوگ شریعت کے رازدان تھے وہ اس نکتہ سے اچھی طرح واقف تھے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب اہل عرب نے بغاوت کی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے اُن کے خلاف تلوار کھینچ لی حضرت عمرؓ نے کہا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، کہ جو توحید کا قائل ہو اس کا خون روا نہین، اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے" حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا "خدا کی قسم جو نماز اور زکوٰۃ مین فرق کرے گا مین اس سے لڑون گا کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، خدا کی قسم! جو رسول اللہ صلعم کے زمانہ مین بھیڑ کا ایک بچہ بھی دیتا تھا وہ اس کو دینا پڑے گا"[2] حقیقت مین یہ ایک لطیف نکتہ تھا جس کو صرف شریعت کا محرم اسرار سمجھ سکتا تھا،[3] اس نے سمجھا اور امت کو سمجھایا اور سب نے اس کے سامنے اطاعت کی گردن جھکا دی،

نماز اور زکوٰۃ کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے، اسلام کی تنظیمی زندگی صرف دو بنیادون پر قائم ہے، جن مین سے ایک روحانی اور دوسری مادی ہے، اسلام کا نظام روحانی

[1] صحیح بخاری جلد دوم ص۱۰۹۸ کتاب الرد علی الجہمیۃ [2] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول ص۱۸۸ [3] درحقیقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے طرز عمل کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت تھی، فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ ... فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ، (توبہ-۱) ان مشرکون کو مارو جہان پاؤ ..... تو اگر وہ توبہ کرین اور نماز کھڑی کرین، اور زکوٰۃ دین تو انکو آزادی دے دو، نیز دیکھو صحیح بخاری جلد دوم ص۱۰۹۲ باب کراہیۃ الاختلاف،

نماز با جماعت سے جو کسی مسجد مین ادا ہو، قائم ہوتا ہے، اور نظامِ مادّی زکوٰۃ سے جو کسی بیت المال مین جمع ہوکر تقسیم ہو، مرتّب ہوتا ہے، اسی لئے یہ دونون چیزین، اسلام مین ساتھ ساتھ نظر آتی ہین اور ان کی انفرادی حیثیت کیساتھ ان کی اجتماعی حیثیت پر بھی شریعتِ محمدی نے خاص زور دیا ہے، نماز جس طرح جماعت اور مسجد کے بغیر بھی انجام پا جاتی ہے، لیکن اپنی فرضیت کے بعض مقاصد سے دور ہو جاتی ہے، اسی طرح زکوٰۃ بیت المال کی مجتمع صورت کے علاوہ بھی ادا ہو جاتی ہے مگر اس کی فرضیت کے بعض اہم مقاصد فوت ہو جاتے ہین، یہی سبب ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت مین جب بعض قبیلون نے یہ کہا کہ وہ زکوٰۃ بیت المال مین داخل نہ کرین گے، بلکہ بطور خود اس کو صرف کردینگے، تو شریعتِ محمدی کے شناسائے راز نے ان کی اس تجویز کو قبول نہین کیا، اور بزور ان کو بیت المال مین زکوٰۃ داخل کرنے پر مجبور کیا، کہ اگر ان کی بات تسلیم کرلیجاتی تو اسلام کی وحدت کا سررشتہ اسی وقت پارہ پارہ، اور مسلمانون کی امامت وجماعت کا نظام اسی وقت درہم برہم ہو جاتا،

الغرض زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ مین غریبون کی چارہ گری، مسکینون کی دست گیری، مسافرون کی امداد، یتیمون کی خبرگیری، بیواؤن کی نصرت، غلامون اور قیدیون کی اعانت، نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے، اور اس فریضہ کی یہ سب سے پہلی اہمیت ہے جو مذاہب کی تاریخ مین نظر آتی ہے،

زکوٰۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل؛ جس طرح عام نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا اور مدینہ آکر وہ رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچی، اسی طرح زکوٰۃ یعنی مطلق مالی خیرات کی ترغیب بھی ابتدائے اسلام

ہی سے شروع ہوئی لیکن اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا، بعض مورخون اور محدثون کو اس بنا پر کہ سنہ ۹ھ مین زکوٰۃ کی فرضیت کی تصریح ملتی ہے، اس سے پہلے کے واقعات مین جو زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے، اس سے پریشانی ہوئی ہے، حالانکہ شروع اسلام مین زکوٰۃ کا لفظ صرف خیرات کا مرادف تھا، اس کی مقدار، نصاب، سال، اور دوسری خصوصیتین جو زکوٰۃ کی حقیقت مین داخل ہین، وہ بعد کو رفتہ رفتہ مناسب حالات کے پیدا ہونے کے ساتھ تکمیل کو پہنچین، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام صرف دو لفظون سے مرکب ہی خدا کا حق اور بھائیون کا حق، پہلے لفظ کا مظہر اعظم "نماز" اور دوسرے کا "زکوٰۃ" ہے، اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق جب بلند ہوئی، تو اس پکار کی ہر آواز انہی دو لفظون کی تفصیل و تشریح تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح بعثت سے پہلے غار حرا مین چھپ کر خدا کی یاد (نماز) مین مصروف رہتے تھے اسی طرح بیکس اور لاچار انسانون کی دستگیری (زکوٰۃ) بھی فرمایا کرتے تھے، حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے بعثت کے وقت آپکی نسبت فرمایا "آپ قرابتدارون کا حق پورا کرتے ہین، قرضدارون کا قرض ادا کرتے ہین، غریب کو کماتے ہین، مہمان کو کھلاتے ہین، لوگون کو مصیبتون مین مدد دیتے ہین[1]" غور کرو کیا زکوٰۃ انہی فرائض کے مجموعہ کا نام نہین ہے؟ اس بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نماز اور زکوٰۃ توام ہین، اور انہی دو اجمالی حقیقتون کی تشریح کا نام اسلام ہے،

سورۂ مدثر اگرچہ وحی کی ابتدائی سورہ ہے، لیکن اس سرزمین مین وہ تمام بیج موجود ہین، جنسے آگے چل کر رفتہ رفتہ احکام اسلامی کا عظیم الشان تناور درخت تیار ہوا، اس مین نماز کی تمام تفصیلات

[1] صحیح بخاری جلد اول باب اول،

کو صرف ایک لفظ میں ادا کیا گیا ہے،

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، (مدثر-۱) اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر،

پروردگار کی بڑائی نماز کی روح ہے جو اس سورہ میں موجود ہے، اس کے بعد ہے،

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ، (مدثر-۱) اور بدلا بہت چاہنے کیلئے کسی پر احسان نہ کر،

یہی وہ بیج ہے جس سے مسائل زکوٰۃ کے تمام برگ و بار پیدا ہوئے ہیں، مدثر کے بعد سورۂ مزمل[1] اتری، اس میں بہ تصریح دونوں حکم موجود ہیں، اور زکوٰۃ کی کسی قدر تفصیل بھی کیگئی ہے،

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ اور نماز کھڑی کرو، اور زکوٰۃ دو، اور اللہ

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۭ وَ کو اچھا قرض دو، اور جو تم آگے

مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ بھیجو گے اپنے واسطے اس کو خدا کے

تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ پاس بہتر اور ثواب میں زیادہ

اَعْظَمَ اَجْرًا، (مزمل-۲) پاؤگے،

بعثت کے پانچویں سال جب حضرت جعفرؓ وغیرہ ہجرت کر کے حبشہ گئے ہیں، اور نجاشی نے اپنے دربار میں بلا کر ان سے اسلام کی حقیقت اور اسکی تعلیمات دریافت کی ہیں، اور حضرت جعفرؓ نے اسکے جواب میں جو تقریر کی ہے، اس میں ہے "اور وہ پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں، روزے رکھیں اور زکوٰۃ دیں"[2] اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوٰۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتدا ہی میں ہوچکا تھا، اور وفد عبد القیس نے (جو تقریباً ۵ھ میں آیا تھا) سوال کے جواب میں آپ نے جن احکام کی تعلیم

[2] مسند احمد جلد اول صفحہ ۲۰۲،

دی، ان مین ایک زکوٰۃ بھی تھی،[1] ۹ھ مین جب نجاشی نے نامۂ مبارک پہنچنے کے بعد ابوسفیان سے جو اس وقت تک کافر تھے، اسلام کی تعلیمات دریافت کین تو انھون نے دوسری چیزون کے ساتھ زکوٰۃ وصدقہ کا بھی[2] تذکرہ کیا، ان واقعات سے بخوبی واضح ہے کہ ۹ھ سے پہلے بلکہ ہجرت سے بھی پہلے بعثت کے بعد ہی نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی تعلیم بھی موجود تھی،

لیکن چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ تعلیم صرف نظریون کا پیش کرنا نہ تھا، بلکہ امت کو عملاً اسلام کی تعلیمات پر کاربند بنانا تھا، اس لئے حالات کے اقتضاء اور مناسبت کے ساتھ ساتھ تعلیمات کے تفصیلی اجزاء اور ان کے متعلقہ احکام کی تشریح آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچائی گئی، مکہ معظمہ مین مسلمانون کی پریشانی، پراگندگی، شکستہ حالی اور غربت ومسکینی کی جو کیفیت تھی اس کی بنا پر اتنا ہی ان کے لئے بہت تھا، کہ وہ کسی یتیم ومسکین اور بھوکے کو کھانا کھلادین، چنانچہ اس زمانہ مین اسی قسم کے خیرات کی تعلیم دی گئی،

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ؕ	اور تو کیا سمجھا کہ وہ گھاٹی کیا ہے، کسی
فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ	(قرضدار یا قیدی یا غلام) کی گردن
يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۙ يَّتِيْمًا	چھڑانا یا بھوک کے دن مین ناتے
ذَا مَقْرَبَةٍ ۙ اَوْ مِسْكِيْنًا	کے کسی بن باپ کے بچہ کو، یا خاک
ذَا مَتْرَبَةٍ ؕ	مین پڑے ہوئے کسی محتاج کو کھا
(بلد-۱)	کھلانا،

[1] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ، [2] صحیح بخاری جلد اول آغاز کتاب الزکوٰۃ وکتاب التفسیر

عام قریش پر جنھون نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس انسانی ہمدردی کی پکار کو نہین سنا، عتاب آیا،

فَذٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِينِ (ماعون-۱)	وہی ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے، اور غریب کے کھلانے پر آمادہ نہین کرتا،
كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِينِ (فجر-۱)	یہ بات نہین، بلکہ بن باپ کے بچہ کی تم عزت نہین کرتے اور آپس مین محتاج کے کھلانے کی تاکید نہین کرتے،

اور مسلمانون کے اخلاص، باہمی ہمدردی، اور اُن کے جذبۂ ترحم کی تعریف فرمائی، کہ

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِينًا وَّيَتِيمًا وَّاَسِيرًا اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاۤءً وَّلَا شُكُورًا (دھر-۱)	اور وہ (حاجتمند ہونے کے باوجود) محتاج یتیم، اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہین (اُور کہتے ہین) کہ ہم تم کو صرف خدا کے لئے کھلاتے ہین، تم سے نہ بدلا چاہتے ہین نہ شکریہ،

مدینہ منورہ آکر جب مسلمانون کو کسی قدر اطمینان ہوا، اور انھون نے کچھ اپنا کاروبار شروع کیا تو روزہ کے ساتھ ساتھ ۲ھ مین صدقۃ الفطر واجب ہوا[1]، یعنی یہ کہ سال مین ایک دفعہ

[1] تاریخ طبری طبع یورپ ص۱۲۸۱،

عید کے دن نماز سے پہلے ہر مسلمان سیر سوا سیر غلہ خدا کی راہ میں خیرات کرے، تاکہ غریب و محتاج بھی اپنی عید کا دن پیٹ بھر کر خوشی اور مسرت سے گذاریں، اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کی گئی، انھوں نے دریافت کیا، یا رسول اللہ ہم کیا خیرات کریں،

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ (بقرہ-۲۷) وہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں،

ارشاد ہوا

قُلِ الْعَفْوَ، (بقرہ-۲۷) کہدو (اے پیغمبر) کہ تمھاری ضرورت سے جو کچھ بچ رہے (اس کو خیرات کرو)

یہ زکوٰۃ کی تعیین کی راہ میں اسلام کا پہلا قدم ہے صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کا قول[1] نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو یہ حکم تھا، کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ میں خیرات کر دیں، آیندہ کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھیں، کہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی حالت اسی کی مقتضی تھی، کچھ دنوں کے بعد جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں، زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں، تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم ہوا

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا أَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ (بقرہ-۳۷)

اے مسلمانو! اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں، اور جو ہم تمھارے لئے زمین سے پیدا کریں، اس میں سے کچھ خیرات میں دو،

[1] کتاب الزکوٰۃ مع فتح الباری جلد ۳ ص ۲۱۶،

مسلمانون نے اس کی تعمیل کی تو خدا نے ان کی تعریف کی کہ

وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ، (بقرہ ۱-۱) اور ہم نے اُن کو جو روزی دی ہے اس مین سے وہ کچھ خرچ (خیرات) کرتے ہین

صحابہ کا یہ حال تھا کہ وہ بھی جن کے پاس کچھ نہ تھا، خدا کی راہ مین کچھ نہ کچھ دینے کے لیے بیقرار رہتے تھے، چنانچہ جب یہ حکم ہوا کہ ہر مسلمان پر صدقہ دینا فرض ہے، تو غریب و نادار صحابہؓ نے آکر عرض کی کہ اے خدا کے رسول! جس کے پاس نہ ہو وہ کیا کرے، فرمایا وہ محنت مزدوری کر کے اپنے ہاتھ سے پیدا کرے، خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسرون کو بھی صدقہ دے، انھون نے پھر گذارش کی کہ جس مین اس کی بھی طاقت نہ ہو وہ کیا کرے، فرمایا کہ وہ فریاد خواہ حاجتمند کی مدد کرے، انھون نے پھر دریافت کیا کہ اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو؟ ارشاد ہوا "تو وہ نیکی کا کام کرے اور برائی سے بچے، یہی اس کا صدقہ ہے"[۱] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پر اثر تعلیمات اور نصیحتون کا صحابہ پر یہ اثر ہوا کہ وہ اس غرض کے لئے بازار جا کر بوجھ اٹھاتے تھے، اور اس سے جو کچھ ملتا تھا اس کو خدا کی راہ مین خرچ کرتے تھے،[۲]

لیکن با این ہمہ اب تک تمام عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع نہین ہوا تھا، اور اس لئے اس کا کوئی مرتب قومی نظام بھی قائم نہ تھا، رمضان ۸ھ مین مکہ کی فتح نے تمام عرب کو ایک سر رشتہ مین منسلک کر دیا، اب وہ وقت آیا کہ اسلام اپنا خاص نظام قائم کرے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی،

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ، [۲] ایضاً،

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (اے محمد رسول اللہ) ان کے مال میں سے
تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو کہ اس کے ذریعہ
(توبہ-۱۳) سے تم ان کو پاک صاف کرسکو،

چنانچہ اس کے بعد نئے سال یعنی محرم ۹ھ میں زکوٰۃ کے تمام احکام و قوانین مرتب ہوئے اس کی وصولی کے لئے تمام عرب میں محصلوں اور عاملوں کا تقرر ہوا[1]، اور باقاعدہ ایک بیت المال کی صورت پیدا ہوئی، یہ تمام احکام و قوانین سورۂ براءت میں مذکور ہیں، جو ۹ھ کے آخر میں نازل ہوئی ہے،

زکوٰۃ کی مدت کی تعیین

اسلام سے پہلے زکوٰۃ کی مدت کی تعیین میں بڑی افراط و تفریط تھی، توراۃ میں جو عُشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا گیا تھا، وہ تین سال میں ایک دفعہ واجب ہوتا تھا، (استثنا ۱۴-۲۸) اور انجیل میں کسی مدت اور زمانہ کی تعیین ہی نہ تھی، اس بنا پر زکوٰۃ کی تنظیم کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز اس کی مدت کا تعین تھا کہ وہ نہ تو اس قدر قریب اور مختصر زمانہ میں واجب الادا ہو کہ انسان بار بار کے دینے سے اکتا جائے اور بجائے خوشی اور دلی رغبت کے اُس کو ناگوار اور جبر معلوم ہو، اور نہ اس قدر لمبی مدت ہو کہ غریبوں مسکینوں اور قابلِ امداد لوگوں کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے طویل انتظار کی سخت تکلیف اٹھانی پڑے اسلام نے اس معاملہ میں دنیا کے دوسرے مالی کاروبار کو دیکھ کر ایک سال کی مدت مقرر کی، کیونکہ تمام متمدن دنیا نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے کاروبار کے لئے ۱۲ مہینوں کا سال مقرر

---

[1] ابن سعد جلد مغازی ص ۱۱۵ و تاریخ طبری جلد ۴ ص ۱۷۲۲ مطبوعۂ یورپ،

کیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ آمدنی کا اصل سرچشمہ زمین کی پیداوار ہے، اور اس کے بعد اس پیداوار کی خود یا اس کی بدلی ہوئی شکلوں کی صنعتی صورت کا بنانا اور اُن کا بیوپار کرنا ہے، آمدنی کے ان تمام ذریعوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ سال کے مختلف موسم اور فصلیں، جاڑا، گرمی، برسات، ربیع اور خریف، گذر جائیں تاکہ پورے سال کے آمد و خرچ اور نفع و نقصان کی میزان لگ سکے، اور زمیندار، کاشتکار، تاجر، نوکر، صنّاع، ہر ایک اپنی آمدنی و سرمایہ کا حساب کتاب کر کے اپنی مالی حالت کا اندازہ لگا سکے، بڑے جانوروں کی پیدائش اور نسل کی افزائش میں بھی اوسطاً ایک سال[1] لگتا ہے، ان تمام وجہوں سے ہر منظم جماعت، ہر حکومت اور ہر قومی نظام نے محصول اور ٹیکس وصول کرنے کی مدت ایک سال مقرر کی ہے، شریعتِ محمدی نے بھی اس بارہ میں اسی طبعی اصول کا اتباع کیا ہے، اور ایک سال کی مدت کی آمدنی پر ایک دفعہ اس نے زکوٰۃ کی رقم عائد کی ہے، چنانچہ اس کا کھلا ہوا اشارہ سورۂ توبہ میں موجود ہے، جس میں زکوٰۃ کے تمام احکام بیان ہوئے ہیں، زکوٰۃ کے بیان کے بعد ہی ہے،

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ	(توبہ ۵)	مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ
اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ		مہینے ہیں، جس دن اللہ نے آسمانوں
يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَ...		کو اور زمین کو پیدا کیا،

زکوٰۃ کی مقدار توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں زکوٰۃ کی مقدار، پیداوار کا دسواں حصہ تھا، اور نقد میں آدھا مثقال جو امیر و غریب سب پر یکساں فرض تھا، لیکن زمین کی مختلف قسمیں

[1] بکری کی مدتِ حمل چھ مہینے، گائے کی نو، اونٹ کی گیارہ، اور بھینس کی بارہ مہینے ہے،

ہوتی ہین کہین زمین صرف بارش سے سیراب ہوتی ہے، اور کہین نہر کے پانی سے، جہان مزدوری
اور محنت کا اضافہ ہوجاتا ہے، نقد دولت کے بھی مختلف اصناف ہین، بعض مرتبہ دولت بے
مفت ہاتھ آجاتی ہے، اور بعض اوقات سخت محنت کرنی پڑتی ہے، اس لئے سب کا یکسان
حال نہین ہوسکتا، انجیل نے حسب دستور اس مشکل کا کوئی حل نہین کیا، لیکن محمد رسول اللہ صلعم کی
شریعت کاملہ نے علم اقتصاد سیاسی (پولیٹکل اکانمی) کے نہایت صحیح اصول کے مطابق دولت
کے فطری اور طبعی ذرائع کی تعیین کی اور ہر ایک کے لئے زکوٰۃ کی مناسب شرح مقرر کردی،
اس سلسلہ مین سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شریعت محمدیہ نے توراۃ کی قانونی تعیین اور انجیل کی
اخلاقی عدم تعیین، دونون حقیقتون کو اپنے نظام مین جمع کرلیا، اس نے اخلاقی طور پر ہر شخص کو
اجازت دیدی، کہ وہ اپنا کل مال یا نصف مال یا کم وبیش جو چاہے خدا کی راہ مین دے دے،
اس کا نام انفاق یا عام خیرات وصدقہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرض کردیا کہ ہر شخص کی
دولت مین غریبون اور محتاجون اور دوسرے نیک کامون کے لئے بھی ایک مقررہ سالانہ
حصہ ہے، اور اس کا نام زکوٰۃ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک مین فرمایا،

اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ، (معارج-۱)	جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہین، اور جن کے مالون مین مانگنے اور محروم کا معلوم حصہ ہے،

اس آیت سے صاف وصریح طریقہ سے یہ ثابت ہے کہ مسلمانون کی دولت مین غریبون

کا جو حصہ ہے وہ متعین، مقرر، معلوم اور عملاً رائج ہے، چنانچہ قرآنِ پاک مین معلوم اور معلوما کے الفاظ جہان آئے ہین، وہان یہی مقصود ہے، اس سے ثابت ہوا کہ عرب مین جو قوم کسی کسی طرح زکوٰۃ ادا کرتی تھی، اُس کی جو شرح متعین اور رواج پذیر تھی، اس کو اسلام نے کسی قدر اصلاح کے بعد قبول کر لیا تھا، عرب مین اس قسم کی زکوٰۃ صرف بنی اسرائیل ادا کرتے تھے، جس کا حکم توراۃ مین مذکور ہے، اور اس کی شرح بھی اس مین مقرر ہے، یعنی پیداوار مین دسوان حصہ، اور نقد مین نصف مثقال، آنحضرت صلعم نے اپنی حکمت ربانی سے اجناسِ زکوٰۃ پر مختلف شرحین مقرر فرمائین جو قیمت کے لحاظ سے اسی "شرحِ معلوم" کے مساوی ہین، اور ان شرحون کو فرامین کی صورت مین لکھوا کر اپنے عمال کے پاس بھجوایا، یہی تحریری فرامین تدوینِ حدیث کے زمانہ تک بعینہ محفوظ تھے، اور تدوین حدیث کے بعد ان کو بعینہ کتبِ حدیث مین درج کیا گیا جو آج تک موجود ہین،

اس تمام تفصیل کا مخرج قرآنِ پاک مین بھی ایک حیثیت سے مذکور ہے،

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی دولت صرف اس کی محنت اور سرمایہ کی پیداوار ہے، اس لئے اصول کا اقتضا یہ ہے کہ جس حد تک محنت اور سرمایہ کم لگتا ہو، زکوٰۃ کی مقدار اسی قدر زیادہ رکھی جائے، اور جیسے جیسے محنت بڑھتی، اور سرمایہ کا اضافہ ہوتا جائے، زکوٰۃ کی شرح کم ہوتی جائے، عرب مین یہ دستور تھا کہ قبیلون کے سردار چوتھ وصول کرتے تھے، اسی لئے وہ اپنے سردارون کو مرباع (یعنی چوتھ والا) کہا کرتے تھے، شاید دوسری پرانی قومون مین بھی یہ دستور ہو، ہندوستان مین مرہٹون نے بھی چوتھ ہی کو رائج کیا تھا، مگر چونکہ اسلام کو محکومون اور سپاہیون کے ساتھ زیادہ رعایت مدِنظر تھی، اس لئے اُس نے چار کو پانچ کر دیا، اس طرح چوتھ ($\frac{1}{4}$) کے بجائے

دولت کا پانچوان حصہ خدا اور رسول کا حصہ قرار پایا جس کو رسول اور اُن کے بعد اُن کے نائب اپنے ذاتی ضروریات، اہل وعیال کے نان ونفقہ اور نادار مسلمانون کی امداد یا حکومت اور جماعت کی کسی اور ضروری مدمین صرف کرسکین،

اس زکوٰۃ کا نام جو غنیمت کے مال پر عائد ہوتی ہے "خمس" ہے، قرآن نے کہا،

وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ	اور جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے اسکا
فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ	پانچوان حصہ خدا کے لئے، اور رسول
وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی	کے لئے، اور قرابت مند کے لئے
وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ (انفال-۵)	اور یتیمون اور مسکینون اور مسافر کیلئے ہے

نکتہ، اس موقع پر ایک خاص بات سمجھنے کے لائق ہے، جہاد یا دشمنون سے لڑائی کا اصلی مقصد دین کی حمایت اور اعلاے کلمۃ اللہ ہے، غنیمت کا مال حاصل کرنا نہین، اور اگر کوئی صرف حصولِ غنیمت کی نیت سے دشمن سے لڑے تو اس کی یہ لڑائی اسلام کی نگاہ مین جہاد نہ ہوگی اور نہ اس کا کوئی ثواب ملیگا، اس کی طرف خود قرآن پاک مین اشارہ موجود ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد حدیثون مین اس کی تشریح فرمادی ہے، اس بنا پر درحقیقت وہ مالِ غنیمت جو لڑائی مین دشمنون سے ہاتھ آتا ہے، ایک ایسا سرمایہ ہے جو بلا قصد اور بلا محنت اتفاقاً مسلمانون کو مل جاتا ہے، اس سے یہ نکتہ حل ہوتا ہے کہ جو سرمایہ کسی محنت کے بغیر اتفاقاً ہاتھ آئے اس مین پانچوان حصہ نظامِ جماعت کا حق ہے، یا حکومت کے مقررہ بالا مصارف کے لئے ہے،

یہ اصول کہ جو سرمایہ بلا کسی محنت کے اتفاقاً کسی مسلمان کے ہاتھ آجائے، اس مین سے پانچوان حصہ خدا اور رسول کا ہے، تاکہ وہ جماعت کے مشترکہ مقاصد کے صرف مین آئے، وہی ہے جس کی بنا پر رکاز یعنی دفینہ مین جو کسی کو بلا محنت اتفاقاً غیب سے ہاتھ آجائے، خمس (یعنی پانچوان حصہ) جماعت کے بیت المال کا حق تسلیم کیا گیا ہے،

محنت اور سرمایہ سے جو دولت پیدا ہوتی ہے، اس مین سب سے پہلی چیز زمین کی پیداوار ہے، توراۃ نے ہر قسم کی پیداوار پر عشر یعنی دسوان حصہ مقرر کیا تھا، شریعت محمدیہ نے نہایت نکتہ سنجی کے ساتھ، پیداوار کی مختلف قسمون پر مختلف شرح زکوٰۃ کی تفصیل کی، سب سے پہلے پیداوار کے اُن اصناف پر زکوٰۃ مقرر ہوئی جو کچھ زمانہ تک محفوظ رہ سکتے ہین، تاکہ اُن سے حسب منشا خانگی اور تجارتی فائدہ اٹھایا جا سکے، اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو، اسی بنا پر سبزیون اور ترکاریون پر جو ایک دو روز سے زیادہ نہین رہ سکتین، کوئی زکوٰۃ مقرر نہین فرمائی گئی، اسی طرح اس مالیت پر جس مین نشو و نما اور ترقی کی صلاحیت نہین مثلاً آلات، مکان، لباس، سامان، اسباب، ہوائی قیمتی پتھر ان پر بھی زکوٰۃ نہین رکھی گئی، کچھ دنون تک باقی رہنے والی اور نشو و نما پانے والی چیزین چار ہین، زمین، جانور، سونا چاندی یا اُن کے سکّے اور تجارتی مال، چنانچہ ان چارون چیزون پر زکوٰۃ مقرر ہوئی،

زمین کی دو قسمین کی گئین، ایک وہ جس کے جوتنے اور بونے کی محنت اور مزدوری کا خرچ گو کاشتکار کرتا ہے، مگر موسمی اور اقلیمی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیراب کرنے مین کاشتکار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو دخل نہین ہوتا، بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم

سے آپ سے آپ سیراب ہوتی ہے، اس پر بلا محنت والی اتفاقی دولت سے آدھی زکوۃ یعنی عشر (۱/۱۰) مقرر کیا گیا، زمین کی دوسری قسم یعنی وہ جس کی سیرابی کاشتکار کی خاصی محنت اور مزدوری سے ہو، مثلاً کوئیں سے پانی نکال کر لانا، یا نہر بنا کر پانی لانا، تو اس مین قسم اول سے بھی نصف یعنی بیسوان حصہ (۱/۲۰) مقرر ہوا، نقدی سرمایہ جس کی ترقی، حفاظت، نشو و نما، اور افزائش مین انسان کو شب و روز کی سخت محنت کرنی پڑتی ہے، اور جس کی افزائش کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور جس مین ہر قدم پر چوری، گم شدگی، لوٹ اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے، زمین کی دوسری قسم کا بھی آدھا، یعنی چالیسوان (۱/۴۰) حصہ مقرر ہوا[1]، (جانورون کا ذکر آگے آتا ہے)

زمینی پیداوار اور نقد سرمایہ مین شرح زکوۃ کی کمی و بیشی کی ایک دقیق اقتصادی علت اور بھی ہے، انسان کی اصلی ضرورت جس پر اُس کا جینا منحصر ہے، صرف غذا ہے، زمین کے مالکون کو یہ چیز براہِ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہو جاتی ہے، اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت سے وہ بے پروا ہو جاتے ہین لیکن سونے چاندی کے مالکون اور تاجرون کی جو دولت ہے، وہ براہِ راست ان کی زندگی کی اصلی ضرورت کے کام مین نہین آتی، بلکہ مبادلہ اور خرید و فروخت کے ذریعہ سے وہ اس کو حاصل کرتے ہین، وہ کاشتکارون کی پیداوار کو خریدکر ان کو نقد روپیہ دیتے ہین، جس سے ان کی دوسری ضرورتین پوری ہوتی ہین، پھر وہ اس پیداوار کو لے کر گاؤن گاؤن، شہر بشہر اور ملک بملک پھرتے ہین، اور اس کی بھی اُجرت ادا کرتے ہین، نیز جو محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے مین صرف ہوتی ہے، اس سے

[1] یہ نکتہ حافظ ابن قیم نے زاد المعاد مین بیان کیا ہے،

بدرجہا زیادہ نقد کے حصول مین صرف کرنی پڑتی ہے، سونا چاندی صدیون کے فطری انقلابات
کے بعد کہین پیدا ہوتی ہے، اور غلہ ہر سال اور سال کی ہر فصل مین انسان کی کوشش سے پیدا ہوتا
ہے، اس لئے سونا چاندی کی قیمت کا معیار غلہ سے گران تر ہے، ایک اور بات یہ ہے کہ کاشتکار
اور زمینون کے مالک عموماً دیہاتون مین رہتے اور شہرون سے دور ہوتے ہین، نیز وہ عموماً
سونا چاندی اور سکون سے بھی محروم رہتے ہین اس لئے نسبتہً وہ قومی ضروریات، دین کی مالی
خدمات، اور مستحقین کی امداد مین اس "انفاق" یعنی خیرات کی گرفت سے آزاد رہتے ہین جن کو
عموماً نقد صورت مین دولت کے مالک اور تاجر پورا کیا کرتے ہین، اس بنا پر بھی سخت ضرورت
تھی کہ اُن کے لئے قانونی خیرات کی شرح اہلِ زمین سے مختلف رکھی جائے،

زکوٰۃ کی شرحِ مقدار کی تعیین مین اس خمس والی آیت سے ایک اور نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ
خمس مین چونکہ امامت وحکومت کے تمام ذاتی وقومی مصارف شامل ہین، اس لئے وہ کل
کا خمس یعنی ۱/۵ مقرر ہوا، اور زکوٰۃ کے مصارف جیسا کہ سورۂ توبہ رکوع ۸ مین مذکور ہین، صرف
آٹھ ہین، اس بنا پر آٹھ مصارف کی شرحِ مقدار ۱/۵ کا ۱/۸ حصہ (یعنی ۱/۴۰) مقرر ہوا، یعنی سونا
چاندی کی زکوٰۃ مین ان آٹھ مصرفون کے لیے مجموعی رقم چالیسوان حصہ رکھی گئی، پھر غور کیجئے
کہ سونا چاندی کی شرح ۲۰۰ درم یا اس کے مماثل سونا ہے، ان دوسو درمون کو ۵ پر تقسیم کر دیجئے
تو ۴۰ ہو جائے گا، یہ کل زکوٰۃ کی شرحین ۱/۵ و ۱/۱۰ و ۱/۲۰ و ۱/۴۰ ایک دوسرے کا نصف یا ایک
دوسرے کا مضاعف ہوتی چلی گئی ہین اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ یہ تقسیم وتحدید حساب اور
اقتصادیات کے خاص اصول پر مبنی ہے،

جانورون پر زکوٰۃ توراۃ مین ہر قسم کے جانورون مین دسوان حصہ زکوٰۃ کا تھا[1] لیکن چونکہ ہر قسم کے جانورون مین نسل کی افزایش کی صلاحیت اور مدت افزایش (زمانۂ حمل) یکسان نہین ہوتی، نیز جانورون مین دسوین بیسوین کا حصۂ مشاع ہر تعداد پر چسپان نہین ہوسکتا، اس لئے ان مین دسوین بیسوین کے بجاے تعداد کے تعین کی ضرورت تھی، شریعت محمدیہ نے اس نقص کو پورا کیا، چنانچہ اسی پہلے اصول (پیدایش اور افزایش کی مدت، کیفیت اور کمیت) کی بنا پر اوّلاً بے نسل یا کم نسل کے جانورون کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کردیا، مثلاً خچر، گھوڑے[2]، (یا ہندوستان مین ہاتھی) پر کوئی زکوٰۃ نہین، دوسرے جانورون کی مالیت اور قوت وکیفیت افزایش کے لحاظ سے حسب ذیل شرح معین ہوئی، یہ وہ شرحنامہ ہے جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکمت ربانی سے فیصلہ فرما کر طے کیا، اور زبانی نہین بلکہ فرامین کی صورت مین لکھوا کر عمال کو عنایت فرمایا تھا، اور خلفاے راشدین نے اسی کی نقلین حدودِ حکومت مین بھجوائین، اور جس کی تعمیل آج تک برابر بلا اختلاف ہوتی آئی ہے،

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	ایک سے چار تک	کچھ نہین
”	۵ سے ۹ تک	ایک بکری
”	۱۰ ” ۱۴ ”	دو بکری

[1] احبار ۲۷-۳۲ [2] حنفیہ کے نزدیک خیل تناسل اور تجارت کے گھوڑون میں زکوٰۃ ہے، سواری اور جہاد کے گھوڑون مین نہین،

نام جانور	تعداد	شرحِ زکوٰۃ
اونٹ	۱۵ سے ۱۹ تک	تین بکریان
″	۲۰ ″ ۲۴ ″	چار بکریان
″	۲۵ ″ ۳۵	اونٹ کا ایک سال کا بچہ
″	۳۶ ″ ۴۵ ″	اونٹ کا دو سالہ بچہ،
″	۴۶ ″ ۶۰ ″	تین سال کا اونٹ کا بچہ،
″	۶۱ ″ ۷۵ ″	چار سال کا اونٹ،
″	۷۶ ″ ۹۰ ″	دو سال کے دو بچے،
″	۹۱ ″ ۱۲۰ ″	تین سال کے دو بچے،
″	۱۲۰ کے بعد ہر چالیس پر	دو سال کا ایک بچہ،
″	اور ہر پچاس پر	تین سال کا ایک بچہ
بکری	ایک سے ۳۹ تک	کچھ نہین
″	۴۰ ″ ۱۲۰ ″	ایک بکری
″	۱۲۱ ″ ۲۰۰ ″	دو بکریان
″	۲۰۱ ″ ۳۰۰ ″	تین بکریان
″	پھر ہر سو پر	ایک ایک بکری
گائے، بیل، بھینس	ایک سے ۲۹ تک	کچھ نہین،

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
گائے، بیل، بھینس،	۳۰	ایک، دوسالہ[1] بچھڑا،
〃	۴۰	تین[2] سال کا ایک،
〃	۶۰	دو سال کے دو بچھڑے،
〃	۷۰	ایک تین سال اور ایک دو سال کا
〃	۸۰	تین سال کے دو،
〃	۹۰	دو 〃 〃 تین
〃	۱۰۰	دو سال کے دو اور تین سال کا ایک

غرض اصول یہ ہے کہ ہر تیس بننے والے عدد پر ایک دو سالہ اور ہر چالیس بننے والے عدد پر ایک سہ سالہ،

نصاب مال کی تعیین

شرحِ زکوٰۃ کے تعیین کے سلسلہ مین شرائعِ سابقہ مین ایک اور کمی تھی جسکی تکمیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے کردی جن دوسری شریعتون مین قانونی خیرات کی تعیین ہے، اُن مین امیر وغریب اور کم اور زیادہ دولت والون کی تفریق نہین کی گئی تھی، مثلاً اگر دس بین روپیے والون یا دس پانچ گائے اور بکری والون سے یہ زکوٰۃ وصول کیجاتی، توان پر ظلم ہوتا، توراۃ مین غلہ اور مویشی پر جو عُشر اور نقد پر جو آدھا مثقال مقرر کیا گیا ہے اس مین اس کا لحاظ نہین کیا گیا ہے، بلکہ آدھے مثقال کی زکوٰۃ مین تو یہانتک کہہ دیا گیا ہو کہ

"خداوند کے لئے نذر کرتے وقت آدھے مثقال سے امیر نہ زیادہ دے اور غریب

[1] یعنی جسکا دوسرا سال شروع ہو،
[2] جس کا تیسرا سال شروع ہو، ۱۲

کم نہ دے" (خروج ۳۰ - ۱۵)

لیکن شریعتِ محمدی نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا، اور غریبوں، ناداروں، مقروضوں، اور اُن غلاموں کو جو سرمایہ نہیں رکھتے یا اپنی آزادی کے لئے سرمایہ جمع کر رہے ہیں، اس سے بالکل مستثنیٰ کر دیا، نیز دولت کی کم مقدار رکھنے والوں پر بھی انکی اپنی حسبِ خواہش اخلاقی خیرات کے علاوہ کوئی باقاعدہ زکوٰۃ عائد نہیں کی، اور کم مقدار کی دولت کا معیار بھی اس نے خود مقرر کر دیا، سونے کی زکوٰۃ کو وہی آدھا مثقال رکھا، لیکن بتا دیا کہ یہ آدھا مثقال اسی سے لیا جائیگا جو کم از کم پانچ اوقیہ یعنی بیس[2] مثقال[1] سونے کا مالک ہو، اور ۵ اُوقیہ یعنی ۲۰ مثقال سونے کی متوسط قیمت دو سو درہم چاندی کے سکّے ہیں، یعنی ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہے[2]

وہ کم سے کم معیارِ دولت جس پر زکوٰۃ نہیں حسبِ ذیل ہے۔

نام	اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہیں
غلّہ اور پھل،	پانچ وسق[3] سے کم پر زکوٰۃ نہیں،
اونٹ،	پانچ عدد " " "
گائے، بیل، بھینس،	۳۰ عدد " " "
بھیڑ بکری،	۴۰ عدد " " "
سونا	پانچ اوقیہ (بیس[2] مثقال) سے کم پر زکوٰۃ نہیں

[1] موجودہ انگریزی حساب سے بیس مثقال سونا ساڑھے سات تولے کے، اور دو سو درہم چاندی ۵۲ روپیے کے برابر ہے،
[2] سنن ابی داؤد کتاب الزکوٰۃ باب من یعطی الزکوٰۃ وحد الغنی جلد اول ص ۱۶۲ اصح المطابع لکھنؤ،
[3] ایک وسق وہ بوجھ ہے جس کو عادۃً ایک اونٹ اٹھا سکتا ہو،

نام	اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہین
چاندی	۲۰۰ درم سے کم پر زکوٰۃ نہین

اس معیار سے امیر و غریب کی سطحون مین جو یکسان زکوٰۃ کی ناہمواری تھی وہ دور ہوگئی اور جو غریب خود زکوٰۃ کے مستحق تھے، وہ اس قومی محصول سے بری ہوگئے،

ان مذکورہ بالا اشیاء کی تعداد جنسیت کے اختلاف کی وجہ سے گو مختلف ہے، مگر مالی اعتبار سے وہ ایک ہی معیار پر مبنی ہین، پانچ وسق غلہ، دو سو درم چاندی اور پانچ اوقیہ سونا در حقیقت ایک ہی معیار ہے، ایک اوقیہ جیسا کہ معلوم ہو چکا چالیس درم کے برابر ہے، اس بنا پر پانچ اوقیہ اور دو سو درم برابر ہین، اسی طرح ایک وسق غلہ کی قیمت اس زمانہ مین چالیس درم[1] یا ۴ مثقال تھی، یعنی پانچ اوقیہ اور پانچ وسق کی قیمت وہی دو سو درم یا ۲۰ مثقال ہوگی،

زکوٰۃ کے مصارف اور ان مین اصلاحات

حضرت موسیٰؑ کی شریعت مین تین قسم کی زکوٰۃ تھی، ایک آدھے مثقال سونے چاندی کی یہ رقم جماعت کے خیمہ یا پھر بیت المقدس کی تعمیر و مرمت اور قربانی کے طلائی و نقرئی ظروف و سامان کے بنانے مین خرچ کیجاتی تھی، (خروج ۳۰-۱۳) دوسری خیرات یہ تھی کہ کھیت کاٹتے اور پھل توڑتے وقت حکم تھا کہ جابجا کونون اور گوشون مین کچھ دانے اور پھل چھوڑ دیئے جائین، وہ غریبون اور مسافرون کا حصہ تھا، (احبار ۱۹-۱۰) اور سوم یہ تھی کہ ہر تیسرے سال کے بعد پیداوار اور جانورون کا دسوان حصہ خدا کے نام پر نکالا جائے، اس کے مصارف یہ تھے کہ دینے والا مع اہل و عیال کے بیت المقدس جا کر جشن منائے اور کھائے اور

[1] ہدایہ جلد اول، باب الزکوٰۃ فی التجارۃ ،

کھلائے، اور لاویون مین جو موروثی کاہن اور خدا کے گھر کے خدمت گذار ہین، نام بنام تقسیم کیا جائے (اس کے بدلے مین وہ خاندانی وراثت سے محروم رکھے گئے تھے) اس کے بعد یہ چیزین بیت المقدس کے خزانہ مین جمع کر دیجاتی تھین کہ ان سے مسافرون یتیمون، اور بیواؤن کو کھانا کھلایا جائے، (استثنا ۱۴۔ ۲۶ سے ۲۹ تک)

شریعت محمدیہ نے مذہب کی حقیقت مین سب سے بڑی جو اصلاح کی،

۱۔ وہ عبادت مین خدا اور بندہ کے درمیان سے واسطون کا حذف کرنا تھا، یہان ہر شخص اپنا آپ امام اور کاہن ہے، اس بنا پر مفت خور کاہنون اور عبادت گاہون کے خادمون کی ضرورت ساقط ہوگئی، اور اس لئے زکوٰۃ کا یہ مصرف جو قطعاً بیکار تھا، کلیۃً اڑ گیا،

۲۔ عبادت مین سادگی پیدا کر کے ظاہری رسمون اور نمایشون سے اس کو پاک کر دیا گیا اس لئے سونے چاندی کے سامانون، قربانی کے برتنون، اور محرابون کے طلائی شمعدانون کی ضرورت ہی نہین رہی،

۳۔ حج اُن ہی پر واجب کیا گیا، جن کے پاس زادِ راہ ہو، اس لیے ہر شخص کو خواہ مخواہ بیت اللہ جانے کی حاجت نہ رہی، اور اس لئے یہ رقم بھی خارج ہوگئی،

۴۔ زکوٰۃ کی چیز کو مالک کے ذاتی ضروریات اور کھانے مین صرف ہونے کی ممانعت سے کر دی گئی، کہ اگر وہ مالک ہی کے ضروریات مین خرچ ہوگئی تو اس مین ایثار کیا ہوا،

۵۔ اس طرح وہ تمام سامان اور رقمین جو ان مدون سے بچین غریبون، مسکینون، اور مسافرون وغیرہ کو دے دی گئین،

گذشتہ اصلاحات کے علاوہ شریعتِ محمدیہ نے زکوٰۃ کے سلسلہ مین بعض اور اصلاحین بھی کی ہین، مثلاً

۶۔ شریعتِ سابقہ مین ایک بڑی تنگی یہ تھی کہ زکوٰۃ خود مستحقین کے حوالہ نہین کی جاتی تھی، بلکہ ذخیرہ مین جمع ہو کر اس کا کھانا پک کر غربا مین تقسیم ہوتا تھا لیکن عام انسانی ضرورتین صرف کھانے تک محدود نہین ہین، اس لئے شریعتِ محمدیہ نے اس رسم مین یہ اصلاح کی کہ غلہ یا رقم خود مستحقین کو دیجائے تاکہ وہ جس طرح چاہین اپنی ضروریات مین صرف کرین،

۷۔ ایک بڑی کمی یہ تھی کہ نقد زکوٰۃ جو آدھے مثقال والی تھی، وہ بیت المقدس کے خرچ کے لئے مخصوص تھی، اس کے علاوہ کوئی دوسری نقد زکوٰۃ نہ تھی، شریعتِ محمدیہ نے بیس مثقال کے آدھا مثقال نقد زکوٰۃ فرض کرکے اس کو بھی تمامتر مستحقین کے ہاتھون مین دیدیا،

۸۔ غلہ کی صورت یہ تھی کہ سارے کا سارا بیت المقدس چلا جاتا تھا، اور وہین سے وہ پکوا کر تقسیم کیا جاتا تھا، یہ انتظام بنی اسرائیل کی ایک چھوٹی سی قوم کے لئے تو شاید موزون ہوسکتا ہو، مگر ایک عالمگیر مذہب کے تمام عالم مین منتشر پیروون کے لئے یہ بالکل ناکافی تھا، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ اسی مقام کے مستحقین مین صرف کیجائے،

۹۔ بعض منافقین اور دیہاتی بدوؤن کی یہ حالت تھی کہ وہ اس قسم کے صدقات کی لالچ کرتے تھے، جب تک ان کو امداد ملتی رہتی خوش اور مطمئن رہتے، اور جب نہ ملتی تو طعن و طنز کرنے لگتے، اسلام نے ایسے لوگون کا منھ بند کرنے اور ان کی مفت خوری کی عادتِ بد کی اصلاح کے لئے زکوٰۃ کے جملہ مصارف کی تعیین کردی، اور بتا دیا کہ اس کے مستحق کون کون لوگ

ہین، اور اس رقم سے کس کس کو مدد دیجا سکتی ہے، چنانچہ سورۂ توبہ کے ساتوین رکوع مین اس کا مفصل ذکر ہے،

۱۰- اگر زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین نہ کیجاتی، اور اس کے مستحقین کے اوصاف نہ بتائے جاتے، تو یہ تمام سرمایہ خلفاء اور سلاطین کے ہاتھون مین کھلونا بنجاتا، اور سلطنت کی دوسری آمدنیون کی طرح یہ بھی ان کے عیش و عشرت کے پرتکلف سامانون کے نذر ہوجاتا، اس لئے تاکید کردی گئی، کہ جو غیر مستحق اس کو لے گا، اس کے لئے یہ حرام ہے، اور جو شخص کسی غیر مستحق کو اپنی زکوٰۃ جان بوجھ کر دے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اسی بندش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانون مین زکوٰۃ تا بامکان اب تک صحیح مصارف مین خرچ ہوتی ہے،

۱۱- اس قسم کی مالی رقوم جب کوئی اپنے پیروون پر عائد کرتا ہے، تو اس کی نہایت قوی بدگمانی ہوسکتی، ہے کہ وہ اس طرح اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ایک دائمی آمدنی کا سلسلہ پیدا کرنا چاہتا ہے، حضرت موسیٰؑ کی شریعت مین زکوٰۃ کا مستحق حضرت ہارونؑ اور اُن کی اولاد (بنولاوی) کو ٹھہرایا گیا تھا، کہ وہ خاندانی کاہن مقرر ہوئے تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی بدگمانیون کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا، اور اپنے خاندان کے لیے قیامت تک زکوٰۃ کی ہر مد قطعی طور پر حرام قرار دی،

۱۲- قرآن مجید مین زکوٰۃ کے آٹھ مصارف قرار دیئے گئے،

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ	زکوٰۃ کا مال تو غریبون، مسکینون اور
وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ	زکوٰۃ کے صیغہ مین کام کرنے والون

عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي	اور ان لوگوں کے لئے ہے جن کے دلوں
الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي	کو اسلام کی طرف ملانا ہے، اور گردنوں
سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ	چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں اُن
فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ	میں اور خدا کی راہ میں، اور مسافر کے
عَلِيمٌ حَكِيمٌ	بارہ میں، یہ خدا کی طرف سے ٹھہرایا ہوا
	ہے، اور خدا جاننے والا، حکمت والا ہے
(توبہ ــ ۸)	(اس لئے اس کی یہ تقسیم علم و حکمت پر مبنی ہے)

فقرا میں ان خود دار اور مستور الحال شرفا کو ترجیح دی ہے جو دین اور مسلمانوں کے کسی کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے کوئی نوکری چاکری یا بیوپار نہیں کر سکتے اور حاجتمند ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے، اور اپنی آبرو اور خودداری کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں، چنانچہ فرمایا،

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي	ان مفلسوں کو دینا ہے جو اللہ کی راہ میں اٹک
سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ	رہے ہیں اور زمین میں (روزی حاصل کرنے
ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ	کیلئے) چل پھر نہیں سکتے، ناواقف ان کے
الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ	نہ مانگنے کی وجہ سے انکو بے احتیاج سمجھتے
تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ	ہیں، تم ان کو ان کے چہرے سے پہچانتے
النَّاسَ إِلْحَافًا (بقرہ ۳۷)	ہو کہ وہ حاجتمند ہیں، وہ لوگوں سے لپٹکر

نہیں مانگتے

تمام مستحقین کو درجہ بدرجہ اُن کی اہمیت، اور اپنے تعلق کے لحاظ سے دینا چاہئے چنانچہ سورہ مین فرمایا،

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى	اور جس نے خدا کی محبت پر (یا مال
الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ	کی محبت کے باوجود) قرابت مندون
وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ	یتیمون، مسکینون، مسافرون، مانگنے
وَفِى الرِّقَابِ ۚ	والون، اور (غلامون یا مقروضون
(بقرہ - ۲۲)	کی) گردن چھڑانے مین مال دیا،

اس کے تین چار رکوع کے بعد ہے،

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ	کہو جو تم مال خرچ کرو، وہ اپنے
فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَ	ماں باپ، رشتہ دارون یتیمون
الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ	مسکینون، اور مسافر کے لئے،
السَّبِيْلِ، (بقرہ - ۲۶)	

ضرورتمندون مین ترجیح

اسلام سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرابت مندون اور رشتہ دارون کے دینے سے، اجنبی، بیگانہ اور بے تعلق لوگون کو دینا زیادہ ثواب کا کام ہے، اور اس کی وجہ یہ سمجھی جاتی تھی کہ اپنے لوگون کے دینے مین کچھ نہ کچھ نفسانیت کا، اور ایک حیثیت سے خود غرضی کا شائبہ ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے ہی رشتہ دار ہین اور اُنکا نفع ونقصان اپنا ہی نفع ونقصان ہے لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کا اخلاقی مغالطہ اور فریب تھا، ایک انسان

پر دوسرے انسان کے جو حقوق ہین وہ تمامتر تعلقات کی کمی وبیشی پر مبنی ہین، جو جتنا قریب ہے، اتنا ہی زیادہ آپکے حقوق اُس پر اور اس کے حقوق آپ پر ہین، اگر یہ نہ ہو تو رشتہ داری اور قرابتمندی کے فطری تعلقات بالکل لغو اور مہمل ہو جائین، انسان پر سب سے پہلے اس کا اپنا حق ہے، پھر اہل و عیال کا، اُن کے جائز حقوق ادا کرنے کے بعد اگر سال مین کچھ بچ رہے، تو اس مین حصہ پانے کے سب سے زیادہ مستحق قرابتدار ہین، چنانچہ وراثت اور ترکہ کی تقسیم مین اسی اصول کی رعایت کیگئی ہے،

یہ سمجھنا بھی کہ اگر قرابت دارون کو ترجیح دیجائے، تو دوسرے غریبون کا حق کون ادا کرے گا، ایک قسم کا مغالطہ ہے، دنیا مین ہر انسان کسی نہ کسی کا رشتہ دار ضرور ہے، اس بنا پر اگر ہر شخص اپنے رشتہ دارون کی خبر گیری کرے تو کل انسانون کی خبر گیری ہو جائے گی، اس کے علاوہ اس مقام پر ایک اور غلط فہمی بھی ہے جس کو دور ہو جانا چاہئے، مستحقین مین باہم ایک کو دوسرے پر جو فوقیت ہے، اس کا مدار دو چیزون پر ہے، ایک تو دینے والون سے ان اشخاص کے قرب و بعد کی نسبت، دوسرے ان اشخاص کی حاجتون اور ضرورتون کی کمی وبیشی، قرابتمندون کی ترجیح کے یہ معنی نہین ہین کہ خواہ ان کی ضرورت کتنی ہی کم اور معمولی ہو ان کو اُن لوگون پر ترجیح ہے جن کی ضرورت، اور حاجتمندی ان سے کہین زیادہ ہے، بلکہ مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ اگر دو ضرورتمند برابر کے حاجتمند ہون اور ان مین سے ایک آپ کا عزیز یا دوست یا ہمسایہ ہو تو وہ آپ کی امداد کا زیادہ مستحق ہوگا، یعنی ضرورت اور حاجت کی مساوات کے بعد تعلقات کی کمی وبیشی ترجیح کا دوسرا سبب بنے گی، نہ کہ پہلا سبب ؟ اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ ایسی حالت مین وہ اپنے عزیزون اور دوستون کو ترجیح دے،

فقراء اور مساکین میں سے ان لوگوں پر جو بیحیائی کے ساتھ دربدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں، ان کو ترجیح دی گئی ہے جو فقروفاقہ کی ہر قسم کی تکلیف گوارا کرتے ہیں لیکن اپنی عزت و آبرو اور خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، اور لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے ہیں، یہ تعلیم خود قرآن پاک نے دی ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، آپ نے فرمایا "مسکین وہ نہیں ہے جس کو ایک دو لقمے دربدر پھرایا کرتے ہیں" صحابہ نے دریافت کیا پھر کون مسکین ہے، ارشاد ہوا "وہ جس کو حاجت ہو لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا، اور وہ کسی سے مانگتا نہیں۔"[1]

اس تعلیم کے دو مقصد ہیں ایک تو یہ کہ ان بھیک مانگنے والوں کو تو کوئی نہ کوئی دے ہی دیگا، اور وہ کہیں نہ کہیں سے پا ہی جائیں گے، اس لئے ان کی طرف اس قدر اعتنا ضروری نہیں، اصلی توجہ ان مستورالحال مسکینوں کی طرف ہونی چاہیئے جو صبر و قناعت کے ساتھ فقروفاقہ کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں، کہ ان کی خبر بہتوں کو نہیں ہو سکتی، اور اکثر وہ امداد سے محروم رہجاتے ہیں، دوسرا مقصد یہ ہے کہ شریعت اپنی تعلیم اور عمل سے یہ ثابت کر دے، کہ بے حیا گداگروں کی عزت اس کی نگاہ میں نہایت کم ہے، اور وہ ہر حال میں اس بیحیائی کو ناپسند کرتی ہے،

شریعت نے مصارف زکوٰۃ کی تعیین و تحدید اس غرض سے بھی کی ہے تاکہ ہر شخص کو مانگنے کی ہمت نہ ہو، اور ہر کس و ناکس اس کو اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ نہ سمجھ لے، جیسا کہ بعض منافقین اور اہل بادیہ نے اس کو اپنے ایمان و اسلام کی قیمت سمجھ رکھا تھا، چنانچہ وحی الٰہی نے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب المسکین الذی لا یجد غنی ولا یفطن لہ فیتصدق علیہ،

ان کی پردہ دری، ان الفاظ مین کی،

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ
فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ
لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ
وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ
وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ
سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ
رَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ
اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ
الْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا
وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ
وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ
اللّٰهِ ط ۔

اور بعض ان مین سے ایسے ہین جو تجھ کو
(پیغمبر کو) زکوٰۃ بانٹنے مین طعن دیتے ہین
اگر ان کو اس مین سے ملے تو راضی ہون
اور اگر نہ ملے تو وہ ناخوش ہو جائین اور
کیا خوب تھا اگر وہ اس پر راضی رہتے
جو خدا اور اس کے رسول نے ان کو دیا
اور کہتے کہ ہم کو اللہ بس ہے، ہم کو اللہ
اپنی مہربانی سے اور اس کا رسول دے
رہین گے، ہم کو تو خدا ہی چاہئے، زکوٰۃ
تو حق ہے غریبون کا، مسکینون کا، اور اسکا
کام کرنے والون کا، اور ان کا جن کا
دل (اسلام کی طرف) پرچانا ہے، اور
گردن چھڑانے مین، اور خدا کی راہ مین
اور مسافر مین، یہ حصے خدا کی طرف سے
ٹھہرائے ہوئے ہین،

(توبہ - ۷ و ۸)

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے زکوٰۃ کے مال مین سے کچھ پانے کی

درخواست کی، آپ نے فرمایا "اے شخص! اللہ تعالیٰ نے مالِ زکوٰۃ کی تقسیم میں کسی انسان کو بلکہ پیغمبر تک کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے، بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، اور اس کے آٹھ مصرف بیان کر دیئے ہیں، اگر تم ان آٹھ میں ہو تو میں تم کو دے سکتا ہوں[1]"

اسلام میں زکوٰۃ کے مصارفِ ہشتگانہ

یہ آٹھوں مصارف نیکی، بھلائی اور خیر و فلاح کی ہر قسم اور ہر صنف کو محیط ہیں، فقراء اور مساکین میں وہ تمام اہلِ حاجت داخل ہیں جو اپنی محنت و کوشش سے اپنی روزی کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، جیسے بوڑھے، بیمار، اندھے، لولے لنگڑے مفلوج، کوڑھی، یا وہ محنت کر سکتے ہیں، لیکن موجودہ حالت میں دین و ملت کی کسی ایسی ضروری خدمت میں مصروف ہیں، کہ وہ اپنی روزی کمانے کی فرصت نہیں پاتے، جیسے مبلغین مذہبی معلمین، بالغ طالب العلم، جو لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ میں اسی طرح داخل ہیں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں اصحابِ صفہ داخل تھے، اور وہ کم نصیب بھی داخل ہیں جو اپنی پوری محنت اور کوشش کے باوجود اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے سے اب تک قاصر رہے ہیں، اور فاقہ کرتے ہیں،

وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا، یعنی امام کی طرف سے صدقہ کی تحصیل وصول کا کام کرنے والے بھی اس میں سے اپنے کام کی اجرت پا سکتے ہیں، اور وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ (جن کی تالیفِ قلوب کی جائے) میں وہ لوگ داخل ہیں، جنکو ابھی اسلام کی طرف مائل کرنا ہے، یا جن کو اسلام پر مضبوط کرنا ہے، وَفِي الرِّقَابِ (گردن کے چھڑانے میں) اس سے مقصود وہ غلام ہیں، جن کی گردنیں دوسروں

[1] ابو داؤد، کتاب الزکوٰۃ باب من یعطی الصدقۃ وحد الغنی،

کے قبضہ میں ہیں، اور اُن کو خرید کر آزاد کرنا ہے، اور وہ مقروض ہیں، جو اپنا قرض آپ کسی طرح ادا نہیں کر سکتے، وَالْغَارِمِیْنَ (تاوان اٹھانے والوں) سے مراد وہ نیک لوگ ہیں جنھوں نے دوسرے لوگوں اور قبیلوں میں مصالحت کرانے کے لئے کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے، یہ مالی ضمانت ایک قومی نظام کی حیثیت سے زکوٰۃ کے بیت المال سے ادا کیجا سکتی ہے، وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (خدا کی راہ میں) ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے نیک کاموں کو شامل ہے، اور حسبِ ضرورت کبھی اس سے مذہبی لڑائی، یا سفرِ حج، یا اور دوسرے نیک کام مراد لئے جا سکتے ہیں، اور وَابْنِ السَّبِیْلِ (مسافر) میں مسافروں کی ذاتی مدد کے علاوہ مسافروں کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری مثلاً راستوں کی درستی، پلوں اور مسافرخانوں کی تعمیر بھی داخل ہو سکتی ہے، یہ ہیں زکوٰۃ کے وہ آٹھ مقررہ مصارف جن میں اسلام نے اس قومی و مذہبی رقم کو خرچ کرنے کی تاکید کی ہے،

مسکینوں، فقیروں اور معذوروں کی امداد

زکوٰۃ کا سب سے اہم مصرف یہ ہے کہ اس سے لنگڑے، لولے، اندھے، بوڑھے، کوڑھی، مفلوج اور دوسرے معذور لوگوں کی امداد کیجائے، نادار یتیموں، بیواؤں اور اُن لوگوں کی خبرگیری کیجائے جو اپنی کوشش اور جدّوجہد کے باوجود روزی کا سامان

---

[1] اکثر فقہا نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے، مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی، ابھی آیت گذر چکی لِلْفُقَرَاءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یہاں فی سبیل اللہ سے بالاتفاق صرف جہاد نہیں، بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے، اکثر فقہا نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملکیت بنانا ضروری ہے، مگر ان کا استدلال جو لِلْفُقَرَاءِ کے لام تملیک پر مبنی ہے بہت کچھ مشتبہ ہے، ہو سکتا ہے کہ لام انتفاع ہو، جیسے خَلَقَ لَکُمْ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا،

[2] کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، باب الصدقات،

نہین کرپاتے، یہ زکوٰۃ کا وہ مصرف ہے جو تقریباً ہر قوم مین اور ہر مذہب مین ضروری خیال کیا گیا ہے اور ان مستحقین کی یہ قابلِ افسوس حالت خود کسی مزید تشریح کی محتاج نہین لیکن اسلام نے ان کے علاوہ زکوٰۃ کے چند اور ایسے مصارف مقرر کئے ہین جن کی اہمیت کو خاص طور سے صرف اسلام ہی نے محسوس کیا ہے،

غلامی کا انسداد غلامی انسان کے قدیم تمدن کی سب سے بوجھل زنجیر تھی، یہ زنجیر انسانیت کی نازک گردن سے صرف اسلام نے کاٹ کر الگ کی، غلامون کے آزاد کرنے کے فضائل بتائے، ان کے ساتھ نیکی، احسان اور حسنِ سلوک کی تاکید کی، اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ زکوٰۃ کی آمدنی کا ایک خاص حصہ اس کے لئے نامزد فرمایا، کہ اس سے غلامون کو خرید کر آزاد کیا جائے لیکن چونکہ غلامون کو آزاد کرنے کی پوری قیمت یا اس کی آزادی کا پورا زرِ فدیہ ہر ایک شخص برداشت نہین کرسکتا تھا، اسلئے زکوٰۃ کی مجموعی رقم سے اجتماعی طور سے اس قرض کو ادا کرنے کی صورت تجویز کی، انسانون کے اس درماندہ طبقہ پر یہ اتنا بڑا عظیم الشان احسان کیا گیا ہے کہ جس کی نظیر دنیا کے محسنین کی فہرست مین نظر نہین آسکتی، پیغمبرِ اسلام علیہ السّلام کی شریعت نے صرف اس لئے کہ انسانون کے اس واجب الرحم فرقہ کو اپنی کھوئی ہوئی آزادی واپس ملے اپنی امت پر ایک دائمی رقم واجب ٹھہرا دی کہ اس کے ذریعہ سے نیکی کے اس سلسلہ کو اُس وقت تک قائم رکھا جائے جب تک دنیا کے تمام غلام آزاد نہ ہوجائین، یا اس رسم کا دنیا کی تمام قومون سے خاتمہ نہ ہوجائے،

مسافر گذشتہ زمانہ مین سفر کی مشکلات اور دقتون کو پیشِ نظر رکھ کر یہ بآسانی سمجھ مین آسکتا ہے کہ مسافرون کی امداد اور اُن کے لئے سفر کے وسائل و ذرائع کی آسانی کی کتنی ضرورت تھی

صحرا اور بیابان جنگل اور میدان آبادی اور ویرانی، ہر جگہ آنے جانے والون کا تانتا لگا رہتا تھا، اور اب تک یہ سلسلہ قائم ہے، یہ وہ ہین جو اپنے اہل وعیال عزیز و قریب، دوست و احباب، مال و دولت سے الگ ہو کر اتفاقات اور حوادث کے سیلاب سے بہہ کر کہان سے کہان نکل جاتے ہین اُن کے پاس کھانے کے لئے کھانا پینے کے لئے پانی، سونے کے لئے بستر، اوڑھنے کے لئے چادر نہین ہوتی، اور یہ حالت ہر انسان کو کسی نہ کسی وقت پیش آجاتی ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ ان کے آرام و آسایش کا سامان کیا جائے، اسی اصول پر سرائین، کنوین، مسافرخانے پہلے بھی بنوائے جاتے تھے، اور اب بھی بنوائے جاتے ہین،

آپ کہہ سکتے ہین کہ اب اس اسٹیم اور بجلی کے عہد مین یہ تمام مشکلین افسانۂ کہن اور داستان پارینہ ہوگئی ہین، اب ہر جگہ اچھے سے اچھے ہوٹل، تیز سے تیز سواریان، بڑے سے بڑے بینک اور آمد و رفت کا سامان کرنے والی کمپنیان قائم ہوگئی ہین، اور سفر و حضر مین کوئی فرق نہین رہا ہے، مگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہوا ہے یہ صرف دولتمندون اور سرمایہ دارون کی راحت و آسایش کے لئے ہوا ہے، اور ان کے ان نئے طریقون نے پرانے طریقون کے پرانے آثار کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ہے، آج متمدن دنیا کے بڑے سے بڑے پر رونق شہرون سے لیکر معمولی دیہاتون تک مین جہان امیر اور دولتمند مسافرون کے لئے قدم قدم پر ہوٹل، ریسٹران، قہوہ خانے اور آرام خانے موجود ہین، وہان اس پورے مسیحی ملک مین حضرت مسیحؑ کی طرح ایک غریب مسافر کیلئے کہین سر رکھنے کی جگہ نہین کسی کی جیب مین جب تک کسی بینک کا نوٹ اور چک نہین اس کے لئے ہوٹلون اور اقامت خانون کے تمام دروازے بند ہین، کیا یہ انسانیت کے لئے رحم ہے؟

کیا یہ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی ہے؟ لیکن ان تمام ملکون کے طول وعرض مین جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامون کے قبضہ مین آئے، سراؤن، مسافر خانون، کنوون اور مہمان خانون کا وہ وسیع سلسلہ قائم ہو گیا کہ ایک غریب مسلمان سپین کے کنارہ سے چل کر کاشغر کے ایک گاؤن مین بہ آرام وآسایش پہنچ جاتا تھا، اور ہندوستان کے اس سرے سے روم کے اس سرے تک اھلاً باھلٍ واوطاناً باوطانٍ کہتا ہوا بے خطر چلا جاتا تھا، اور آج بھی اس نظام کی بدولت اُن اسلامی ملکون مین جو ابھی یورپ کے سرمایہ دارانہ طور وطریق سے واقف نہین ہین، غریب مسافرون کو وہی آرام وآسایش حاصل ہے، اور امرا، اور دولتمندون کے لئے گیا کہنا کہ ایک پرانے جہان گرد سیاح بزرگ (سعدی) کے مقولہ کے مطابق،

منعم بکوہ ودشت وبیابان غریب نیست ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

جماعتی کامون کے اخراجات کی صورت

جب تک منتشر افراد ایک شیرازہ مین نہین بندھ جاتے حقیقت مین جماعت کا وجود نہین ہوتا، لیکن جماعت کے وجود کے ساتھ ہی افراد کی طرح جماعت کو بھی ضروریات پیش آتی ہین، جماعت کے کمزورون، معذورون، اور مفلسون کی مدد، جماعت اور اس کے اصول کی حفاظت کے لئے سرفروشانہ مجاہدہ کی صورت مین اسکے اخراجات کی کفالت، جماعت کی آمد ورفت اور سفر کے وسائل کی ترقی وتعمیر، جماعت کی خاطر جماعت کے مالی نقصان اٹھانے والون، اور مقروضون کی امداد کرنا، جماعت کے اُن کارکنون کو معاوضہ دینا، جو جماعت کی مذہبی، علمی، تعلیمی خدمات بجا لائین، اور اس رقم کی فراہمی اور نظم ونسق کے فرائض انجام دین، زکوٰۃ اسی نظام جماعت کا سرمایۂ دولت ہے،

زکوٰۃ کے مقاصد، فوائد اور اصلاحات

زکوٰۃ کا اصلی اور مرکزی مقصد وہی ہے جو خود لفظ "زکوٰۃ" کے اندر ہے، "زکوٰۃ" کے لفظی معنی "پاکی" اور "صفائی" کے ہیں یعنی گناہ اور دوسری روحانی قلبی اور اخلاقی برائیوں سے پاک و صاف ہونا، قرآنِ پاک میں یہ لفظ اسی معنی میں بار بار آیا ہے، سورۂ والشمس میں ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (شمس-۱)	مراد پایا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک و صاف کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو میلا اور گندہ کیا،

ایک اور سورہ میں ہے،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى، (اعلیٰ-۱)	مراد پایا وہ جو پاک و صاف ہوا،

یہ تزکیہ اور پاکی وصفائی نبوت کی اُن تین عظیم الشان خصوصیتوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر قرآنِ پاک کی تین چار آیتوں میں ہے،

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (بقرہ ۱۵ و جمعہ-۱)	وہ نبی خدا کی آیتیں پڑھ کر اُن کو سناتا ہے، اور اُن کو گناہوں سے پاک و صاف کرتا ہے، اور اُن کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے،

تزکیۂ نفس

ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ زکوٰۃ اور تزکیہ یعنی پاکی وصفائی کی اہمیت اسلام اور شریعتِ محمدی میں کتنی ہے؟ یہ دل کی پاکی، روح کی صفائی اور نفس کی طہارت مذہب کی اصل غایت اور نبوتوں کا اصل مقصد ہے، انسانوں کی روحانی و نفسانی بیماریوں کے بڑے

حصہ کا سبب تو خدا سے خوف و رجا، اور تعلّق و محبت کا نہ ہونا ہے، اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے، لیکن دوسرا سبب ماسوی اللہ کی محبت، اور مال و دولت اور دیگر اسبابِ دنیا سے دل کا تعلّق ہے، زکوٰۃ اسی دوسری بیماری کا علاج ہے، غزوۂ تبوک کے موقع پر جب بعض صحابہؓ سے باغ وبستان کی محبت کے سبب سے جو ان کی دولت تھی، غزوہ مین عدم شرکت کا جرم صادر ہوا ہے، اور پھر ان کی صداقت اور سچائی کے باعث خدا نے ان کو معاف کیا تو وہان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو خطاب کر کے قرآنِ پاک مین ارشاد ہے،

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً — ان کے مالون مین سے زکوٰۃ لے کر انکو

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا، (توبہ ۱۳) — پاک وصاف بنا،

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اپنے محبوب مال مین سے کچھ نہ کچھ خدا کی راہ مین دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا زنگ جس کا نام محبتِ مال ہے دل سے دور ہو جاتا ہے، بخل کی بیماری کا اس سے علاج ہو جاتا ہے، مال کی حرص بھی کم ہو جاتی ہے، دوسرون کیساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے شخصی خود غرضی کی بجائے جماعتی اغراض کے لئے اپنے اوپر ایثار کرنا انسان سیکھتا ہے، اور یہی وہ دیوارین ہین جن پر تہذیبِ نفس اور حسنِ خلق کی عمارت قائم اور جماعتی زندگی کا نظام مبنی ہے،

قرآنِ مجید مین سود اور صدقہ مین جو حدِّ فاصل قرار دی گئی ہے، وہ یہ ہے،

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ، (بقرہ ۳۸) — خدا سود کو گھٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے،

لیکن اس کا یہ مطلب نہین کہ درحقیقت سود مین نقصان اور صدقہ کے مال مین اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ مشاہدہ بالکل برعکس ہے، بلکہ اُخروی ثواب و گناہ اور برکت و بے برکتی کے فرق کے علاوہ اصلی مقصد اس سے یہ ہے کہ سود گو شخصی دولت مین اضافہ کرتا ہے لیکن جماعتی دولت کو برباد کر دیتا ہے جس سے پوری قوم مفلس ہو جاتی ہے، اور آخر وہ شخص بھی تباہ ہو جاتا ہے اور قومی صدقہ و عطا سے قوم کے نہ کمانے والے افراد کی امداد ہو کر قومی دولت کا معتدل نظام باقی رہتا ہے، اور ساری قوم خوشی اور برکت کی زندگی بسر کرتی ہے، اگر سود دینے والا کبھی اتفاقی مالی خطرہ مین پڑ جاتا ہے، تو اس کی مدد کے لئے جماعت ایک اُنگلی تک نہین ہلاتی لیکن صدقہ دینے والے کی امداد کے لئے پوری قوم کھڑی ہو جاتی ہے،

ایک اور بات یہ ہے کہ سود خوار اس قدر حریص اور طمّاع ہو جاتے ہین کہ ان کو مال کی کثیر مقدار بھی کم نظر آتی ہے، اور جو لوگ صدقہ اور زکوٰۃ دینے کے خوگر ہوتے ہین وہ اس قدر مستغنی اور قانع ہو جاتے ہین کہ اُن کے لئے تھوڑا مال بھی کافی ہوتا ہے، سود خوار اپنے مال کے اضافہ اور ترقی کی حرص مین اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ جس تلوار سے دوسرون کو قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ کرتا ہے، آخر اسی تلوار سے دوسرا اس کو قتل کر کے اس کے تمام اصل و منافع پر بیک دفعہ قبضہ کر لیتا ہے لیکن صدقہ و خیرات دینے والا جو دوسرون کی دولت ناجائز طریق سے نہین لوٹتا، بلکہ خود دوسرون کو اپنے مال سے دیتا ہے، اور سلامت روی کے ساتھ اپنے کاروبار کو چلاتا ہے، اس کو کوئی دوسرا بھی نہین لوٹتا، وہ اپنے سرمایہ اور قلیل منافع کو محفوظ رکھتا ہے، دنیا کے بڑے بڑے تجارتی شہرون کی منڈیان اور کوٹھیان اس عبرت انگیز واقعہ کی

پوری تصویر ہین، اور یہ ہر روز کا مشاہدہ ہے، پھر ظاہر ہے کہ استغنا اور قناعت ایسی چیز ہے جو تمام اخلاقی محاسن کا سنگِ بنیاد ہے، بلکہ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نہایت بلیغ و حکیمانہ طریق سے یہ ارشاد فرمایا کہ لیس الغنیٰ من کثرۃ العرض ولکن الغنی غنی النفس[1]، تونگری دولت کی کثرت کا نام نہین ہو، بلکہ دل کی بے نیازی کا نام ہے، اسی حدیث کا ترجمہ سعدی نے ان لفظون مین کیا ہے "تو انگری بدل ست نہ بمال" دوسرے لفظون مین یون کہو، کہ دولت آمدنی کی زیادتی کا نام نہین، بلکہ ضروریات کی کمی کا نام ہے لیکن یہ غیر فانی دولت حرص و طمع سے نہین، بلکہ صبر و قناعت کے بدولت حاصل ہوتی ہے، اس بنا پر کیا کسی کو زکوٰۃ وصدقہ کے مطہّر، مزکّی، اور مصلحِ اخلاق ہونے مین شبہہ ہوسکتا ہے؟

سودخوار کو دوسرون کے لوٹنے سے اتنی فرصت کہان ملتی ہے، کہ وہ دوسرون کی مدد کا فرض ادا کرے، وہ تو ہمیشہ اس تاک مین رہتا ہے کہ دوسرے مصیبتون اور دقتون مین پھنسین اور وہ اُن کی اس حالت سے فائدہ اٹھائے، لیکن جو زکوٰۃ ادا کرتے ہین، وہ ہمیشہ قابلِ ہمدردی اشخاص کی ٹوہ مین لگے رہتے ہین تاکہ وہ اپنے مال و دولت سے اس کی مدد کرکے اس کے زخمِ دل پر مرہم رکھ سکین،

باہمی اعانت کی عملی تدبیر زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف کا بڑا حصہ غریبون اور حاجتمندون کی امداد ہے، انسانیت کا یہ وہ طبقہ ہی جس کے ساتھ تمام مذہبون نے ہمدردی کی ہے، اور اس کی تسلّی اور تسکین کے لئے دوسری دنیا کی توقع اور امید کے بڑے بڑے خوش آیند الفاظ استعمال کیے ہین، لیکن یہ

---

[1] بخاری کتاب الرقاق باب الغنی غنی النفس،

سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی زندگی کی یہ تلخی محض اہلِ مذاہب کی شیرین کلامی سے دور نہین ہوسکتی محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم دنیا کے پہلے اور وہی پچھلے پیغمبر ہین جنھون نے اس طبقہ کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دیا، اور اس کی تکلیفون اور مصیبتون کو کم کرنے کے لئے عملی تدبیر جاری اور نافذ فرمائی، خود اپنی زندگی غریبون اور مسکینون کی صورت سے بسر کی اور دعا فرمائی کہ "خداوندا! مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینون ہی کے زمرہ مین میرا حشر کر" آپ کے گھر کا چبوترہ (صفّہ) غریبون اور مسکینون کی پناہ کا سایہ تھا، وہی آپ کی بزمِ قدس کے مقرب درباری، اور اسلام کے معرکون کے مخلص جانباز تھے آپ کی نظر مین کسی انسان کی غربت اور تنگدستی اس کی ذلت اور رسوائی کے ہم معنی نہ تھی نہ دولت و امارت عزت و وقار کے مرادف تھی، بلکہ صرف نیکی اور پرہیزگاری فضیلت و بزرگی کا اصلی معیار تھی، حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ "مبارک ہین وہ جو دل کے غریب ہین، کیونکہ آسمان کی بادشاہت اُنھی کی ہے[1]" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زیادہ اختصار و ایجاز کے ساتھ اس مطلب کو ادا فرمایا،

ان المکثرین ھم المقلون[2]، جو دولتمند ہین وہی غریب ہین،

اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ جو غریب ہین وہی دولتمند ہون گے،

پھر انھین خوشخبری دی کہ غریب (جن کو خدا کے آگے اپنی کسی دولت کا حساب نہین دینا ہے) دولت والون سے ۴۰ سال پہلے جنت مین داخل ہونگے[3]،

---

[1] متی ۵-۳ [2] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب المکثرون ہم المقلون، [3] جامع ترمذی کتاب الزہد باب ماجاء ان فقراء المہاجرین یدخلون الجنۃ قبل اغنیاءھم،

اسلام نے ان روحانی تسلیون اور بشارتون کے ساتھ جو مزید کام کیا، وہ ان کی دنیاوی تکلیفون اور مصیبتون کو کم کرنے کی عملی تدبیرین ہین، جنکا نام صدقہ اور زکوٰۃ ہے۔ اس کی تعلیم نے اس عملی ہمدردی اور اعانت کو صرف اخلاقی ترغیب و تشویق تک محدود نہین رکھا، بلکہ اس لئے دو قسم کی تدبیرین اختیار کین، ایک یہ کہ ہر مسلمان کو نصیحت کی جس سے جتنا ہو اپنی دولت سے ان کی مدد کرے، یہ اخلاقی خیرات ہے، جس کا نام قرآن کی اصطلاح مین "انفاق" ہے، لیکن چونکہ یہ اخلاقی خیرات ہر شخص کو اس ضروری نیکی پر مجبور نہین کرتی اس لئے ایک مقدار معین کے مالک پر ایک ایسا قانونی محصول عائد کیا جس کا سالانہ ادا کرنا اس کا مذہبی فرض ہے، اور اس مجموعی رقم کا بڑا حصہ غریبون اور محتاجون کی امداد و اعانت کے لئے مخصوص کیا، اور رسول اللہ صلعم نے اپنی اس تعلیم کو ایک ناقابلِ تغیر دستور العمل کے طور پر اپنی امت کو ہمیشہ کے لیے سپرد فرمایا، چنانچہ آپ نے معاذ بن جبلؓ کو اپنا نائب بنا کر یمن بھیجا، تو توحید اور نماز کے بعد جس چیز کا حکم دیا وہ یہی زکوٰۃ ہے، پھر اس کی نسبت ان کو یہ ہدایت فرمائی، کہ

توخذ من اغنیاء ھم وترد	وہ ان کے دولتمندون سے لے کر
علی فقرا یھم[1]،	ان کے غریبون کو لوٹا دیا جائے،

صحابہؓ نے آپ کی ہدایت کے بموجب ان دونون قسمون کی خیراتون پر اس شدت سے عمل کیا کہ جو استطاعت نہ بھی رکھتے تھے، وہ بازار جا کر مزدوری کرتے تھے، تاکہ جو رقم ہاتھ آئے وہ غریب و معذور بھائیون کی اخلاقی اعانت مین خرچ کرین، اور اس معاملہ مین خود آپ نے

[1] صحیح بخاری، جلد دوم صفحہ ۱۰۹۶ کتاب الرد علی الجہمیہ

یہان تک اس طبقہ کی دلجوئی کی کہ فرمایا "اگر کسی کے پاس کچھ اور نہ ہو تو لطف و مہربانی سے بات ہی کرنا اس کا صدقہ ہے"! اس سے زیادہ یہ کہ اس کی بھی ممانعت کی گئی کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو سختی سے واپس نہ کیا کرو، خدا نے تعلیم دی،

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (ضحیٰ-۱)

تو یتیم کو دبایا نہ کر اور نہ مانگنے والے کو جھڑک،

ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ اگر تم کسی حاجتمند کی مدد کرو تو اس پر احسان مت دھرو، کہ وہ شرمندہ ہو، بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو یہ نعمت دی اور اس کی توفیق عنایت کی، احسان دھرنے سے وہ نیکی کا پیالہ حباب کی طرح ٹوٹ کر بیٹھ جائیگا، فرمایا،

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى، (بقرہ-۳۶)

تم اپنی خیرات کو احسان دھر کر یا طعنہ دے کر برباد نہ کرو،

اس لطف، اس مدارات، اور اس دلجوئی کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے حکم سے انسانیت کے قابلِ رحم طبقہ کی چارہ نوازی فرمائی، اور ہم کو باہمی انسانی محبت اور ایک دوسرے کی مدد کا سبق پڑھایا، اگر یہ حکم صرف اخلاقی حیثیت سے یا صرف مبہم طریقہ سے ہوتا، یا سب کو سب کچھ دے ڈالنے کا عام حکم دے دیا جاتا، تو کبھی اس پر اس خوبی، اس نظام اور اس پابندی کے ساتھ عمل نہ ہو سکتا، اور آج بھی مسلمانون کے سامنے یہ راہ کھلی ہوئی ہے، اور کچھ نہ کچھ ہر جگہ اس پر عمل بھی ہے یہی سبب ہے کہ مسلمانون مین اگر امیر کم ہین تو ویسے غریب و محتاج بھی کم ہین جیسے دوسری قومون مین نظر آتے ہین، تاہم افسوس ہے کہ ایک مدت سے

مسلمانون کا یہ نظام سخت ابتری کی حالت مین ہے، اور اس کی تنظیم کی طرف سے غفلت برتی جارہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ہر قسم کا جماعتی کام منتشر و پراگندہ ہے،

دولتمندی کی بیماریون کا علاج

دولتمندی اور تمول کا مسئلہ ہمیشہ سے دنیا کے مذاہب مین ایک معرکۃ الآرا بحث کی حیثیت سے چلا آرہا تھا، یہودیت کی طرح بعض ایسے مذہب ہین جن مین نہ تو دولتمندی کی کوئی تحقیر کی گئی، اور نہ مفلسی و غربت کو سراہا گیا ہے، بلکہ گویا اس بحث کو نامنفصل چھوڑ دیا گیا ہے لیکن عیسائیت اور بودھ مت، دو ایسے مذہب ہین جنمین دولت کی پوری تحقیر کی گئی ہے، عیسائیت کی نظر مین دولتمندی اور تمول، نجات کی راہ کا کانٹا ہے، بلکہ کوئی انسان اُس وقت تک نجات نہین پاسکتا جب تک وہ سب کچھ جو اس کے پاس ہے خدا کی راہ مین لٹا نہ دے، انجیل مین ہے کہ ایک نیکوکار دولتمند نے حضرت عیسیٰؑ سے نجات کا طریقہ دریافت کیا تو جواب مین فرمایا،

"اگر تو کامل ہوا چاہتا ہے تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے بیچ ڈال، اور محتاجون کو دے، کہ تجھے آسمان پر خزانہ ملیگا، تب آکے میرے پیچھے ہولے"

وہ دولتمند یہ تعلیم سُن کر غمگین ہو کر چلا گیا، تب انجیل مین ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا،

"مین تم سے سچ کہتا ہون کہ دولتمند کا آسمان کی بادشاہت مین داخل ہونا مشکل ہے بلکہ مین تم سے کہتا ہون کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے گذر جانا اس سے آسان ہے، کہ دولتمند خدا کی بادشاہت مین داخل ہو" (متی ۱۹-۲۱-۲۴)

بودھ مت نے نیک لوگون کو ترکِ دنیا کی تلقین کی ہے، اور ہر قسم کی دولت سے پاک

رہنے کی ہدایت کی ہے، اور ایسے لوگون کے لئے یہ سامان کیا ہے کہ جب وہ بھوکے ہون تو بھیک کا پیالہ لے کر لوگون کے دروازون پر کھڑے ہو جائین لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونون طریقون کو ناپسند فرمایا، اصل یہ ہے کہ اگر دولت ایسی بری چیز ہے تو اُس برائی کو دوسرون کی طرف منتقل کر دینا، اُن کی خیرخواہی نہ ہوئی، دشمنی ہوئی، اور اگر غربت کوئی برائی کی چیز ہے تو سب کچھ دوسرون کو دے کر خود اسی حال مین بنجانا کہان کی دانشمندی اور اصلاح ہے، اسلئے یہ طریقہ ہر شخص کے لئے یکسان مفید نہین ہے، نہ نفسِ دولت فرشتہ کو شیطان اور نہ نفسِ غربت شیطان کو فرشتہ بناتی ہے، جس طرح دولتمندی دنیا مین ہزارون سیہ کاریون کی محرک ہے، اسی طرح غربت بھی دنیا کے ہزارون جرائم کا باعث ہے، اور ان دونون خرابیون سے انسانون کا بچانا ایک نبوتِ عظمیٰ کا فرض تھا، دولت بہ حیثیت دولت، اور غربت بہ حیثیت غربت نیک و بد اور خیر و شر دونون صفتون سے پاک ہے، بلکہ نیکی کرنے کی عام صلاحیت اور اہلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک نیکوکار دولتمند ایک نیکوکار غریب سے بدرجہا نیکی کے مواقع زیادہ رکھتا ہے، اسی لئے دولت، اسلام کی نگاہ مین خدا کی ایک نعمت ہے، لعنت نہین، ہنر ہے، عیب نہین، خیر ہے، شر نہین، چنانچہ قرآنِ پاک مین متعدد موقعون پر دولت کو "خیر" اور "فضل" سے تعبیر کیا گیا ہے، اور احادیث سے بھی دولت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے،

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے مرتے وقت یہ چاہا کہ اپنا سارا مال و اسباب خدا کی راہ مین دے دین، آپ نے فرمایا کہ "تم اہل و عیال کو غنی چھوڑ جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگون کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرین"[1] آپ کے حلقہ بگوشون مین دولتمند بھی تھے، اور

[1] بخاری کتاب الوصایا باب ان یترک ورثتہ اغنیاء خیر من ان یتکففوا الناس،

غریب بھی، اور دونون آپکے دربار مین برابر کی حیثیت رکھتے تھے، ایک دفعہ غریبون نے آکرعرض کی کہ یارسول اللہ! ہمارے دولتمند بھائی تو ہم سے سبقت لئے جاتے ہین، ہم جو نیکی کے کام کرتے ہین وہ وہ بھی کرتے ہین، اور اس کے علاوہ وہ خیرات بھی کرتے ہین، جو ہم نہین کر پاتے، آپنے انکو ایک دعا سکھائی کہ یہ پڑھ لیا کرو، دولتمند صحابیون نے یہ سنا تو وہ بھی وہ دعا پڑھنے لگے، غریبون نے پھر جاکر عرض کی، تو آپنے فرمایا "یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہے دے[1]"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عظیم الشان مسئلہ کو جو دنیا مین ہمیشہ سے غیر منفصل اور ناطے شدہ چلا آرہا تھا، اپنی روشن تعلیم اور تلقین کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے حل کر دیا، ایک دفعہ آپنے تقریر مین فرمایا کہ "لوگو! مجھے تمھاری نسبت جو ڈر ہے وہ دنیا کے خیر و برکت کا ہے" صحابہ نے پوچھا "یارسول اللہ! دنیا کے خیر و برکت سے آپ کا کیا مقصود ہے" فرمایا "دنیا کا باغ و بہار" (عیش و نشاط اور مال و دولت) ایک شخص نے کہا "یارسول اللہ! کیا بھلائی سے بھی برائی پیدا ہوتی ہے" سائل کا منشا یہ تھا کہ دولت جو خیر و برکت ہے وہ فتنہ کیونکر ہو سکتی ہے آپنے سوال سنکر ذرا تامل کیا، پھر پیشانی سے پسینہ کے قطرے پوچھے، پھر فرمایا "بھلائی سے بھلائی ہی پیدا ہوتی ہے، لیکن دولت کی مثال ایک ہرے بھرے چراگاہ کی ہے، جس کو موسم بہار نے سرسبز و شاداب بنایا ہو، جب بعض جانور حرص و طمع مین آکر حد اعتدال سے زیادہ کھا لیتے ہین تو دیکھو وہی خیر و برکت کی چیز ان کی ہلاکت اور موت کا باعث ہو جاتی ہے لیکن جو جانور اس کو اعتدال سے چرتا ہے، جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ دھوپ کے سامنے ہو جاتا ہے اور کچھ دیر جگالی کرتا ہے، فضلہ باہر پھینکدیتا ہے، اور پھر چرنے لگتا ہے، دولت ایک خوشگوار چیز ہے تو جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے خرچ کرے تو یہ دولت اس کے لئے بہترین مددگار ہے لیکن جو

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب استحباب الذکر بعد الصلوٰۃ۔

شخص اس کو صحیح طریقہ سے حاصل نہین کرتا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کھاتا چلا جاتا ہے، اور سیر نہین ہوتا،[1]

اس تقریر مین آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ کے اہم نکتہ کو واضح فرما دیا اور بتا دیا کہ نفس دولت خیر و شر نہین ہے، بلکہ اس کا درست و نا درست طریقۂ حصول اور جائز و ناجائز مصرف خیر و شر ہے، اگر درست طریقہ سے وہ حاصل کیجائے اور صحیح طریقہ سے خرچ کیجائے تو وہ نیکیون اور بھلائیون کا بہتر سے بہتر ذریعہ ہے، اور اگر اس کے حصول و صرف کا طریقہ صحیح نہین، تو وہ بری اور شر انگیز ہے، اخلاقی محاسن و معائب، امیر و غریب دونون کے لئے یکسان ہین، ایک سخی و فیاض و متواضع امیر، اور ایک قناعت پسند اور صابر و شاکر غریب اسلام کی نظر مین فضیلت کے ایک ہی درجہ پر ہین، اسی طرح ایک متکبر بخیل امیر اور خوشامدی اور لالچی فقیر پستی کی ایک ہی سطح پر ہین، اسلئے ضرورت تھی کہ دولت کی اجازت کے ساتھ ساتھ ایک طرف امراء اور دولتمندون کے اخلاق کی اصلاح کیجائے اور دوسری طرف غریبون اور فقیرون کی امداد اور دستگیری کے ساتھ انکے اخلاق و عادات کو بھی درست کیا جائے، اسلام مین زکوٰۃ اسی عظیم الشان دوطرفہ اصلاح کا نام ہے،

اس سلسلہ مین آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے سب سے پہلے حصولِ دولت کے ناجائز طریقون، دھوکا، فریب، خیانت، لوٹ مار، جوا، سود وغیرہ کی سخت سے سخت ممانعت کی، سرمایہ داری کے اصول کی حمایت نہین کی، اور اس کے سب سے آسان ترین ذریعہ اور غریبون کے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ وکتاب الزہد والرقاق باب مایحذر من زہرۃ الدنیا،

لوٹنے کے سب سے عام طریقہ "سود" کو حرام مطلق اور خدا اور رسول سے لڑائی کے ہم معنی فرمایا، جو زمین یونہی پڑی ہوئی ہے اس کو جو بھی اپنی کوشش سے آباد و سیراب کرے، اسی کی ملک قرار دی، چنانچہ فرمایا "زمین خدا کی ہے، اور سب بندے خدا کے بندے ہین، جو کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ہے" (طیالسی صفحہ ۲۰۴) متروکہ جائداد کا مالک کسی ایک کو نہین، بلکہ بقدر استحقاق تمام عزیزون کو اس کا حصہ دار بنا دیا، ممالک مفتوحہ کو امیر اسلام کی شخصی ملکیت نہین، بلکہ پوری جماعت کی ملکیت قرار دیا، فطرت کی ان بخششون کو جو انسانی محنت کی ممنون نہین، جیسے پانی، تالاب، گھاس، چراگاہ، نمک کی کان، معدنیات وغیرہ جماعتی تصرف مین دیا، اور ان لڑائی کے دشمنون سے حاصل کی ہوئی زمینون کو امرا اور دولتمندون کے بجائے خالص غریبون اور بیکسون کا حق قرار دیا، اور اس کی وجہ بھی ظاہر کردی،

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ	بستیون والون کی ملکیت سے اللہ
اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ	جو اپنے رسول کو ہاتھ لگا دے وہ
وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى	خدا اور اس رسول اور رشتہ دارون
وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ	اور یتیمون اور غریبون اور مسافرون
كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ	کا حق ہے، تاکہ وہ الٹ پھر کر تم مین سے
الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۚ	دولتمندون ہی کے لینے دینے مین نہ
(حشر-۱)	رہ جائے،

اس کے بعد اس سلسلہ مین دولتمندی کی سب سے بڑی بیماری بخل کو دنیا مین انسانیت کا

بدترین مظہر اور آخرت مین بڑی سی بڑی سزا کا مستوجب قرار دیا، اور جو اس گناہ سے پاک ہو اس کو کامیابی کی بشارت دی، فرمایا،

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ	اور جو اپنے جی کی لالچ سے بچایا گیا
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ - (حشر-۱)	وہی لوگ ہین مراد پانے والے،

بخل کا مبتلا دوسرون کے ساتھ بخل نہین کرتا، بلکہ درحقیقت وہ خود اپنے ساتھ بخل کرتا ہے، وہ اس کی بدولت اس دنیا مین اپنے آپ کو ہردلعزیزی اور نیکنامی بلکہ جائز آرام و راحت تک سے اور آخرت مین ثواب کی نعمت سے محروم رکھتا ہے، فرمایا،

وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ	اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی
نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ	سے بخل کرتا ہے، اللہ تو غنی ہے اور
الْفُقَرَآءُ، (محمد-۴)	تم ہی محتاج ہو،

اس آیتِ پاک مین درپردہ یہ بھی واضح کر دیا، کہ جس دولت کو تم اپنی سمجھتے ہو وہ درحقیقت تمھاری نہین اصل مالک خدا ہے، اور تم خود اس کے محتاج ہو، پھر جو شخص مال کا اصلی مالک نہ ہو، بلکہ محض امین ہو، وہ اصلی مالک کے حکم کے مطابق اس کو صرف نہ کرے اور یہ سمجھے کہ یہ خود اس کی ملکیت ہے اور اس کو اپنی ملکیت مین سے کسی کو کچھ دینے نہ دینے کا اختیار ہے، خائن اور بے ایمان نہ کہا جائے گا؟ درحقیقت یہی تصوّر کہ یہ مال میرا ہے، اور میری شخصیت اور انانیت کی طرف اس کی نسبت ہے، دنیا کی تمام برائیون اور بدیون کی جڑ ہے، اس آیتِ پاک کی یہ تعلیم اسی جڑ کو کھودتی اور بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے،

پھر دولت کے ان مجازی مالکوں اور امینوں کو یہ بتا دیا گیا کہ ان کو خدا کی عدالت مین اپنی دولت کے ایک ایک ذرہ کا حساب دینا پڑے گا،

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (تکاثر-۱) — پھر اس دن تم سے تمھاری نعمت کا حساب پوچھا جائے گا،

اس لئے ان کو خوب سمجھ لینا چاہئے، کہ وہ اپنی دولت کو کہاں اور کس طرح صرف کرتے ہین، ان لوگون کو جو اپنے روپیے کی تھیلیون کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہین تنبیہ کی

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ — برائی ہو اس کی جو طعنہ دیتا، اور عیب

الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ — چنتا ہو، جو مال کو سینت کر رکھتا ہو

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ — اور اس کو گن گنکر، وہ خیال کرتا ہے کہ

كَلَّا، (ھمزہ-۱) — اس کا مال اس کے ساتھ سدا رہیگا

ہرگز نہیں،

فرمایا "رشک کرنا صرف دو آدمیون پر جائز ہے، ایک تو اس پر جس کو خدا نے علم دیا ہے، اور وہ اس کے مطابق شب و روز عمل کرتا ہے، اور دوسرے اس پر جس کو خدا نے دولت دی ہے، اور وہ اس کو دن رات خدا کی راہ مین خرچ کرتا ہے[1]" جو لوگ سونے چاندی کو زمین مین گاڑ کر رکھتے ہون اور کار خیر مین خرچ نہ کرتے ہون، ان کو خطاب کیا،

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ — وہ لوگ جو سونا اور چاندی گاڑ کر

---

[1] بخاری کتاب العلم باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ،

وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا	رکھتے ہین، اور اس کو خدا کی راہ مین خرچ
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ	نہین کرتے، اُن کو دردناک عذاب
بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ، (توبہ۔۵)	کی بشارت دیدو،

اس آیتِ پاک نے صحابہ مین دو فریق پیدا کر دیئے، ایک کہتا تھا کہ جو کچھ ملے سب خدا کی راہ مین خرچ کر دینا چاہئے، کل کے لئے کچھ نہ رکھنا چاہئے ورنہ جو شخص ایسا نہ کرے گا وہ اس آیت کے تحت مین عذاب کا مستحق ہوگا، دوسرا کہتا تھا، خدا نے ہماری دولت مین جو حق واجب ٹھہرایا ہے، (یعنی زکوٰۃ) اس کے ادا کرنے کے بعد سرمایہ جمع کرنا عذاب کا موجب نہین لیکن اہلِ رازِ صحابہ اور علماے امت نے اپنے قول و عمل سے اس مشکل کی پوری گرہ کھول دی، حضرت موسیٰؑ کی توراۃ مین مقررہ زکوٰۃ ادا کرنے کے سوا مال کی خیرات کی کوئی تعلیم نہین، اور حضرت عیسیٰؑ کی انجیل مین آسمانی بادشاہی کی کنجیان اسی کے حوالہ کی گئی ہین جو سب کچھ خدا کی راہ مین لٹا دے، یہ دونون تعلیمین اپنی اپنی جگہ پر صحیح و درست ہین، لیکن جس طرح پہلی تعلیم بعض بلند ہمت حوصلہ مندون کے حوصلہ سے کم ہے، اسی طرح دوسری تعلیم جو یقیناً ایک بلند روحانی تخیل ہے، مگر وہ عملاً عام انسانون کے حوصلہ سے بہت زیادہ ہے، اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک گونہ انسانی فطرت کے دائرہ سے باہر ہے، اور اسی لئے بہت کم لوگ اس پر عمل کر سکے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم موسوی اور عیسوی دونون شریعتون کی جامع ہے، اسلام نے خیرات کے درجے مقرر کر دیئے، ایک قانونی، اور دوسری اخلاقی قانونی خیرات کی وہی مقدار باقی رکھی جو موسوی شریعت مین ملحوظ تھی یعنی نصف مثقال نقد

ہین اور عشر پیداوار ہین، یہ وہ کم سے کم خیرات ہے، جس کا سالانہ ادا کرنا ہر مستطیع اور صاحبِ نصاب پر واجب ہے، اور اس کا وصول اور خرچ کرنا جماعت کا فرض ہے، اور اخلاقی خیرات جسکو ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا ہے، اس کو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کی طرح بلند سے بلند روحانی تخیل کے مطابق قرار دیا، اور بلند ہمت انسانون کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی، صحابہؓ مین دونون قسم کے لوگ تھے، وہ بھی تھے جو کل کے لئے آج اٹھا کر رکھنا حرام سمجھتے تھے جیسے حضرت ابوذرؓ[1] اور وہ بھی تھے جو وقت پر اپنی تمام دولت اسلام کے قدمون پر لا کر ڈال دیتے تھے، جیسے حضرت ابوبکرؓ[2] اور ایسے بھی تھے جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ خدا کی راہ مین بیک وقت لٹا دیتے تھے، جیسے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ[3]، اور وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسرون کو کھلا دیتے تھے، اور خود تکلیف اٹھا کر دوسرون کو آرام پہنچاتے تھے، جیسے حضرت علیِ مرتضیٰؓ، اور بعض انصارِ کرام، خدا نے اُن کی مدح فرمائی،

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ	اور وہ اپنی ذاتی حاجت کے باوجود
مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا،	اپنا کھانا مسکین اور یتیم اور قیدی کو
(دھر - ۱)	کھلا دیتے ہین،
وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ	اور وہ اپنے آپ پر دوسرون کو ترجیح
وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر - ۱)	دیتے ہین، اگرچہ وہ خود حاجتمند ہون،

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب ما ادی زکوٰۃ فلیس بکنز، [2] ترمذی کتاب المناقب فضائلِ ابی بکر، [3] اسد الغابہ جلد ۳ صفحہ ۳۱۶،

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم مختلف انسانی طبیعتون کے موافق، اور فطرت سلیمہ کے مطابق ہے، اور ہر ایک کے لئے اس کی استعداد اور اہلیت کے مطابق نجات کا دروازہ کھولتی ہے، اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے، جس سے اہل حاجت اور نیک کامون کے لئے عملاً ہر وقت امداد مل سکے، اور ساتھ ہی اہل دل اور اہل استعداد کے مرتبۂ کمال کے لئے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت اور ترغیب بھی پیش کردی ہے، اور اس کی خوبیان اور برائیان بھی بیان کردی ہین، تاکہ امت کے باحوصلہ افراد ہمت کے شہپرون سے اڑکر اس سدرۃ المنتہی تک پہنچنے کی کوشش کرین،

حضرت شیخ شرف الدین یحیٰی منیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات مین اسلام کے اس آخری مرتبۂ کمال کی تشریح ان الفاظ مین فرماتے ہین،

وایں طائفہ جان و مال در باختہ اند	اس فرقہ نے اپنی جان اور مال کو ہار دیا ہے
و با ہیچ کس ماسوا اللہ نہ پرداختہ اند،	اور خدا کے سوا کسی سے دل نہین لگایا،
گفتۂ ایشان است الفقیر مالہٗ	اس کا مقولہ ہے کہ درویش وہ ہے جس کا
مباح و دمہ هدر یعنی درویش	مال وقف اور جس کا خون معاف ہو،
صادق آن بود کہ بخون و مال او را	اس کو اپنی جان و مال پر کوئی دعوی نہ ہو
دعوی نہ بود . . . . اگر	. . . . اگر لوگ اس کا
مالش برند خوش گردد، گوید الحمد للہ	مال اٹھا لیجائین تو خوش ہو کہ الحمد للہ
کہ حجابے از پیش من برداشتند تاگفتہ اند،	اس کے اور خدا کے درمیان جو ایک پردہ

زکوٰۃ نعمت دنیا نزدیک این طائفہ
محمود نہ باشد، از آنکہ بخل ناستودہ است،
و بخلی تمام باید تا دویست درم را در بند
کند، و یکسال محبوس دارد، آنگاہ پنج
درم ازان بدہد،

پڑا تھا وہ اٹھ گیا، یہاں تک کہ ان کا کہنا یہ
ہے کہ دنیا کی دولت کو جمع کرکے زکوٰۃ
دینا کچھ اچھا نہیں ہے، کیونکہ بخالت تعریف
کے قابل نہیں اور اس کے لئے کہ سال
میں دو سو درم جمع ہوں، اور پھر وہ ایک
سال تک بند پڑے رہیں تب جاکر ایک
سال کے بعد پانچ درم ان میں سے خدا کی
راہ میں دے، بڑی بخالت کی ضرورت ہے،

اس کے بعد حضرت شبلیؒ کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے،

یکے از فقہاء بر سبیل آزمایش شبلی رحمۃ اللہ
علیہ را پرسید کہ زکوٰۃ در چند لازم آید،
گفت جواب بر مذہب فقیہان خواہی
یا بر مذہب فقیراں؟ گفت بر ہر دو
جواب فرما، شبلیؒ گفت، بر مذہب فقیہاں
از دویست درم بعد از حولانِ حول
پنج درم باید داد، و بر مذہب فقیراں در
حال ہر دویست درم باید داد و جان

کسی نے حضرت شبلیؒ سے امتحاناً پوچھا کہ زکوٰۃ
کتنے پر ہوتی ہے، فرمایا فقہاء کے مسلک کے
جواب چاہتے ہو، یا فقراء کے، کہا دونوں
کے، فرمایا فقہاء کے مذہب کے مطابق ایک
سال گذرنے پر دو سو درم میں سے پانچ
درم، اور فقراء کے مسلک پر فوراً پورے
کے پورے دو سو، اور اس نذرانہ کی خوشی
میں اپنی جان بھی سر پر رکھ کر پیش کرنی

بشکرانہ بر سر باید نہاد، فقیہ گفت ما | چاہیئے، فقیہ نے کہا ہم نے یہ مذہب ائمہ
این مذہب از ائمہ دین گرفتہ ایم | دین سے حاصل کیا ہے، فرمایا ہم نے یہ
شبلی گفت ما این مذہب از صادق | مسلک صدیق اکبر سے حاصل کیا ہے،
رب العالمین گرفتیم یعنی ابی بکر صدیق | کہ جو کچھ تھا وہ سب سرور عالم صلی اللہ علیہ
رضی اللہ عنہ او ہر چہ داشت پیش | وسلم کے سامنے رکھدیا، اور اپنی جگر گوشہ
سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نہاد و جگر گوشہ | (حضرت عائشہ رض صدیقہ) کو شکرانہ
خویشتن بشکرانہ داد، (مکتوب ۱۷ سہ صدی) | مین دیا،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی مثال اسی دوسرے فریق کے مطابق تھی آپ کے پاس عمر بھر کبھی اتنا جمع نہ ہوا کہ زکوٰۃ کی نوبت آئے، جو کچھ ہوتا وہ اسی دن اہل استحقاق مین تقسیم ہو جاتا، اگر گھر مین رات کو سونے چاندی کے چند خزف ریزے بھی پڑے رہتے، تو گھر مین آرام نہ فرماتے، مگر عام امت کے لئے اپنے مسلک کو فرض نہین قرار دیا، بلکہ اتنا ہی ان کے لئے مقرر کیا گیا جو ان کی قوت، استطاعت اور ہمت کے مطابق ہو، تاکہ نجات کا دروازہ غریبون اور دولتمندون کے ہر طبقہ کے لئے یکسان کھلا رہے، اور اس لئے تاکہ قیدی بے وعدم پابندی لوگون کی سستی اور عدم عمل کا باعث نہ ہو، مقدار معین کے مالک پر ایک رقم قانوناً فرض کی گئی، تاکہ جماعت کے مجبور و معذور افراد کی لازمی طور سے دستگیری ہوتی رہے،

اشتراکیت کا علاج

دنیا مین امیر و غریب کی جنگ ہمیشہ سے قائم ہے، ہر تمدن کے آخری دور مین قوم کے مختلف افراد کے درمیان، دولت کی غیر مساوی صورت یقینی طور سے

پیدا ہو جاتی ہے بعض طبقے نہایت دولتمند ہو جاتے ہیں جن کے خزانون کے لئے زمین کا پورا طبقہ بھی کافی نہین ہوتا، اور دوسری طرف وہ غریب ہوتے ہین جن کے پاس کھانے کے لئے ایک سوکھا ٹکڑا، اور سونے کے لئے ایک بالشت زمین بھی نہین ہوتی اور دولتمند طبقون کی خودغرضی، خود پسندی، عیاشی، اس حدتک پہنچ جاتی ہے، کہ وہ اپنے بھوکے اور ننگے بھائیون کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا اور کپڑے کا ایک چیتھڑا تک دینے کے روادار نہین ہوتے، اور وہ یہ سمجھتے ہین کہ یہ اتفاقی دولت، خدا کی طرف سے نہین، بلکہ ان کے علم وہنر، سعی وکوشش اور دست وبازو سے حاصل ہوئی ہے، اس لئے ان سست و ناکارہ افراد کا اس مین کوئی حصہ نہین، قارون کو جب زکوٰۃ وخیرات کا حکم ہوا، تو اُس نے جواب مین یہی کہا،

اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ	مجھکو تو ایک ہنر سے جو میرے پاس
(قصص - ۸)	ہے یہ سب ملا ہے،

چنانچہ ہرزمانہ کے قارونون کا اپنی دولت کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد ہوتا ہے،

یونان کے آخری دور مین یہی صورت پیدا ہوئی، ایران کے انتہائی زمانہ مین یہی شکل نمودار ہوئی، یورپ کی موجودہ فضا مین یہی آب وہوا، اقتصادی مشکلات کے ابروباد کا طوفان اور سیلاب پیدا کر رہی ہے، مزدور وسرمایہ دار کی جنگ پورے زور پر قائم ہے، اور سوشلزم، کمیونزم، انارکزم اور بالشوزم کے طوفان جگہ جگہ اٹھ رہے ہین، لیکن دنیا مین مساوات اور برابری پیدا کرنے کے لئے، یہ دنیا کے نئے خاکے تیار کرنے والے، جو نقشے بنا رہے ہین، وہ انسانی فطرت وطبیعت کے اس درجہ مخالف ہین، کہ ان کی دائمی کامیابی حد درجہ مشکوک ہے،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے دنیا کی اس مشکل کا اندازہ کر لیا تھا، اور اس نے اسی کے حل کرنے کے لئے یہ اصول مقرر کر دیا کہ ذاتی و شخصی ملکیت کے جواز کے ساتھ جس کی انسانی فطرت متقاضی ہے، دولت و سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھوں مین جانے سے روکا جائے سود کو حرام قرار دیا، متروکہ جائداد صرف ایک ہی شخص کی ملکیت قرار نہین دیا، نفعِ عام کی چیزین اشخاص کے بجائے جماعت کی ملک قرار دین، قیصریت اور شہنشاہیت کے بجائے، جماعت کی حکومت قائم کی، زمینداری کا پرانا اصول جس مین کاشتکار غلام کی حیثیت رکھتا تھا، بدل دیا اور اس کی حیثیت اجیر اور مزدور کی رکھی، انسانی فطرت کے خلاف یہ نہین کیا کہ سرمایہ کو لیکر تمام انسانون مین برابر تقسیم کر دیا جائے، تاکہ دنیا مین کوئی ننگا اور بھوکا باقی نہ رہے، بلکہ یہ کیا کہ ہر سرمایہ دار پر جس کے پاس سال کے مصارف کے بعد مقررہ رقم باقی بچ جائے اس کے غریب بھائیون کی امداد کے لئے ایک سالانہ رقم قانونی طور سے مقرر کر دی تاکہ وہ اُس کے ادا کرنے پر مجبور ہو، اور جماعت کا فرض قرار دیا، کہ وہ اس رقم سے قابلِ اعانت لوگون کی دستگیری کرے یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر اسلام کے تمدن کا دور اس قسم کی اقتصادی مصیبتون سے محفوظ رہا، اور آج بھی اگر اسلامی ممالک مین اس پر عمل درآمد ہو تو یہ فتنے زمین کے اُتنے رقبہ مین جتنے مین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی حکومت ہے، پیدا نہین ہو سکتے، خلافتِ راشدہ کے عہد مین حضرت عثمانؓ کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے، جب عرب مین دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے شام مین قرآن پاک کی اس آیت کے مطابق کہ "جو لوگ سونا چاندی گاڑ کر رکھتے ہین اور خدا کی راہ مین خرچ نہین کرتے" یہ فتویٰ دیا کہ

دولت کا جمع کرنا حرام ہے[1]، اور ہر شخص کے پاس جو کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہو وہ خدا کی راہ مین دیدے، اور شام کے دولتمند صحابہؓ نے ان کی مخالفت کی اور فرمایا کہ ہم خدا کی راہ مین دیکر بچاتے ہین تو حضرت ابوذرؓ کی یہ آواز عام پسند نہ ہوسکی اور نہ عوام مین کوئی فتنہ پیدا کرسکی، کیونکہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا، اور عرب کے آرام و آسایش کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ مین کوئی خیرات کا قبول کرنے والا باقی نہین رہا[2]،

اقتصادی اور تجارتی فائدے

زکوٰۃ مین ان روحانی اور اخلاقی فائدون کے ساتھ اقتصادی حیثیت سے دنیاوی فائدے کے پہلو بھی ملحوظ ہین، اوپر گذر چکا ہے کہ زکوٰۃ ان ہی چیزون مین واجب ہوتی ہے جن مین دو صفتین پائی جائین یعنی بقا اور نمو، بقا سے یہ مقصود ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکین کیونکہ جو چیز ایسی نہ ہوگی اس کی تجارت مین چندان فائدہ ہے، اور نہ وہ دوسرون کے استعمال کے لئے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے، اسی لیے سبزیو اور ترکاریون پر زکوٰۃ نہین ہے، اور نمو سے یہ مقصد ہے، کہ ان مین یا تو پیداوار یا تناسل یا مبادلہ کی بنا پر افزایش کی صلاحیت ہو، اسی لئے جواہرات اور دیگر قیمتی معدنی پتھرون مین یا غیر مزروعہ زمین اور مکان مین بھی زکوٰۃ نہین ہے، ان دونون نکتون سے یہ بات حل ہوتی ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بیکار نہ رکھین، بلکہ محنت، کوشش اور جد و جہد سے اس کو ترقی دین ورنہ اصل سرمایہ مین سال بسال کمی ہوتی

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۷۶، [2] فتح الباری شرح بخاری جلد ۶ صفحہ ۱۵۴ و طبقات ابن سعد ترجمہ عمر بن عبد العزیز صفحہ ۲۵۶،

جائے گی جس کو فطرۃً کوئی برداشت نہین کرسکتا، اس طرح زکوٰۃ کا ایک بالواسطہ مقصد یہ بھی ہے کہ تجارت و زراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہین ترقی دیجائے، کیونکہ جب ہر شخص کو لازمی طور پر سال مین ایک خاص رقم ادا کرنی پڑیگی تو وہ کوشش کریگا کہ جہان تک ہو، یہ رقم منافع سے ادا کرے، اور اصل سرمایہ محفوظ رکھے، اسی بنا پر اسلام نے زکوٰۃ کو ان ہی چیزون کے ساتھ مخصوص کیا جن مین نمو اور اضافہ کی قابلیت ہو، اور اسی بنا پر زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی تاکہ ہر شخص اپنے مال یا جائداد سے کامل طور پر فائدہ اٹھاسکے صحابۂ کرام اس نکتہ کو سمجھ ہمیشہ تجارت اور کاروبار مین مصروف رہتے تھے حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت مین ان لوگون کو جو یتیمون کے سرمایون کے متولی تھے ہدایت کی کہ وہ ان کو تجارت مین لگائین تاکہ ان کے بالغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ مین سب صرف نہ ہو جائے،

یورپ نے بڑی تحقیق کے بعد ایشیا کے تجارتی اور تمدنی تنزل کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہان مال کا اکثر حصہ بیکار زمین مین مدفون رکھا جاتا ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلعم کی زبانِ وحی ترجمان نے آج سے تیرہ سو برس پہلے زکوٰۃ کو فرض کرکے یہ نکتہ بتادیا تھا،

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ	اور جو لوگ چاندی اور سونے کو گاڑکر
وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ	رکھتے ہین، اور اس کو خدا کی راہ مین نہین
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ	صرف کرتے ان کو سخت دردناک
اَلِيْمٍ، (توبہ - ۵)	عذاب کی بشارت دو،

یہ "دردناک عذاب" قیامت مین تو جو کچھ ہوگا وہ ہوگا، اس دنیا مین بھی ان کے لئے

اقتصادی دردناک عذاب یہ ہے کہ وہ اس مدفون سرمایہ کو دبا کر ملک کی دولت کو تباہ کرتے ہین، اور اس سے دولت کی افزایش اور ترقی کا کام لینے کے بجائے اس کو بیکار اور معدوم کر کے ملک کو فقر و محتاجی کے عذاب الیم مین مبتلا کرتے ہین، اور بالآخر خود مبتلا ہوتے ہین، اس لئے امراء کی اخلاقی اصلاح اور مالی ترقی اسی مین ہے، کہ وہ اپنی دولت کو مناسب طور سے صرف کرین،

فقراء کی اصلاح

اب دوسری طرف فقراء کا گروہ ہے، اس مین کوئی شک نہین کہ دنیا کے تمام شارعین مذاہب نے انسانون کے اس قابلِ رحم فرقہ کی جانب ہمدردی اور ترحم کی نگاہ سے دیکھا ہے، اور اُس کی طرف امداد و اعانت کا ہاتھ بڑھایا ہے، مگر درحقیقت ان کے رحم، ہمدردی اور محبت کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی کے پھوڑا یا زخم ہو اور اس کا دوست اس کی محبت اور خیر خواہی کی بنا پر ہمیشہ اس کے پھوڑے اور زخم کی حفاظت کرتا ہے، کہ اس کو ٹھیس نہ لگے اور وہ ٹوٹنے نہ پائے، اور نہ کسی جرّاح کا نشتر اس کو چیرے کہ ان باتون سے اس کو تکلیف ہوگی کیا کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ اس نادان دوست کا یہ عمل اس کے ساتھ دوستی کا ثبوت ہوگا،

گذشتہ مصلحین نے عموماً اس مین افراط و تفریط سے کام لیا ہے، بعض نے تو اس زخم پر صرف نشتر ہی لگایا ہے، اور مرہم کا کوئی پھاہا نہین رکھا، چنانچہ زردشتی مذہب مین سوال قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے، اور اس کے بالمقابل بودھ مذہب مین اس زخم کو سرتاپا مادۂ فاسد بننے دیا گیا ہے، اور بھکشوون کا ایک مذہبی گروہ ہی سوال اور بھیک کے لئے پیدا کیا گیا ہے، لیکن اسلام نے نہایت حکمت کے ساتھ اس زخم کو بھرنے اور اس پھوڑے کو دور کرنے کے لئے ایک تجربہ کار اور ماہر جرّاح کی طرح دونون عمل کئے ہین، اس نے اس غمگین اور

دردمند طبقہ کے زخم مین نشتر بھی لگایا ہے، اور اس پر مرہم بھی رکھا ہے، یہ مرہم اس کی وہ مہربانیان
تسلیان، بشارتین اور عملی امداد واعانت کی تدبیرین ہین، جو اُس کے دل کی ڈھارس اور اسکی
اُمیدون کا سہارا ہین، اور نشتر اس کی وہ اصلاحات ہین، جو اس نے اس طبقہ کو دنائت پستی،
کم ہمتی، لالچ، دوسرون کی دست نگری، اور ان کے سہارے جینے کی ذلّت سے بچانے
کے لئے جاری کین، اس نے اہلِ حاجت کے لئے دوسرون سے سوال اور مانگنے کی قانونی
ممانعت نہین کی لیکن ہر اخلاقی طریق سے ان کو اس ذلت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے اور
اُن کی کفالت کا بار خود جماعت کے سر پر ڈالا ہے،

عام طور سے اس قسم کا وعظ جیسا کہ عیسائی مذہب مین ہے کہ جو کچھ ہے لٹا دو اور غریبون
اور مسکینون کو دے ڈالو، نہایت اعلیٰ اخلاقی تعلیم اور رحم و محبّت کا نہایت بلند مظہر نظر آتا ہے
لیکن غور سے تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جس شدت سے آپ دولتمندون کو سب
کچھ غریبون اور مسکینون کو دے دینے کی ترغیب دے رہے ہین، اور اس سے دینے والون
کے جذبۂ ایثار اور اُن کے جود وسخا اور فیاضی کے جوہر کو ترقی دے رہے ہین، اسی شدت سے
آپ انسانیت کے کثیر التعداد طبقے کو، گداگری کی لعنت، بھیک مانگنے کی پستی، اور دوسرے
کے سہارے جینے کی ذلّت کا خوگر بنا رہے ہین، اور بے محنت کھانے، اور بے تلاش پانے کا
سبق پڑھا رہے ہین، اس طرح اُن کے لئے گداگری، دنائت پستی، ذلّت، سفلہ پن، کم ہمتی،
نامردی، اور تمام رذیل و پست اخلاق کا گڈھا تیار کر رہے ہین، جہان یہ تمام نجاستین آکر جمع ہونگی
کیا یہ انسانیت کے ساتھ رحم ہے؟ کیا یہ نوع بشر کے ساتھ محبت ہے؟ کیا یہ جنسِ بنی آدم

کے ساتھ ہمدردی ہے؟

پیغمبرِ اسلام علیہ السّلام کی بعثت کسی ایک طبقہ کی اصلاح کے لئے نہین ہوئی، وہ انسانون کے ہر طبقہ کے مصلح اور معلّم بناکر بھیجے گئے ہین، غریب امیر اور مسکین و دولتمند دونون آپ کی نگاہ مین یکسان ہین، اس لئے آپنے کسی ایک ہی طبقہ کی اصلاح کا فرض انجام نہین دیا، بلکہ دونون طبقون کو ترازو کے دونون پلڑون مین رکھ کر برابر باٹ سے ناپا ہے، اور اپنی تعلیمات اور اصلاحات مین سے دونون کو مساوی حصہ دیا ہے،

یہ اخلاقی اصلاح کی وہ نازک پل صراط ہے جس پر نبیون کے خاتم اور دینون کے مکمل علیہ السلام کے سوا دنیا کے کسی اخلاقی معلم، اور روحانی مصلح کے قدم نہ جم سکے، اور نہ وہ اپنے ہاتھ مین ترازو کے دونون پلون کو برابر رکھ سکا، اگر غریبون کی اصلاح کی خاطر صدقہ اور خیرات اور دوسرون کی اعانت وہمدردی کے تمام دروازے بندکردیئے جائین تو انسانی جوہرِ شرافت کی بربادی کیساتھ امراء کا طبقہ معائب کی فراوانی اور کثرت سے ہلاک اور اخلاقی محاسن سے تمامتر تہی مایہ ہوجائیگا، اور اگر غرباء اور فقراء کو ہر قسم کی گداگری اور دریوزہ گری کی اجازت دیدیجائے تو انسانون کی وسیع آبادی کی اخلاقی زندگی تباہ وبرباد ہوجائے گی، اسی لئے داعیِ اسلام علیہ السّلام نے انسانون کے دونون طبقون کے سامنے خدا کی بتائی ہوئی وہ تعلیم پیش کی جس سے دونون طبقون کو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے اخلاقی معیار کی ترقی کا موقع مل گیا، اور دونون کو اپنی اپنی شرافت کے جوہر کو پیش اور اپنے اپنے نقائص اور کمزوریون کو دور کرنے کی صورت ہاتھ آئی، ایک طرف تو اسلام نے امراء اور دولتمندون کے طبقہ کو خطاب کرکے کہا،

اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ، (ضحیٰ-۱)	مانگنے والے کو جھڑکی نہ دے،

دوسری طرف خودداروبے نیاز فقرا اور غریبون کے طبقہ کی مدح فرمائی،

یَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِيَآءَ مِنَ	ناواقف اُن کی خودداری اور سوال کی
التَّعَفُّفِ تَعۡرِفُهُمۡ بِسِيۡمٰهُمۡ لَا	ذلت سے بچنے کے سبب سے ان کو دولتمند
يَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا،	سمجھتا ہے تو ان کو ان کی نشانی سے
(بقرہ ۳۷-۳)	پہچانتا ہے، وہ لوگون سے لپٹکر نہین مانگتے

اور بھیک مانگنے کو خلافِ تقویٰ قرار دیا، جو لوگ بھیک مانگ کر حج کرتے تھے، اُن کو خطاب کر کے کہا،

وَتَزَوَّدُوۡا فَاِنَّ خَيۡرَ الزَّادِ	اور زادراہ لے کر چلو کہ بہترین زادراہ
التَّقۡوٰى، (بقرہ-۲۵)	تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے،

ایک طرف دولتمندون کو فرمایا کہ تمھارا حسنِ اخلاق یہ ہے کہ جو تمھارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو خالی مت لوٹاؤ، وَلَوۡ بِشِقِّ تَمۡرَةٍ "اگرچہ چھوہارے کی ایک پھانک ہی کیون نہ ہو[1]" دوسری طرف فقیرون کو فرمایا کہ تمھاری خودداری یہی ہونی چاہئے کہ کسی کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلاؤ کہ الید العلیا خیر من الید السفلی[2] "اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے" (یعنی لینے والے ہاتھ سے دینے والا ہاتھ بہتر ہے) یہ ہے وہ تعلیم جس نے انسانون کے دونون طبقون کو اپنے فیض سے معمور کیا، اور دونون کے لئے اپنے اخلاق کی اصلاح کا موقع

---

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ [2] ایضاً باب الاستعفاف عن المسئلۃ،

بہم پہنچایا،

صدقہ وخیرات درحقیقت وہ پانی ہے جو دینے والون کے قلوب ونفوس کے تمام میل اور گندہ پن کو چھانٹ کران کو پاک وصاف بنا دیتا ہے لیکن وہ خود جب اس میل اور گندہ پن کو لے کر باہر نکلتا ہے تو حرص وطمع کے پیاسے اس کو چلو مین لے لیکر پینے لگتے ہین، اسی لیے آنحضرت صلعم نے فرمایا،

ان ھذہ الصدقات انما ھی اوساخ الناس[1]، — یہ صدقہ تو لوگون کا میل ہے،

اگر آج اُن فقیرون اور گداگرون کی صورتون اور سیرتون پر نظر ڈالو جو استحقاق شرعی کے بغیر اس مال سے فائدہ اٹھاتے ہین تو نظر آجائیگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لوگون کے دلون کا میل کہہ کر کتنی بڑی حقیقت کو آشکار کیا ہے،

حرص، طمع، لالچ، فریب، بے حیائی، بے غیرتی اور وہ تمام باتین جو ان کے لازمی اخلاقی نتائج ہین، ان مین سے کونسی چیز ہے، جو غیر مستحق ابناء السبیل، فقرا، اور مہذب گداگرون کا تمغائے امتیاز نہین، اور درحقیقت یہی وہ میل ہے جو زکوۃ دینے والون کے دامن سے چھٹ کر فقرا اور گداگرون کے دامنِ دل کو نجس بنا دیتا ہے، تاہم اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ بعض دفعہ قدرۃً ایسی مجبوریان پیش آجاتی ہین جب نفیس الطبع سے نفیس الطبع انسان کو اپنی جان بچانے کیلیے گندہ سے گندہ اور میلے سے میلا پانی کے پی لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، اور اس وقت اس اجازت

[1] مسلم کتاب الزکوٰۃ باب ترک استعمال آل النبی علی الصدقۃ،

کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایسے مجبور اشخاص کو شخصی طور سے صدقہ و خیرات کے قبول کرنے کی اجازت دی جائے، شریعت محمدیہ نے اسی اصول پر اسی حیثیت سے لوگون کو اسکے قبول کرنے کی اجازت دی ہے، اور اس مجبورانہ قبول سے اس گروہ کے اخلاق و عادات پر جو برے اثرات طاری ہو سکتے ہین اُن کے انسداد اور دفعیہ یا ان کو کم سے کم مضر بنانے کے لئے مفید تدابیر اختیار کی ہین، اور چند نہایت مناسب احکام جاری کئے ہین جن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

۱۔ اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ صدقہ اور زکوۃ کو خالصۃً لوجہ اللہ ادا کیا جائے یعنی لینے والے پر نہ کسی قسم کا احسان کا بار رکھا جائے، نہ اس کو ممنونِ کرم بنایا جائے، نہ عام مجمع مین اس کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے دیا جائے، کیونکہ اس سے ایک طرف اگر دینے والے کی اخلاقی پستی، اور دنارت ظاہر ہوتی ہے، تو دوسری طرف خود اس طرح کے لینے والے کی خودداری کی رُوح اور اخلاقی غیرت کی حس کو صدمہ پہنچتا ہے، اور بجائے اس کے لینے والا اس طرح دینے والے کا ممنون ہو اس کو اس کے اس فعل سے پہلے سے تو نفرت ہوگی، پھر رفتہ رفتہ شاید اس کی یہ اخلاقی حس غیرت اور شرمندگی کا شریفانہ جوہر ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے، یا ان مین بڑے ظرف کے شریف النفس لوگ ہون، وہ اپنی نظر مین اپنی ذلت آپ محسوس کر کے، اپنی جان پر کھیل نہ جائین،

اسلام نے انہی باتون کو سامنے رکھ کر یہ تعلیم دی، کہ دینے والون کے سامنے یہ نظریہ ہو،

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ	ہم تم کو خدا کے لئے کھلاتے ہین، ہم
لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا، (دھر۔۱)	تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہین چاہتے،

اس شریفانہ تعلیم کو دیکھو کہ بدلہ تو کجا ہم کو تمھاری احسان مندی اور شکر گذاری بھی نہین

چاہیے، پھر صدقہ دینے والون کو یہ بھی تصریح بتا دیا کہ تمھارے احسان دھرنے، طعنہ دینے لینے والے کو ذلیل ورسوا کرنے سے تمھارے اس عظیم الشان کارنامہ کی حقیقت باطل ہوجا اور تمام ثواب حرفِ غلط کی طرح تمھارے نامہ اعمال سے مٹ جائے گا، فرمایا،

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ	جو لوگ خدا کی راہ مین اپنا مال خرچ کرتے
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ	ہین اور اس کے بعد نہ احسان جتاتے
مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ	ہین، نہ طعنہ دیتے ہین، ان کا اجر انکے
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ	خدا کے پاس امانت ہے، اور نہ ان کو
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝	قیامت مین کوئی خوف ہے، اور نہ وہ
قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ	غمگین ہونگے اچھی نرمی کی بات کہکر اور
صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ	چشم پوشی کرکے سائل کو ٹال دینا اس صدقہ
غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ط	سے بہتر ہے جس کے بعد طعنہ دیا جائے
	یا احسان جتایا جائے، خدا تمھاری ایسی
	خیرات سے بے نیاز ہے اور تمھارے ایسے
(بقرہ - ۳۶)	کامون پر بردباری سے درگذر کرنے والا ہے

اس حقیقت کو قرآنِ پاک نے ایک دلنشین تشبیہ سے واضح کیا ہے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا	مسلمانو! اپنے صدقون کو احسان جتا کر
صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى	اور طعنہ دے کر برباد نہ کرو، جیسے کہ وہ

كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ	اپنے صدقون کو برباد کرتا ہے جو شخص
النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	لوگون کے دکھلانے کو دیتا ہے' اور
الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ	خدا پر اور قیامت پر ایمان نہین لاتا'
عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ	اس قسم کی خیرات کی مثال اس چٹان
فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا يَقْدِرُوْنَ	کی ہے، جس پر کچھ گرد پڑی ہوئی ہو' اور
عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ	اس پر ایک پانی پڑ گیا ہو، جس نے
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ،	اُس کو صاف اور چٹیل کر دیا کہ اب اُس پر
	کوئی چیز جم نہین سکتی ہے، ان لوگون
	نے جو کام کیا اس سے کچھ فائدہ نہین
	اٹھا سکے' خدا کافرون کو ہدایت یاب
(بقرہ ۵ - ۳۶)	نہین کرتا،

منجملہ اور اسباب کے یہ بھی ایک سبب ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ مقرر کیا کہ دینے والے خود کسی کو نہ دین، بلکہ وہ اس کو امیرِ جماعت کے بیت المال مین جمع کرین' اور وہ امیر حسبِ ضرورت مستحقین کو بانٹ دے، تا کہ اس طرح غریب لینے والا مگر شریف مسلمان ذاتی طور سے کسی دوسرے شخص کا ممنونِ احسان بنکر اپنی ذلت نہ محسوس کرے' اور دینے والے کو ذاتی طور سے کسی پر منت رکھنے کا موقع نہ ملے، اور اس طرح پوری قوم کا اخلاقی معیار اپنی پوری بلندی پر قائم رہے، ساتھ ہی یہ کہ فقراء اور معذورون کو دربدر کی ٹھوکر کھانے

کی رسوائی، اور ہر ضرورت کے لئے ایک ایک پیسہ کی بھیک جمع کرنے کی ذلت سے بچایا جائے

۲۔ اسی لئے صدقہ دینے کا دوسرا اصول اسلام نے یہ بتایا کہ صدقہ چھپا کر دیا جائے، کہ علانیہ دینے میں بھی سائل بیحیائی اور بے غیرتی کا عادی ہوجاتا ہے، کیونکہ جب کسی کی ذلت اور فقر و فاقہ کی داستان عام ہوجاتی ہے تو پھر اپنے فعل سے اس کو غیرت اور شرم نہیں آتی، اور اس لئے اس کا ڈر تھا کہ اگر اس کا انسداد نہ کیا جائے تو اظہار و اعلان کا یہ طریقہ، دنیا میں گداگری، دریوزہ گری اور بھیک مانگنے کے پیشہ کی اشاعت کا سبب بنجائے گا، اور یہ اخفاء اور چھپا کر دینے کی صورت اس لئے بھی اچھی ہے کہ دینے والا نمایش اور شہرت طلبی کی آلایشوں سے اپنے اخلاق کو محفوظ رکھ سکیگا، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہتر صدقہ وہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو[1]۔

لیکن بعض موقعے ایسے بھی ہیں جہاں صدقہ، خیرات اور زکوٰۃ کے اعلان کی ضرورت پیش آتی ہے، اور وہ یہ کہ دوسروں کو ترغیب اور تشویق دلانے کی خالص نیت ہو، یا خود سائل پیش دستی کرکے مجمع میں سوال کر بیٹھے یا اور کوئی نیک غرض شامل ہو، چنانچہ قرآن پاک نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا،

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا	اگر تم صدقہ کو کھلم کھلا دو تو یہ بھی اچھا ہے
هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا	لیکن اگر تم اس کو چھپا کر فقراء کو دو تو یہ
الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (بقرہ ۳۷)	بہت ہی بہتر ہے،

[1] صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب فضل اخفاء الصدقۃ،

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں صدقہ کے اخفاء کو عام خیرات کیساتھ مخصوص کیا ہے، مگر فرض زکوٰۃ کے لئے اس بنا پر اظہار و اعلان کو مستحسن قرار دیا ہے، کہ اس سے اسلام کے ایک رکن کی اشاعت اور تبلیغ اور دوسروں میں اس کی پیروی کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے اور زکوٰۃ دینے والے عدم ادائے زکوٰۃ کی تہمت سے بری خیال کئے جاتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک آیت کریمہ کا مفہوم صاف ہے، زکوٰۃ کے ادا کرنے کا اصلی طریقہ تو وہی ہے جو عہد نبویؐ میں تھا یعنی یہ زکوٰۃ کی رقم بیت المال یا بیت المال کے عاملوں کے سپرد کی جائے اس لئے اخفاء کا جو فائدہ فقراء کے حق میں ہے وہ اس طرح خود بخود حاصل ہو جاتا ہے، لیکن آیت کا اشارہ یہ ہے کہ اگر تم خود براہ راست فقیروں کو دو تو چھپا کر دینا بہتر ہے کہ لینے والے کی عزت سلامت رہے اسی لئے جس آیت میں اعلان کی اجازت ہے، اس میں فقراء کو براہ راست دینے کا حکم نہیں اور جہاں اخفاء کے ساتھ دینے کا ذکر ہے، وہاں فقراء کو دینے کی تصریح ہے، اس لئے اعلان اور اخفاء کا اصلی فرق زکوٰۃ اور عام خیرات کے درمیان نہیں ہے، بلکہ ادا کرنے کے طریقہ میں ہے، کہ اگر بیت المال اور ناظمین بیت المال کے ذریعہ سے ادا کرو تو ظاہر کر کے دو کہ دینے والے اور وصول کرنے والے دونوں کا حساب پاک رہے، اور تہمت اور بدگمانی کا موقع نہ ملے لیکن اگر کسی سبب سے تم کو براہ راست مستحقین کو دینا پڑے جس میں حساب کتاب کی ضرورت نہیں اور براہ راست تم ہی کو ان کو دینا ہے بیت المال کا پردہ بیچ میں نہیں ہے، اس لئے تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے، کہ چھپا کر دو، تاکہ دینے والا نمائش سے اور لینے والا ذلت و خواری سے محفوظ رہے، پھر ترغیب اعلان اور اظہار کی ضرورت اس وقت ہے جب مسلمان کا مذہبی احساس اس قدر کمزور ہو جائے

کہ حقوقِ اسلام ادا کرنے مین اس قسم کی فقیہانہ ٹھوکرون کی ضرورت ہو، ورنہ صحابۂ کرامؓ کی ترغیب کے لئے صرف اسلام کا خالص جوش کافی تھا، مگر آج تو یہ حالت ہے کہ معمولی سی معمولی رقم کیلئے جبتک اخبارون کے پورے کالم سیاہ نہ کردیئے جائین، دینے والون کے نزدیک خداکوان کے عطیہ کی خبر ہی نہین ہوتی۔

۳- تمام اخلاقی اور تمدنی ترقی کا دارومدار صرف بلند ہمتی اور عالی خیالی پر ہے، بلند ہمتی کا اقتضا یہ ہے کہ مسلمان کی نگاہ بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچکر نہ ٹھہرے، اور اس کو دنیا کی تمام چیزین ہیچ نظر آئین، اس بنا پر اسلام نے یہ اصول قرار دیا کہ زکوٰۃ وصدقہ مین مال کا عمدہ اور بہتر حصہ دیا جائے تاکہ مبتذل اور ادنیٰ درجہ کی چیزون کے دینے اور لینے سے دینے والے اور لینے والے کے اندر پستی اور دناءت نہ پیدا ہو، کیونکہ اس سے لینے والے کے اندر حد درجہ کا لالچ اور چھچھورپن پیدا ہوگا کہ معمولی اور سڑی گلی چیز تک اس کے لالچ سے نہین بچ سکتی، اور دوسری طرف دینے والے کی رُوح مین بھی اس قسم کی خیرات سے بلندی اور علو کے بجائے بخالت، حرص اور کمینہ پن اور تزکیہ کے بجائے اور زیادہ نجاست اور گندگی پیدا ہوگی، کیونکہ کوئی بری چیز کسی کو دیدینے کا منشا دوسرے کی مدد اور خدا کی خوشنودی کا خیال نہین ہوتا، بلکہ اس بیکار اور سڑی گلی چیز سے اپنے دامن اور صحنِ خانہ کو صاف کرنا ہوتا ہے، اس لئے اس سے دینے والے کے دل مین صفائی کے بجائے اور گندگی پیدا ہوتی ہے، روایتون مین ہے کہ اصحابِ صفّہ کو جنھون نے اپنی زندگی کا مقصد صرف اسلام کی خدمت اور خدا کی عبادت قرار دیا تھا، کسبِ معاش کا موقع نہین ملتا تھا، اس لئے لوگ کھجورون کے بدمزہ خوشے لاکر مسجدون مین لٹکا دیتے تھے، اور جب وہ گروہ بھوک کی

شدت سے بیتاب ہوجاتا تھا، تو مجبوراً ان میں سے دو چار کھجوریں توڑ کر کھا لیتا تھا، چونکہ یہ نہایت ذلیل حرکت تھی اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی،

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ	مسلمانو! اپنی کمائی سے اور اس چیز سے
طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا	جو تمہارے لئے ہم نے زمین سے نکالی
لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا	ہے بہتر حصہ خیرات کرو، اور ان میں
الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَ	سے ردی مال کی خیرات کا قصد نہ کرو،
لَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ	حالانکہ اگر وہی تم کو دیا جائے تو خود تم
تُغْمِضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا	نہ لوگے لیکن یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ، اور یقین
أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ،	کرو کہ خدا تمہاری اس قسم کی خیرات سے
	بے نیاز ہے، اور وہ خوبیوں والا ہے
(بقرہ ۔ ۳۷)	(خوبیوں ہی والی چیز پسند کرتا ہے)

۴۔ فقراء اور مساکین کی دنائت اور حرص و طمع کے زائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان ہی لوگوں کو زکوٰۃ اور صدقہ کا حقیقی مستحق قرار دیا جائے، جو باوجود تنگدستی اور سب سے بڑھ کر افلاس کے خودداری اور قناعت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے کیونکہ جب قوم کی توجہ اس قسم کے اشخاص کی طرف مبذول ہوگی تو ہر شخص خودبخود ان اخلاق کی تقلید پر مجبور ہوگا، صحابۂ کرام میں سب سے زیادہ مفلس اور نادار اصحاب صفہ تھے، لیکن ان کی خودداری اور قناعت کا یہ حال تھا، کہ پریشانی صورت کے علاوہ کوئی چیز ان کے فقر و فاقہ کا راز فاش نہیں کر سکتی تھی اس بنا پر اسلام نے ان کو زکوٰۃ کا بہترین مستحق

قرار دیا،

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ	صدقہ ان فقراء کے لئے ہے جو خدا کی راہ
سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ	میں گھرے ہوئے ہیں (بغرض معاش
ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ	تجارت) سفر کی قدرت نہیں رکھتے
الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ	جو لوگ ان سے ناواقف ہیں خودداری
تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ	اور عدم سوال کی وجہ سے ان کو مالدار
النَّاسَ اِلْحَافًا،	سمجھتے ہیں تم صرف ان کے بشرہ سے
	ان کو پہچانتے ہو، وہ لوگوں سے گڑگڑا کر
(بقرہ - ۳۷)	کچھ نہیں مانگتے،

آج مسلمانوں نے اس اصول کو چھوڑ دیا ہے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ سینکڑوں شریف آدمی در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں اور قوم اور خاندان کا نام بیچتے ہیں۔

۵- لیکن با ایں ہمہ حزم و احتیاط گداگری درحقیقت ایک نہایت مبتذل شیوہ ہے، اس بنا پر اسلام نے سخت مجبوری کی حالت میں اس کی اجازت دی، اور جہاں تک ممکن ہوا لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ آنحضرت صلعم نے بعضوں سے اس کی بیعت بھی لی کہ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگیں گے، انھوں نے اس بیعت کی اس شدت سے پابندی کی کہ راستہ میں اگر ان میں سے کسی کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی وہ کسی سے نہیں کہتے تھے کہ اٹھا دو[۱]، ایک دفعہ آپ نے فرمایا جو شخص

[۱] ابو داؤد کتاب الزکوٰۃ باب کراہیۃ المسئلۃ

مجھ سے یہ ضمانت کرے کہ وہ کسی سے مانگیگا نہیں تو مین اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہون، آپ کے آزاد کردہ غلام ثوبانؓ بولے مین یہ ضمانت کرتا ہون چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی کسی سے کچھ نہین مانگتے تھے۔[1]

حکیم بن حزامؓ ایک صحابی تھے، انھون نے ایک دفعہ آنحضرتؐ سے سوال کیا، آپ نے عنایت کیا، پھر مانگا، پھر دیا، پھر تیسری دفعہ یہ صورت پیش آئی تو فرمایا اے حکیم یہ مال بظاہر نہایت شیرین اور خوشرنگ چیز ہے، جو اس کو شرافت کیساتھ لے گا اس کو اس مین برکت دی جائیگی، اور جو لالچ کے ساتھ لے گا، اس کو برکت نہ ملے گی، اور اس کی حالت ایسی ہوگی جیسے کوئی کھاتا چلا جائے اور اس کا پیٹ نہ بھرے، اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے، حکیم نے کہا یا رسول اللہ آج سے مین پھر کسی سے کچھ نہ مانگون گا، اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ خلافتِ راشدہ کے زمانہ مین خلفاء ان کو اپنا وظیفہ لینے کے لئے بلاتے تھے، اور وہ انکار کرتے رہے، اور آخر تک اس انکار پر قائم رہے،[2]

اس کی اور متعدد مثالین ہین، اس عمومی ممانعت کے ساتھ خصوصیت سے ان تمام لوگون کے لئے جو صاحبِ دست و بازو ہون یعنی جن کے ہاتھ پاؤن، اور آنکھین صحیح و سالم ہون بھیک مانگنے سے سخت ممانعت کردی گئی، فرمایا کہ

لا تحل الصدقۃ لغنی ولا	غیر محتاج اور صحیح و سالم آدمی کے لئے
لذی مرۃ سوی (ترمذی کتاب الزکوٰۃ)	صدقہ حلال نہین،

صحیح بخاری مین ہے کہ آپ نے فرمایا،

[1] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب کراہیۃ المسئلہ [2] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الاستعفاف عن المسئلہ،

والذی نفسی بیدہ لان	قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں
یاخذ احدکم حبلہ فیحتطب	میری جان ہے، کہ تم میں کسی کا رسّی لیکر
علی ظہرہ خیر لہ من ان یاتی	اپنی پیٹھ پر لکڑی کا بوجھ اٹھانا اس سے
رجلاً فیسألہ اعطاہ او منعہ	بہتر ہے کہ وہ دوسرے سے بھیک
(کتاب الزکوٰۃ باب الاستعفاف عن المسألہ)	مانگے، وہ اُسے دے یا نہ دے،

آنحضرت صلعم نے اپنے زمانہ میں اس پر عمل بھی فرمایا، ایک دست نگر صحابی نے خیرات مانگی، آپ نے فرمایا تمھارے پاس کچھ ہے، عرض کی ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے، آپ نے ان کو منگوا کر نیلام کیا اور ان کی قیمت سے ایک کلھاڑی خرید دی، اور فرمایا کہ جنگل سے لکڑی کاٹ لاؤ، اور بیچو، انھوں نے اس پر عمل کیا، تو خدا نے ان کو یہ برکت دی کہ وہ گداگری کی ذلت سے ہمیشہ کیلئے بچ گئے[1]

۲- لیکن جو لوگ بدقسمتی سے کسبِ معاش نہیں کرسکتے، ان کو بھی الحاح، کثرتِ سوال بے جا حجت اور گڑگڑا کر زبردستی مانگنے کی نہایت سختی کے ساتھ ممانعت کی، آپ نے فرمایا،

لیس المسکین الذی تردہ الاکلۃ	مسکین وہ نہیں ہے جس کو لقمہ دو لقمے
والاکلتان ولکن المسکین الذی	دروازوں سے واپس لوٹا دیتے ہیں،
لیس لہ غنیً ویستحیی ولا یسأل	مسکین وہ ہے جو کو بے نیاز نہیں ہے،
الناس الحافاً، (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب قول اللہ عزوجل لا یسألون الناس الحافا)	لیکن حیا کرتا ہے، اور لوگوں سے
	گڑگڑا کر نہیں مانگتا،

پھر یہ بھی بتا دیا کہ گداگری اور بھیک کا طریقہ جو سخت مجبوری کی حالت کے علاوہ ہو،

[1] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ۔

ہر حال مین انسان کی شرم وحیا اور غیرت وآبرو کو برباد کر دیتا ہے، فرمایا،

مازال الرجل یسئل الناس	آدمی ہمیشہ مانگتا پھرتا ہے، یہانتک
حتّی یاتی یوم القیامۃ لیس فی	کہ وہ قیامت کے روز اس طرح آئیگا
وجہہ مضغۃ لحم، (بخاری	کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا
کتاب الزکوٰۃ باب من سال الناس تکثرا)	نہ ہوگا،

یہ اس کی سزا ہوگی کہ اس نے دنیا مین مانگ مانگ کر اپنے چہرہ سے عزت وآبرو کی رونق خود دھو دی تھی،

ان ضروری اصلاحات کے ساتھ اسلام نے زکوٰۃ کے نظام کو قائم کیا، اور ان تمام برائیون اور بداخلاقیون کی جڑ کاٹ دی جو اس مفت خوری سے انسانون مین پیدا ہو سکتی تھین، اور ساتھ ہی انسانی برادری کے دونون طبقون کو ترازو کے پلڑے مین برابر رکھ کر، ان کو باہمی معاونت، باہمی مشارکت، باہمی ہمدردی اور امداد کا سبق سکھایا، اور اس طرح پوری جماعت انسانی کو باہم جوڑ کر ایک کر دیا، پست وبلند کے تفرقے ممکن حد تک کم کر دیئے، اور اُس اقتصادی بربادی سے جماعت کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بتا دیا جو اکثر اپنی بھیانک شکلون سے اس کو ڈرایا کرتی ہے،

آنحضرت صلعم کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولتمند صحابہؓ مین یہ فیاضی آگئی کہ وہ دین وملت کی خدمت کے لئے اپنی ساری دولت لٹا کر بھی سیر نہ ہوتے تھے، اور غریب صحابیون مین یہ قناعت اور خودداری پیدا ہوگئی کہ وہ کسی سے کسی کام کا سوال کرنا بھی عیب سمجھتے تھے، دولتمند اپنی زکوٰۃ آپ لے کر بیت المال کے دروازون تک خود آتے تھے، اور غریب اپنے افلاس وحاجت کو خدا کے

سوا دوسرون کے سامنے پیش کرنا توکل کے منافی سمجھتے تھے، اور تیسری طرف آنحضرت صلعم کے بعد جب فراغت آئی تو جماعت کے بیت المال مین اتنا سرمایہ رہتا تھا کہ زکوٰۃ کے کسی مصرف کے لئے کمی محسوس نہین ہوتی تھی، ضرورتمندون کو اسی رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا[1]، اس طرح یہ ایک ایسا مالی واقتصادی نظام تھا کہ بلانفع قرض دینے مین افراد کو جو تامل ہوتا ہے، وہ اس جماعتی نظام کے ماتحت آسان تھا، اور سود کی لعنت کے بغیر داد و ستد کا راستہ کھلا ہوا تھا،

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۱۶۸،



روزہ

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (بقرہ)

روزہ کا مفہوم روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے، عربی مین اس کو "صوم" کہتے ہین جس کے لفظی معنی "رکنے اور چپ رہنے" کے ہین بعض مفسرین کی تفسیرون کے مطابق قرآنِ پاک مین اس کو کہین کہین "صبر" بھی کہا گیا ہے جس کے معنی "ضبطِ نفس، ثابت قدمی اور استقلال" کے ہین ان معنون سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی زبان مین روزہ کا کیا مفہوم ہے؟ وہ درحقیقت نفسانی ہوا و ہوس اور بہیمی خواہشون سے اپنے آپ کو روکنے اور حرص و ہوا کے ڈگمگا دینے والے موقعون مین اپنے آپ کو ضابط اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے، روزانہ استعمال مین عام طور سے نفسانی خواہشون اور انسانی حرص و ہوا کا مظہر تین چیزین ہین یعنی کھانا اور پینا اور عورت و مرد کے جنسی تعلقات، ان ہی سے ایک مدتِ معینہ تک رُکے رہنے کا نام شرعاً روزہ ہے، لیکن دراصل ان ظاہری خواہشون کے ساتھ باطنی خواہشون اور برائیون سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی، خواص کے نزدیک روزہ کی حقیقت مین داخل ہے،

روزہ کی ابتدائی تاریخ روزہ کی ابتدائی تاریخ معلوم نہین، انگلستان کا مشہور حکیم ہربرٹ اسپنسر اپنی تصنیف پرنسپلز آف سوشیالوجی (اصولِ معاشرت) مین چند وحشی قبائل کی مثیل اد

استقرار کی بنا پر قیاس کرتا ہے کہ "روزہ کی ابتدا اصل مین اس طرح ہوئی ہوگی کہ لوگ وحشت کے زمانہ مین خود بھوکے رہتے ہونگے اور سمجھتے ہونگے کہ ہمارے بدلہ ہمارا کھانا اس طرح مردون کو پہنچ جاتا ہے" لیکن یہ قیاس ارباب خرد کی نگاہ مین سند قبول حاصل نہ کرسکا،

بہرحال مشرکانہ مذاہب مین روزہ کی ابتدا اور حقیقت کے خواہ کچھ ہی اسباب ہون لیکن اسلام کا روزہ اپنی ابتدا اور غایت کی تشریح مین اپنے پیروون کی وکالت کا محتاج نہین، وہ بہ آواز بلند مدعی ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ	مسلمانو! روزہ تم پر اسی طرح فرض
الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ	ہوا، جس طرح تم سے پہلی قومون پر
مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، (بقرہ ۲۳)	فرض کیا گیا، تاکہ تم پرہیزگار بنو،
شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ	ماہ رمضان وہ مہینہ ہے، جس مین قرآن
فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ	اتارا گیا، جو انسانون کے لئے سرتاپا
وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ	ہدایت، ہدایت کی دلیلین اور حق و
فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ	باطل مین فارق بنکر آیا، تو جو اس رمضان
فَلْيَصُمْهُ ط وَمَن كَانَ مَرِيضًا	کو پائے وہ اس مہینہ بھر روزہ رکھے
أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ	اور جو بیمار ہو، یا سفر پر ہو، وہ دوسرے
أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ	دنون مین رکھ لے، خدا آسانی چاہتا
وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا	ہے سختی نہین، تاکہ تم روزون کی تعداد

لہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ ص ۱۹۴ طبع گیارہ ۱۲

الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى	پوری کرسکو اور (یہ روزہ اس لئے فرض
مَاهَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ	ہوا) تاکہ تم خدا کے اس ہدایت دینے پر اس کی
تَشْكُرُوْنَ ، (بقرہ - ۲۳)	بڑائی کرو، اور تاکہ تم شکر بجا لاؤ،

ان آیاتِ پاک میں نہ صرف روزہ کے چند احکام، بلکہ روزہ کی تاریخ، روزہ کی حقیقت، رمضان کی ماہیت اور روزہ پر اعتراض کا جواب یہ تمام امور مفصل بیان ہوئے ہیں، ذیل کے صفحات میں بہ ترتیب ہم ان پر روشنی ڈالتے ہیں،

روزہ کی مذہبی تاریخ

قرآنِ پاک نے ان آیتوں میں تصریح کی ہے کہ روزہ اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ کل مذاہب کے مجموعۂ احکام کا ایک جزء رہا ہے، جاہل عرب کا پیغمبر امّی جو بقول مخالفین عالم کی تاریخ سے ناواقف تھا، وہ مدعی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ فرض عبادت رہا ہے، اگر یہ دعویٰ تمامتر صحت پر مبنی ہے تو اس کے علم کے مافوق ذرائع میں کیا شک رہجاتا ہے؟ اس دعویٰ کی تصدیق میں یورپ کے محقق ترین ماخذ کا ہم حوالہ دیتے ہیں؛

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار بر روزہ (فاسٹنگ) لکھتا ہے :-

"روزہ کے اصول اور طریقے گو آب وہوا، قومیت وتہذیب، اور گردوپیش کے حالات کے اختلاف سے بہت کچھ مختلف ہیں لیکن بہ مشکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہیں، جس کے مذہبی نظام میں روزہ مطلقاً تسلیم نہ کیا گیا ہو۔"

آگے چل کر لکھتا ہے،

"گو کہ روزہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے۔"

ہندوستان کو سب سے زیادہ قدامت کا دعویٰ ہے لیکن برت یعنی روزہ سے وہ بھی آزاد نہیں، ہر ہندی مہینہ کی گیارہ بارہ کو برہمنوں پر اکادشی کا روزہ ہے، اس حساب سے سال میں چوبیس روزے ہوئے، بعض برہمن کاتک کے مہینہ میں ہر دوشنبہ کو روزہ رکھتے ہیں، ہندو جوگی چلہ کشی کرتے ہیں یعنی چالیس دن تک اکل و شرب سے احتراز کرتے ہیں، ہندوستان کے تمام مذاہب میں جینی دھرم میں روزہ کے سخت شرائط ہیں، چالیس چالیس دن تک کا ان کے یہاں ایک روزہ ہوتا ہے، گجرات و دکن میں ہر سال جینی کئی کئی ہفتہ کا روزہ رکھتے ہیں، قدیم مصریوں کے ہاں بھی روزہ دیگر مذہبی تہواروں کے شمول میں نظر آتا ہے، یونان میں صرف عورتیں تھسموفیریا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی تھیں، پارسی مذہب میں گو عام پیرودن پر روزہ فرض نہیں لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم اُن کے ہاں موجود تھا، خصوصاً مذہبی پیشوا کے لئے تو پنجسالہ روزہ ضروری تھا،[1]

یہودیوں میں بھی روزہ فریضۂ الٰہی ہے، حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر چالیس دن بھوکے پیاسے گذارے (خروج ۲۴، ۳۴، ۲۸) چنانچہ عام طور سے یہود حضرت موسیٰؑ کی پیروی میں چالیس دن روزہ رکھنا اچھا سمجھتے تھے لیکن چالیسویں دن کا روزہ اُن پر فرض ہے، جو ان کے ساتویں مہینہ (تشرین) کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے، اور اسی لئے اس کو عاشورا (دسواں) کہتے ہیں، یہی عاشورا کا دن وہ دن تھا جس میں حضرت موسیٰؑ کو توراۃ کے دس احکام عنایت ہوئے تھے، اسی لئے توراۃ میں اس دن کے روزہ کی نہایت تاکید آئی ہے[2]، اس کے علاوہ یہودی صحیفوں میں اور

[1] ان تمام حوالوں کے لئے دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ صفحہ ۱۹۳، ۱۹۴ طبع یازدہم، [2] توراۃ سفر الاحبار ۱۶-۲۹-۳۴ و ۲۳-۲۷،

دوسرے روزون کے احکام بھی بتصریح مذکور ہین[1]،

عیسائی مذہب مین آکر بھی ہم کو روزون سے دوچار ہونا پڑتا ہے چنانچہ حضرت عیسیٰ[ع] نے بھی چالیس[2] دن تک جنگل مین روزہ رکھا[3] حضرت یحییٰ[ع] جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گویا مبشر تھے وہ بھی روزے رکھتے تھے، اور ان کی امت بھی روزہ دار تھی[4]، یہود نے مختلف زمانون مین مختلف واقعات کی یادگار مین بہت سے روزے بڑھا لئے تھے اور وہ زیادہ تر غم کے روزے تھے اور اس غم کو ظاہر کرنے کے لئے اپنی ظاہری صورت کو بھی وہ اداس اور غمگین بنا لیتے تھے[5]، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانے مین غم کے ان مصنوعی روزون کو منع کر دیا، غالبًا اسی قسم کے کسی روزہ کا موقع تھا کہ بعض یہودیون نے آکر حضرت عیسیٰ[ع] پر اعتراض کیا کہ تیرے شاگرد کیون روزہ نہین رکھتے، حضرت عیسیٰ[ع] نے اس کے جواب مین فرمایا،

"کیا براتی جب تک دولہا ان کے ساتھ ہے، روزہ رکھ سکتے ہین، جب دولہا ان کے پاس ہے روزہ نہین رکھ سکتے، پر وہ دن آئین گے کہ جب دولہا ان سے جدا کیا جائے گا تب ان ہی دنون مین روزہ رکھین گے،" (مرقس ۲-۱۸)

اس تلمیح مین دولہا سے مقصود خود حضرت عیسیٰ[ع] کی ذات مبارک اور براتی سے مقصود انکے پیرو اور حواری ہین، ظاہر ہے کہ جب تک پیغمبر اپنی امت مین موجود ہے، امت کو غم منانے کی ضرورت نہین، ان ہی فقرون سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ[ع] نے موسوی شریعت کے فرض

---

[1] اول سموایل ۷-۶ و یرمیا ۳۶-۶، ۱۰، [2] متی ۴-۲، [3] مرقس ۲-۱۸، [4] قضاۃ ۲۰-۲۶، سموایل اول ۷-۶ و ۳۱-۱۳ و لوقا ۲-۱۲ وغیرہ،

مستحب روزون کو نہین، بلکہ غم کے مبتدعانہ روزون کو منع فرمایا، انھون نے خود اپنے پیروون کو نیک[1] اور مخلصانہ روزہ رکھنے کی نصیحت فرمائی ہے، چنانچہ آپ اپنے حواریون کو فرماتے ہین،

"پھر جب تم روزہ رکھو ریاکارون کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہین، کہ لوگون کے نزدیک روزہ دار ٹھہرین، مین تم سے سچ کہتا ہون کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے، پر جب تم روزہ رکھو اپنے سر مین تیل لگاؤ، اور منہ دھوؤ، تاکہ تم آدمی پر نہین بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی مین دیکھتا ہے تجھ کو آشکارا بدلہ دے" (متی ۶-۶-۷)

ایک دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰؑ سے ان کے شاگرد پوچھتے ہین کہ ہم پلید روحون کو کس طرح نکال سکتے ہین، وہ اس کے جواب مین فرماتے ہین:-

"یہ جنس سوائے دعا، اور روزہ کے کسی اور طرح سے نہین نکل سکتی" (متی ۱۷-۲۱)

اہل عرب بھی اسلام کے پہلے سے روزہ سے کچھ نہ کچھ مانوس تھے، مکہ کے قریش جاہلیت کے دنون مین عاشوراء (یعنی دسوین محرم کو) اس لئے روزہ رکھتے تھے، کہ اس دن خانہ کعبہ پر نیا غلاف[1] ڈالا جاتا تھا، مدینہ مین یہود اپنا عاشوراء الگ مناتے تھے[2]، یعنی وہی اپنے ساتوین مہینہ کی دسوین تاریخ کو روزہ رکھتے تھے،

ان تصریحات سے ثابت ہوگا کہ قرآن کی یہ آیت

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ — مسلمانو! تم پر روزہ اس طرح لکھا گیا

[1] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۴۴، [2] صحیح بخاری کتاب الصوم جلد اول صفحہ ۵۶۲،

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ-۲۳) جس طرح تم سے پہلون پر لکھا گیا،

کس قدر تاریخی صداقت پر مبنی ہے،

روزہ کی حقیقت | انسان کی ہر قسم کی روحانی بدبختیون اور ناکامیون کے علل واسباب کی اگر تحلیل کیجائے تو آخری نتیجہ یہ نکلیگا کہ وہ دنیا مین مختلف ضرورتون کا محتاج ہے، وہ مختلف اغراض کا پابند ہے اسکے دل کی کوئی جنبش اور اس کے عضو کی کوئی کوشش ضرورت اور غرض سے خالی نہین، اخلاق جسکا ایک حد تک روحانیت سے تعلق ہے، اگر تحقیق کیجائے، تو اس کی بنیاد بھی عموماً کسی ضرورت یا غرض نفسانی پر مبنی نظر آئے گی، اس لئے ہماری ہر قسم کی بدبختیان اور آلودگیان صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہین، ضرورت اور غرض، اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے تو وہ انسان نہین فرشتہ ہی،

قابلِ غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتون اور اس کے مختلف اغراض ومقاصد کا جو ایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے، اس کی اصل حقیقت کتنی ہے؟ ہمارے دل مین آرزؤن کا ایک ڈھیر ہے، تمناؤن کی ایک بھیڑ ہے، اور خودساختہ ضرورتون کا ایک انبار ہے لیکن کیا خوشنما کپڑون، عالیشان عمارتون، لذیذ غذاؤن اور تیز رفتار سواریون کے بغیر ہم جی نہین سکتے؟ فرزند وعیال، زرومال، اور خدم وحشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہون تو کیا ہماری زندگی کا خاتمہ ہوجائیگا؟ بادشاہون نے فقیرون کی زندگی بسر کی ہے، اور زندہ رہے ہین، بروایت عام ابراہیم ادہم بادشاہ سے فقیر ہوگئے اور نہایت پرمسرت روحانی زندگی بسر کی،

خودساختہ ضرورتون کی نفی اور تحلیل کے بعد شاید انسان کی حقیقی ضرورتون کا وسیع دائرہ

ایک ڈونقطون مین محدود ہوکر رہجائے، اور وہ مایۂ قوت وغذا یعنی کھانا اور پینا ہے، جس کے بغیر انسان زندہ نہین رہ سکتا، روح اور جان کا جسم مین باقی رہنا صرف سدّرمق پر موقوف ہے، اور سدّرمق صرف کھانے کے چند لقمون اور پانی کے چند گھونٹون پر موقوف ہے، اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد کی تمام انسانی ضرورتون کا مولد ومنشا ان ہی چند لقمون اور چند گھونٹون مین افراط، وسعت تفنن اور تعیش کا نتیجہ ہے، اس بنا پر ایک انسان اور ایک فرشتہ یعنی عالمِ ناسوت اور عالمِ ملکوت کے دو باشندون مین اگر فرق وامتیاز کی دیوار قائم کیجائے تو صرف یہی ایک چیز تمام فروق وامتیازات کو محیط ہوگی، انسان کے تمام جرائم اور گناہون کی فہرست اگر تیار کیجائے، اور اس کی حرص وہوس اور قتل خونریزی کے آخری اسباب ڈھونڈھے جائین تو ان ہی دو چیزون کے افراط اور تعیش کی مزید طلب اس سلسلہ کی آخری کڑی ہوگی،

اس بنا پر دنیا کے تمام مذاہب مین مادّیات کی کثافتون سے بری اور پاک ہونے کیلئے اکل وشرب سے ایک حد تک امتناع اور پرہیز سب سے پہلی شرط رکھی گئی ہے، جس سے اصل مقصود یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضرورتون کا دائرہ کم کردے اور آخر یہ کہ قوت وغذا کی طلب وحرص سے بھی بے نیازی کے لئے متواتر کوشش جاری رکھے، کہ انسانون کے تمام گناہ اور جرائم صرف اسی ایک قوت کے نتائج مابعد ہین، اگر یہ طلب وضرورت فنا ہوجائے تو ہم کو دفعۃً عالمِ ناسوت مین عالمِ ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے لیکن جب تک انسان انسان ہے اس کو غذا سے قطعی بے نیازی ہونی ناممکن ہے، اسی بنا پر تمام مذاہب نے اس سے اجتناب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کردی ہے، اس مدت کے اندر انسانون کو اپنے تمام انسانی

ضروریات سے جن سے استغنا کسی تھوڑے زمانہ تک ممکن ہے مجتنب ہو کر تھوڑی دیر کے لئے ملاء اعلیٰ کی مقدس مخلوقات میں داخل ہو جانا چاہیئے، اور چونکہ ان مخلوقات کا فرض زندگی محض خدائے پاک کی اطاعت وعبادت ہے اس لئے انسان بھی اتنی دیر تک اپنی زندگی کا حتی الامکان یہی فرض قرار دے،

قرآن مجید نے ان تمام حقائق و رموز کو صرف ایک لفظ "تقویٰ" سے بے نقاب کر دیا ہے اور چونکہ روزہ کی یہ حقیقت تمام مذاہب میں مشترک تھی اس بنا پر قرآن مجید نے دیگر مذاہب کو بھی اشارۃً اس حقیقت میں شریک کر لیا ہے،

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا	مسلمانو! تم پر روزہ لکھا گیا جس طرح
كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ	تم سے پہلی امتوں پر لکھا گیا، تاکہ تم تقویٰ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ، (بقرہ-۲۳)	حاصل کرو،

روزہ کی غرض وغایت "تقویٰ" ہے، یعنی اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھنا، اور جذبات کے تلاطم سے اپنے کو بچا لینا، اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ ہمارے لئے ایک قسم کے روحانی علاج کے طور پر فرض ہوا لیکن آگے چل کر قرآن پاک اسلامی روزہ کی دو اور مخصوص حقیقتوں کو بھی واضح کرتا ہے،

لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ	تاکہ خدا نے جو تم کو راہ دکھائی اس پر
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ، (بقرہ-۲۳)	تم اس کی بڑائی کرو، اور شکر ادا کرو،

اس مفہوم کی توضیح کے لئے ہم کو رمضان مبارک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا،

رمضان کی اہمیت یہ مادی عالم جس طرح مادی نظام اور قانون کا پابند ہے، خدائے پاک نے

عالمِ روحانی مین بھی اسی قسم کا ایک اور نظامِ قانون اور علل و اسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے جس یقین کے ساتھ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہو کہ زہر انسان کے لئے قاتل ہے، اسی یقین کے ساتھ طبیبِ روحانی کا واقف کار کہتا ہے کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے، پیغمبر فیضانِ نبوت کے قبول کے لئے اپنی روح مین کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے، دنیا مین کب مبعوث ہوتا ہے معجزات کا ظہور اس سے کن اوقات مین ہوتا ہے، اور اپنے دعویٰ کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے، انکار و مزاحمت پر وہ کیون کر مہاجرۃ الی اللہ کرتا ہے، اور پھر کیونکر دعوت کے منکر ناکام و خاسر اور اہلِ ایمان فلاح یاب و کامیاب ہوتے ہین، ان مین سے ہر ایک چیز مرتب اور منظم قواعد کے مطابق بہ ترتیب ظہور مین آتی ہے، قرآنِ مجید مین تیرہ مقام پر "سنۃ اللہ" کا لفظ آیا ہے لیکن ان مین زیادہ تر اسی روحانی نظام و ترتیب کی طرف اشارہ ہے،

فلسفۂ تاریخ جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار اعادہ سے اصول اور نتائج تک پہنچکر ایک عام تاریخی قانون بنا لیتا ہے بعینہ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے سوانح اور تاریخین بھی اپنے واقعات کے بار بار کے اعادہ سے خصائصِ نبوت کا اصول قانون ہمارے لئے مرتب کرتی ہین،

پیغمبرانہ تاریخ کے ان ہی اصول و قوانین مین سے ایک یہ ہے کہ نبی جب اپنے کمالِ انسانیت کو پہنچکر فیضانِ نبوت کے قبول اور استعداد کا انتظار کرتا ہے تو وہ ایک مدت تک کے لئے عالمِ انسانی سے الگ ہو کر، ملکوتی خصائص مین جلوہ گر ہوتا ہے، اسی وقت سے اس کے دل و دماغ مین وحیِ الٰہی کا سرچشمہ موجین مارنے لگتا ہے، کوہِ سینا کا پرجلال پیغمبر (حضرت موسیٰ) جب

توراۃ لینے جاتا ہے تو چالیس شبانہ روز بھوکا اور پیاسا رہتا ہے[1]، کوہِ سعیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسیٰؑ) اس سے پہلے کہ اس کے منہ میں انجیل کی زبان گویا ہو، وہ چالیس روز و شب بھوکا اور پیاسا رہا[2]، اسی طرح فاران کا آتشیں شریعت والا پیغمبر (آنحضرت صلعم) نزولِ قرآن سے پہلے پورے ایک مہینے حرا، نام مکہ کے ایک غار میں، ہر قسم کی عبادتوں میں مصروف رہتا ہے، اور بالآخر اسی اثنا میں ناموسِ اکبر اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ "کا مژدۂ جانفزا لے کر نمودار ہوتا ہے[3]،

یہ واقعہ کس ماہِ مبارک کا تھا؟

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ، (بقرہ ۲۳-۲۳)	رمضان کا وہ مہینہ جس میں قرآن اترا،

یہ کس شبِ اقدس کی داستان ہے؟

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ، (دخان-۱)	ہم نے قرآن کو ایک برکت والی رات میں اتارا،

اس مبارک شب کو ہم کس نام سے جانتے ہیں؟

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ، (القدر-۱) ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں اتارا،

ان آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن سب سے پہلی بار دنیا میں نازل ہوا، اور پیغمبر امّی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دستگیری

---

[1] خروج ۳۴-۲۸ [2] متی ۴-۲ [3] صحیح بخاری حدیث بدء الوحی، ایک ماہ کا بیان صحیح مسلم کتاب الایمان باب بدء نزول وحی میں اور سیرت ابن ہشام بدء بعثت میں ہے،

کے لئے دستور نامۂ الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا، قرآن کا حامل اور اس وحیِ الٰہی کا مہبط ان دنوں ایک غار کے کونے میں یکہ و تنہا بھوکا اور پیاسا سر بزانو تھا، اس بنا پر اس ماہِ مقدس میں بھوکا اور پیاسا رہنا (روزہ) کسی عبادت گاہ میں یکہ و تنہا رہنا (اعتکاف) نزولِ وحی کی رات میں (لیلۃ القدر) بیدار و سر بسجود رہنا تمام پیروانِ محمدیؐ کے لئے ضروری تھا کہ

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ	اگر تم خدا کو پیار کرتے ہو تو میری پیروی
يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ، (آل عمران-۴)	کرو، خدا تمہیں پیار کریگا،

اس سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ، اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت اسلام میں کیا ہے؟ اور رمضانِ مبارک میں روزوں کی تخصیص اسلام میں کس بنا پر ہے؟ اس لئے اس ماہِ اقدس میں بقدرِ امکان ان ہی حالات و جذبات میں متکیف ہونا چاہئے جن میں وہ حاملِ قرآن متکیف تھا، تاکہ وہ دنیا کی ہدایت یابی اور رہنمائی کی یادگار تاریخ ہو، یہ چند خاص حالات جن کو قرآن کے مبلغ کی پیروی میں ہم اپنے اوپر طاری کرتے ہیں یہی اس ہدایت کے ملنے پر ہماری شکر گذاری اور خدا کی بڑائی ہے،

فرضیتِ صیام کا مناسب موقع سنہ ۲ھ | اگر اسلامی عبادات کا قالب روح سے خالی ہوتا، اور ان سے صرف

---

[1] روایات سے اگرچہ بتصریح نہیں معلوم ہوتا کہ آپ غارِ حرا میں روزے رکھتے تھے تاہم قرائن و اشارات سے سمجھا جاتا ہے کہ آپ اور عبادات کے ساتھ غارِ حرا میں روزے بھی رکھتے تھے، جیسا کہ بخاری (بدء الوحی) اور سیرۃ ابن ہشام سے واضح ہے کہ آپ ان دنوں میں تحنث اور اعتکاف کرتے تھے، جس کا ایک جزو روزہ ہے، آجکل کے بعض علمائے مصنفین نے بھی ان قرائن سے یہی سمجھا ہے کہ آپ ان دنوں روزہ سے رہتے تھے، (دیکھو خضری مصری کی التشریع الاسلامی صفحہ ۷ و صفحہ ۲۴۳)

جسم کی ریاضت مقصود ہوتی، تو نماز سے پہلے روزہ فرض کیا جاتا، روزہ عرفِ عام میں فاقہ کشی کا نام ہے، اور عرب کو ملک کی اقتصادی حالت کی وجہ سے، اکثر یہ سعادت نصیب ہوجایا کرتی تھی، ظہورِ اسلام کے بعد کفار نے مسلمانوں کو جن پریشانیوں میں مبتلا کردیا تھا، اس نے اُن کو عرب کے معمولی طریقۂ کسبِ معاش کی طرف سے بھی غیر مطمئن کردیا تھا، جن لوگوں نے آنحضرت صلعم کی حمایت کی تھی، تمام قبائل نے ان سے تمدنی تعلقات منقطع کرلیے تھے، اس حالت میں صرف روزہ ایک ایسا فریضہ تھا، جو عرب کی عام حالت اور مسلمانوں کی موجودہ زندگی کیلئے موزون ہوسکتا تھا، نماز و حج کی طرح اس میں کسی قسم کی مزاحمت کا بھی اندیشہ نہ تھا، وہ ایک خاموش طریقۂ عبادت تھا جو بلا روک ٹوک جاری رہ سکتا تھا، لیکن اسلام نے عبادات کو امراضِ روحانی کی دوا قرار دیا ہے، جن کا استعمال صرف اس وقت ہوسکتا ہے، جب امراضِ روحانیہ پیدا ہوجاتے ہیں، یا اُن کے پیدا ہونے کا زمانہ شروع ہوتا ہے، قواے شہوانیہ اور زخارفِ دنیا کی شیفتگی، اور لذاتِ حسیہ کے انہاک و توغل سے جو روحانی مرض پیدا ہوسکتے تھے، مکہ میں یہ تمام ساز و سامان مفقود تھے، بلکہ خود کفار کے جور و ستم نے ان جذبات کا استیصال کردیا تھا، اس لئے وہاں اس روحانی علاج کی ضرورت پیش نہیں آئی، آنحضرت صلعم مدینہ میں تشریف لائے تو کفار کے مظالم سے نجات ملی، انصار کی ایثار نفسی نے مسلمانوں کو وجہ کفاف سے بے نیاز کردیا، فتوحات کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور اس میں روز بروز وسعت پیدا ہوتی گئی، اب وہ وقت آگیا یا عنقریب آنے والا تھا کہ دنیا اپنی اصلی صورت میں مسلمانوں کے سامنے آکر ان کو اپنا فریفتہ بنائے، اس لئے درحقیقت یہ تداخل کا موسم تھا، جس میں مرض کے پیدا ہونے سے

پیشتر پرہیز کی ضرورت تھی، اور وہ پرہیز روزہ تھا جو ۲ھ میں فرض ہوا[1]، اس سے یہ شبہہ دور ہو جاتا ہے جو بعض ناواقفون کو ہوا ہے، کہ چونکہ آغاز اسلام میں مسلمانون کو اکثر فاقون سے دوچار ہونا پڑتا تھا، اس لئے ان کو روزہ کا خوگر کیا گیا، حالانکہ اصولِ اسلام کے رو سے فاقہ مستون کو روزہ کی جتنی ضرورت ہے، شکم سیرون کے لئے وہ اس سے زیادہ ضروری ہے، علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے، کہ مرغوباتِ شہوانیہ کا ترک کرنا نہایت مشکل کام تھا، اس لیے روزہ وسطِ اسلام میں فرض کیا گیا، جب کہ لوگ توحید، نماز، اور احکامِ قرآنی کے خوگر ہو چکے تھے، اس لئے احکام کا یہ اضافہ اسی زمانے کے لئے موزون تھا،

ایامِ روزہ کی تحدید

روزہ ایک قسم کی دوا ہے، اور دوا کو بقدر دوا ہی ہونا چاہئے تھا، اگر پورا سال اس دوا میں صرف کر دیا جاتا، تو یہ ایک غیر طبعی علاج ہوتا، اور مسلمانون کی جسمانی جدوجہد کا خاتمہ ہو جاتا، اور اُن کی شگفتگیِ مزاج مٹ جاتی جو عبادات کا اثر قبول کرتی ہے، لیکن اگر ایک دو روز کا تنگ اور محدود زمانہ رکھا جاتا تو یہ اتنی کم مدت تھی کہ اس میں دوا کا فائدہ بھی ظاہر نہ ہوتا، اس لئے اسلام نے روزہ کے لئے سال کے ۱۲ مہینون میں سے صرف ایک مہینہ کا زمانہ اس کے لئے مقرر کیا، اس ایک مہینہ کی تخصیص کی بھی ضرورت تھی تاکہ تمام افرادِ امت بیک وقت اس فرض کو ادا کر کے اسلام کے نظامِ وحدت کا مظاہرہ کرین، اور اس کیلئے وہی زمانہ موزون تھا جس میں خود قرآن نازل ہونا شروع ہوا یعنی رمضان، چنانچہ آنحضرت صلعم اس کے بعد جب تک زندہ رہے، اور تمام صحابہ نے یہ مہینہ ہمیشہ روزہ میں گذارا، اور آخر تک

---

[1] تاریخ ابن جریر طبری واقعات ۲ھ و زرقانی بر مواہب جلد اول صفحہ ۴۵۶ مصر و زاد المعاد ابن قیم جلد اول صفحہ ۱۶۲ مصر

کل اُمتِ محمدیہ پوری دنیا مین اسی مہینہ کو ماہِ صیام مانتی ہے، اور پورے مہینہ بھر حسب توفیق روزہ رکھتی ہے، چونکہ روزہ بہرحال مشقت کی چیز ہے، اس لئے قرآن پاک مین ماہ رمضان کے روزون کی تحدید اور فرضیت نہایت بلاغت کے ساتھ تدریجی طور سے کی گئی ہے، تاکہ نفس انسانی آہستہ آہستہ اس اہم ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل ہو، پہلے تو زمانہ کی تخصیص کے بغیر کہا گیا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ، (بقرہ-۲۳) — اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا،

اس کے بعد تسلی دی گئی کہ یہ کچھ تم ہی پر اکیلے فرض نہین کیا گیا، بلکہ

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ-۲۳) — جیسا کہ تم سے پہلی قومون پر بھی فرض کیا گیا تھا،

اب بھی مدت نہین بتائی گئی، اس کے بعد فرمایا گیا،

أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ، (بقرہ-۲۳) — چند گنے ہوئے دن،

مدت کی تعیین اب بھی نہین، البتہ اس بلیغ انداز سے زمانہ صیام کی تخفیف کا ذکر کیا گیا جس سے سننے والے پر فوراً بوجھ نہ جائے، اور فرمایا "چند گنے ہوئے دن" اس کے بعد اسلامی روزون کی آسانیون کا ذکر شروع کر دیا گیا، تاکہ طبیعت متوجہ رہے،

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (بقرہ-۲۳) — تو جو تم مین بیمار ہو، یا سفر پر ہو تو دوسرے چند دنون کی گنتی،

مگر اسی طرزِ ادا سے معلوم ہو گیا کہ یہ روزے کسی ایک خاص زمانہ مین فرض ہونگے، کہ گو

خاص زمانہ نہ ہوتا تو یہ کہنا بے کار ہوتا کہ اگر تم بیمار یا مسافر ہو تو دوسرے دنوں میں رکھو! نیز یہ بھی اشارۃً پتہ چلتا ہے کہ جو دن ہونگے وہ گنے ہوئے مقررہ ہونگے، ورنہ مَعْدُوْدَاتٍ، (گنے ہوئے) اور عِدَّۃٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ، (دوسرے دنوں کی گنتی) اور پھر آگے چل کر وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ (تاکہ تم شمار کو پورا کرلو) نہ کہا جاتا، پھر اس کے بعد دوسری آسانی بتائی،

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ،	اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتا ہو وہ ایک
فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ، (بقرہ-۲۳)	مسکین کا کھانا فدیہ دے،

اب کہا جاتا ہے کہ مگر اس اجازت کے بعد بھی روزہ ہی رکھو تو بہتر ہے،

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ	تو جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے
وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ	تو یہ بہتر ہے، اس کے لئے، اور روزہ
كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، (بقرہ-۲۳)	رکھنا تمھارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو،

ان آیتوں میں دیکھئے کہ قضا اور کفارہ کی اجازت کے باوجود روزہ رکھنا مستحسن فرمایا، اور روزہ کی اہمیت ظاہر کی،

اتنی تمہیدوں کے بعد روزہ کے گنے ہوئے دنوں کی تعیین کیجاتی ہے، کہ وہ ایک مہینہ ہے، اور جس کو ہلکا کرکے دکھانے کے لئے فرمایا گیا تھا کہ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ، چند گنے ہوئے دن، ظاہر ہے کہ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں انتیس ۲۹ اور تیس ۳۰ دنوں کے روزے چند گنتی کے دن تو ہیں ہی، بہرحال رمضان کو ماہِ صیام قرار دینے سے پہلے اس مہینہ کی عظمت

ؐ عربی زبان سے کوئی ناواقف اگر یہ کہے کہ اَیّام جمع قلت ہے جس کا اطلاق دس دنوں سے زیادہ پر نہیں

اور اہمیت بتائی گئی، فرمایا،

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ	وہ رمضان کا مہینہ جس مین قرآن اتا را
فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ	گیا، اس قرآن مین لوگون کے لئے
وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ	ہدایت ہے، اور ہدایت اور حق وبا طل
الْفُرْقَانِ، (بقرہ - ۲۳)	کی تمیز کی دلیلین ہین،

اب وہ مناسب موقع آیا جس مین یہ فرمایا جائے کہ ان چند دنون کے روزے اسی رمضان مین جس کی یہ عظمت ہو تم پر فرض کئے گئے، ارشاد ہوا،

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ	تو جو اس مہینہ کو پاوے تو اس مہینہ
فَلْيَصُمْهُ، (بقرہ - ۲۳)	بھر روزہ رکھے،

اب پورے ماہِ رمضان کے روزون کی تعین وتحدید اور اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ کی تشریح ہوگئی، عربی کا محاورہ یہ ہے کہ جو ظرفِ زمان[1] ترکیبِ نحوی مین اپنے فعل کا مفعول فیہ ہوتا ہے وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۶) ہوتا تو اس کو چاہیئے کہ ایام العرب کو جو تعداد مین سینکڑون ہین، زیادہ سے زیادہ نو لڑائیون مین محدود کر دے، اسی طرح قرآن مین اللہ تعالی نے جہان دنیا کے اور ہزارہا انقلابات کو ایام اللہ کہا ہے (ابرہیم -۱) ان کو نو تک کے انقلابات عالم مین محدود کر دیے ہین سبا سے شام تک کے سرسبز راستہ کو جو مہینون مین طے ہوتے تھے اللہ تعالی نے احسان کے موقع پر چند دن اور چند راتین فرمایا، سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ، (سبا) اور فی الایام الخالیہ (گذرے ہوئے دن) جن کا اطلاق قرآن نے پوری انسانی عمر پر، اور تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ کو زمانہ کے برسون اور صدیون پر کیا ہے، وہ نو دن سے زیادہ نہ بڑھ سکین، جمع قلت وکثرت کا یہ قاعدہ بھی کلی نہین، بلکہ عمومی، ان الفاظ کے لئے ہو جنکی جمع قلت وکثرت دونون مستعمل ہین ایام کا لفظ ان مین نہین اس کی صرف ایک ہی جمع آتی ہو، اور وہ ایواہ ہے، جو تعلیل کے بعد ایام بولا جاتا ہو، سند کے لئے دیکھو رضی شرح کافیہ، جلد دوم بحث جمع مکسر، اور لسان العرب لفظ یوم، [1] تفصیل کیلئے دیکھو رضی جلد اول بحث مفعول فیہ وظرف زمان ص ۲ و ۱۱ مطبع نول کشور ۱۸۶۸ء،

فعل اس ظرف زمانہ کو محیط ہوتا ہے، مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے مہینے بھر روزہ رکھا تو کہیں گے صَامَ شَهرًا اس کے یہ معنی نہ ہونگے کہ مہینہ میں چند دن روزے رکھے، بلکہ ایک مہینہ پورا سمجھا جائے گا، اور اگر یوں کہنا ہو کہ اس نے ایک سال روزہ رکھا تو عربی میں یوں کہیں گے صَامَ سَنَةً (سال بھر روزہ رکھا) اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس آیتِ پاک میں پورے رمضان بھر روزہ رکھنے کا ذکر ہے، اور چونکہ لفظ "شہر" یعنی "مہینہ" کہا گیا ہے، اس لئے مہینہ کے شروع سے ان روزوں کا آغاز اور مہینہ کے ختم پر ان کا خاتمہ ہوگا، قمری مہینہ جس کا عرب میں رواج تھا، اسکے مہینے کبھی تیس اور کبھی ۲۹ دن کے ہوئے ہیں، جیسی روایت ہو، وہی ماہِ صیام پر بھی صادق آئیگا، جیسا کہ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰت تمام صحابہ کرام، خلفائے راشدین اور جمیع فرقِ اسلام کے عمل اور تواتر سے ثابت اور واضح ہے، اور احادیثِ صحیحہ میں اس کی پوری تصریحات مذکور ہیں،

ایک نکتہ قرآنِ پاک نے اس رمضان کے روزہ کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے،

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ	تو جو اس مہینہ کو پاوے، وہ اس مہینہ
فَلْيَصُمْهُ، (بقرہ - ۲۳)	بھر روزہ رکھے،

لفظ شَهِدَ کے لغوی معنی، کسی مقام یا زمانہ میں موجود اور حاضر رہنے کے ہیں، اسی سے شہادت اور شاہد کے الفاظ نکلے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ روزے اسی پر واجب ہیں، جو اس ماہِ صیام میں موجود اور حاضر ہو، اس ماہِ صیام میں غیر موجود اور غیر حاضر ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ماہِ صیام آنے سے پہلے وہ شخص غیر حاضر ہو، یعنی اس دنیا میں موجود نہ ہو، جس میں وہ ماہِ صیام آیا، یا دوسری صورت یہ ہے کہ شخص اپنی جگہ پر موجود ہو، مگر ماہِ صیام کا وہاں گذر نہ ہو، یہ صورت اُن قطعات ارضی

مین پیش آئے گی، جہان شب و روز کا وہ نظام موجود نہین جو باقی متمدن دنیا مین ہے، مثلاً جن
مقامات مین کئی مہینون کے دن اور کئی مہینون کی راتین ہوتی ہین کہ وہان رمضان کی آمد کا
سوال ہی نہین، ہان اگر وہان کے مسلمان چاہین، تو بقیہ متمدن ممالک کے کیلنڈر (تقویم) کو معیار
مان کر روزے رکھین، اور کھولین، (جیسا کہ حدیث دجال سے جو صحاح مین ہے ثابت ہے)
اسی طرح وہ ملک جہان بیس بیس گھنٹون کے دن ہون تو جو لوگ وہان روزہ کا تحمل نہ کرسکتے
ہون وہ آیت

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ	اور جو بمشکل روزہ رکھ سکین ان پر
طَعَامُ مِسْكِينٍ، (بقرہ - ۲۳)	ایک مسکین کا کھانا ہے،

پر عمل کرسکتے ہین،

لفظ اطاقۃ کے معنی مین بعض صاحبون کو یہ شبہہ ہوا ہے کہ اس کے معنی صرف توانائی
وسعت اور قدرت کے ہین، بمشکل قدرت اور طاقت رکھنے کے نہین ہین، مگر یہ صحیح نہین،
اطاقۃ طاقۃ کا باب افعال سے مصدر ہے اس کا ثلاثی مصدر کم استعمال مین آتا ہے، اور
طاقۃ کے لغوی معنی لسان العرب اور تاج العروس وغیرہ مین یہ لکھے ہین،

والطوق الطاقۃ ای اقصیٰ	طوق کے معنی طاقت کے ہین،
غایتہ، وھو اسم لمقدار	یعنی قوت کی انتہائی غایت، اور
ما یمکن ان یفعلہ بمشقۃ	وہ اس مقدار کا نام ہے جس کو کوئی
منہ،	مشقت کے ساتھ کرسکے،

حضرت ابن عباسؓ غالباً یہی معنی قرار دے کر حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی) اور بڈھے کو فرضیت سے مستثنیٰ سمجھتے تھے[1]،

روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب

علم اور فطرت شناسی کے بعض مدعی، جو عام عبادات و پرستش کی غرض وغایت یہ قرار دیتے ہیں کہ وحشی انسانوں کا تخیل یہ ہے کہ خدا ہماری جسمانی تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا ہے، وہ روزہ کی حقیقت بھی صرف اسی قدر سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی خوشنودی کے لیے جسمانی زحمت کشی ہے، اور ان غلط فہمیوں کے لئے دیگر مذاہب میں گو نفرتسکا ہیں ہو جود ہیں، چنانچہ جوگیوں اور جنیوں میں روزہ کی غیر معمولی مدت اور اس کی سختیاں اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، یہودیوں کی اصطلاح میں روزہ کے لئے "نفس کو دکھ دینے" کی اصطلاح جاری ہے، چنانچہ توراۃ میں روزہ کے لئے اکثر اسی قسم کا فقرہ مستعمل ہے، سفر الاحبار (۱۶-۲۹) میں ہے،

"اور یہ تمہارے لئے قانون دائمی ہوگا کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ تم سے ہر ایک خواہ وہ تمہارے دیس کا ہو، خواہ پردیسی جس کی بود و باش تم میں ہے، اپنی جان کو دکھ دے"۔

توراۃ کے سفر العدد (۲۹-۷) میں ہے،

"اور اس ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ مقدس جماعت ہوگی، اور تم اپنی جانوں کو دکھ دو اور کچھ کام نہ کرو"،

یہ اصطلاح توراۃ کے اور مقامات میں بھی مذکور ہے لیکن قرآن مجید نے اس کے لئے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ "صوم" ہے، صوم کے لغوی معنی احتراز و اجتناب اور خاموشی کے ہیں جس سے

---

[1] ابو داؤد کتاب الصوم باب من قال ہی مثبتہ للشیخ والحبلی،

صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا روزہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے، خدا نے قرآن پاک مین مسلمانون کو جہان روزہ کا حکم دیا ہے وہان یہ الفاظ بھی اضافہ فرما دیئے ہین،

یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ-۲۳)	خدا تمھارے ساتھ نرمی چاہتا ہے سختی نہین چاہتا،

اسلام کا عام قانون ہے،

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، (بقرہ-۴۰)	خدا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہین دیتا،

قرآن نے اپنے مبلغ کی توصیف ان الفاظ مین کی ہے،

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ (اعراف-۱۹)	وہ ان کو نیکیون کا حکم دیتا ہے، برائیون سے روکتا ہے، اور گندہ چیزون کو حرام کرتا ہے، اور اس طوق اور زنجیرون کو جو ان کے اوپر پڑی ہین، ان سے اتارتا ہے،

ان امور کا منشا یہ ہے کہ اسلامی عبادات و احکام مین کوئی چیز بھی اس غرض سے نہین رکھی گئی کہ اس سے انسان کی جان کو دکھ پہنچایا جائے، روزہ بھی اسی سلسلہ مین داخل ہے، اور اسی لئے اسلام نے روزہ کی اُن سختیون کو جو لوگون نے بڑھا رکھی تھین، بتدریج کم کر دیا،

روزہ مین اصلاحات اسلام نے روزہ کی سختیون کو جس حد تک کم کیا اور اس مین جو سہولتین پیدا

کین وہ حسب ذیل ہین،

۱۔ سب سے اوّل یہ کہ اسلام سے پہلے جو الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے، ان مین اکثر روزہ صرف پیروون کی کسی خاص جماعت پر فرض تھا، مثلاً ہندؤن مین غیر برہمن کے لئے کوئی روزہ ضروری نہین، پارسیون کے یہان صرف دستور اور پیشوا کے لئے روزہ ہے، یونانیون مین صرف عورتون کے لئے روزہ تھا لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روزہ کوئی اچھی چیز ہے تو تمام پیروانِ مذہب کیلئے برابر طور سے ضروری ہے،

اسلام مین پیشوا، غیر پیشوا، عورت مرد کی کوئی تخصیص نہین، اس نے تمام پیرؤون کو عام حکم دیا اور اس مین کسی چیز کی کوئی تخصیص نہین کی،

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ	اس مہینہ مین جو موجود ہو وہ مہینہ بھر
فَلْيَصُمْهُ۔ (بقرہ - ۲۳)	روزہ رکھے،

۲۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب مین عموماً شمسی سال معتبر ہے شمسی سال مین روزہ کی جو تاریخین جن موسمون مین متعین ہونگی، ان مین تغیر و تبدل ناممکن ہے، اس بنا پر اگر وہ گرمی یا سردی کے موسم مین چھوٹے یا بڑے دنون مین واقع ہوتے ہین تو یا تو وہ مختلف ملکون مین ہمیشہ کے لیے تکلیف دہ یا ہمیشہ کے لئے آرام دہ ہین، اسلام کے روزون کی تاریخین قمری مہینون سے ہین، جو موسم اور چھوٹے اور بڑے دنون کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہین، اس لئے اسلامی روزہ کا مہینہ ہر ملک مین ہر موسم مین آتا ہے، اور اس بنا پر اس کی سختی و نرمی بدلتی رہتی ہے،

۳۔ جہانتک دیگر مذاہب کی الہامی کتابون کے پڑھنے کا موقع ملا ہے، روزہ کی تاکید

اور حکم کے متعلق کسی حالت انسانی کی تخصیص و استثنا نظر سے نہین گذری، توراۃ مین تو یقیناً مذکور نہین، بلکہ یہانتک ہے کہ اگر کسی وجہ سے روزہ نہ رکھے تو وہ کٹ جائے گا یا قتل ہو جائے گا، بلکہ یہ ہے کہ اس پردیسی پر بھی روزہ فرض ہوگا جو گو یہودی نہین مگر یہودیون کے پاس آکر رہا ہو،[1]
لیکن قرآن مجید نے نہایت فطرت شناسی کے ساتھ ہر قسم کے معذور و مجبور لوگون کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا، بچے مستثنیٰ ہین، عورتین ایام حمل و رضاعت اور دیگر مخصوص ایام مین روزہ سے مستثنیٰ ہین، بڈھے، بیمار اور مسافر مستثنیٰ ہین، کمزور اشخاص جو روزہ پر فطرۃً قادر نہین مستثنیٰ ہین، بیمار و مسافر اور عارضی معذور، بیماری، حالت سفر اور عذر کے دفع ہونے کے بعد اتنے دنون کی قضا بعد کو رکھین، اور جو دائمی طور سے معذور ہین، وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دین،

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ اَيَّامٍ اُخَرَ، وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ، (بقرہ ۲۳-۲۳)

اگر تم مین کوئی بیمار ہو یا مسافر ہو وہ رمضان کے بعد اور دنون مین روزے رکھے، اور وہ لوگ جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہون اُن پر ایک مسکین کا کھانا ہے،

ترمذی مین ہے،

عن انس قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ وضع

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ خدا نے

[1] احبار ۱۶ ۲۹،

عن الحامل والمرضع الصوم ، — حاملہ اور دودھ پلانے والی سے روزہ اتار لیا،

۴- اور مذہبوں میں روزہ کے ایام نہایت غیر معتدلانہ تھے، یا تو چالیس چالیس روز کا فاقہ تھا یا روزہ کے دنوں میں غلہ اور گوشت کے علاوہ پھل تک کھانے کی اجازت تھی، اسلام نے اس میں بھی توسط اختیار کیا، یعنی روزہ کے اوقات میں گو ہر قسم کے کھانے پینے سے روک دیا، مگر اس کی مدت ایک مہینہ تک صرف آفتاب کے طلوع سے غروب تک چند گھنٹوں کی رکھی۔

۵- چینیوں کے یہاں، ایک ایک روزہ ہفتوں کا ہوتا تھا، عرب کے عیسائی راہب کئی کئی روز کا روزہ رکھتے تھے، یہودیوں کے ہاں پورے چوبیس گھنٹے کا روزہ تھا، اسلام نے صرف صبح سے شام تک کا ایک روزہ قرار دیا،

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (بقرہ۔۲۳) — پھر روزہ کو رات تک ختم کرو،

۶- یہودیوں کے ہاں یہ تھا کہ روزہ کھولنے کے وقت ایک دفعہ جو کھا لیتے، کھا لیتے، پھر نہیں کھا سکتے تھے، یعنی اسی وقت سے دوسرا روزہ شروع ہو جاتا، عرب میں یہ رواج تھا کہ سونے سے پہلے جو کھا لیتے کھا لیتے، سو جانے کے بعد کھانا پھر ناجائز تھا، ابتداءً اسلام میں بھی یہی قاعدہ تھا، ایک دفعہ رمضان کا زمانہ تھا، ایک صحابی کے گھر میں شام کا کھانا نہیں تیار ہوا تھا، ان کی بیوی کھانا پکا رہی تھیں، وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے، کھانا پک چکا تو اُن کی بیوی کھانا لیکر آئیں وہ سو چکے تھے، اس لئے کھانا نہیں کھا سکتے تھے، دوسرے روز پھر روزہ کا دن تھا، ان کو غش آگیا، اس پر یہ آیت اُتری،

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ — اور اس وقت تک کھاؤ اور پیو

لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ
الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ، (بقرہ-۲۳)

جب تک رات کا تاریک خط صبح
کے سپید خط سے ممتاز نہ ہو جائے،

۷ - شروع اسلام مین دستور تھا، کہ روزہ کے دنون مین راتون کو بھی میان بیوی علیحدہ رہتے تھے، لیکن چونکہ یہ مدت غیر فطری تھی، اکثر لوگ اس مین مجبور ہو کر نفسانی خیانت کے مرتکب ہو جاتے تھے، اس لئے اسلام نے صرف روزہ کی حالت تک کے لئے یہ ممانعت محدود کر دی، اور رات کو اجازت دیدی،

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ
الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ هُنَّ
لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ
لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ أَنَّكُمْ
كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ
فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ
فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَ
ابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ، (بقرہ-۲۳)

روزہ کی شب مین بیویون سے مقاربت
تمھارے لئے حلال کی گئی، وہ
تمھاری پوشاک ہین اور تم اُن کی،
خدا جانتا تھا کہ تم اپنے نفس سے
خیانت کرتے تھے، تو اُس نے
معاف کیا، اب بیویون سے ملو جلو
اور خدا نے تمھارے مقدر مین جو کچھ
رکھا ہے، (یعنی اولاد) اسکی تلاش کرو

۸ - بھول چوک اور خطا و نسیان اسلام مین معاف ہے، اس بنا پر اگر بھولے سے روزہ دار کچھ کھا پی لے، یا کوئی اور کام بھول کر ایسا کر بیٹھے جو روزہ کے خلاف ہے تو اس سے روزہ نہین ٹوٹتا،

عن ابی ھریرۃ من اکل او	ابوہریرہ سے مروی ہے، جو بھول کر
شرب ناسیا فلا یفطر فانما	کھائے یا پئے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا
ھو رزق اللہ، (ترمذی)	کہ یہ تو خدا کی روزی ہی تھی،

۹- اسی طرح اُن افعال سے جو گو روزہ کے منافی ہیں لیکن وہ قصداً سرزد نہیں ہوئے بلکہ بلا ارادہ از خود سرزد ہوئے ہیں، روزہ نہیں ٹوٹتا،

قال النبی صلعم لا یفطر	پیغمبر خدا نے فرمایا جس کو قے ہو گئی
من قاء و(۱) من احتلم،	یا سوتے میں غسل کی ضرورت پیش آگئی
(ابو داؤد)	اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا،

۱۰- یہودیوں میں اکثر روزے چونکہ مصائب کی یادگار، اور غم کی علامت تھے، اس لئے روزہ کی حالت میں وہ زیب و زینت نہیں کرتے تھے، اور غم کی صورت بنائے رہتے تھے حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا:

"پھر جب تم روزہ رکھو، ریاکاروں کے مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منھ بگاڑتے ہیں، کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ظاہر ہوں میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے، پر جب تو روزہ رکھے اپنے سر پر چکنا لگا، اور منھ دھو، تاکہ تو آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، آشکارا تجھے بدلہ دے" (متی ۶-۱۶)

(۱) قے ہونے کی فقہ حنفی میں کئی صورتیں ہیں، ان میں سے بعض میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور بعض میں نہیں،

اسلام میں بھی روزہ کی اصل خوبی یہی ہے، اس لئے روزہ کی حالت میں سر میں تیل ڈالنا، سرمہ لگانا، خوشبو ملنا، اسلام میں روزہ کے منافی نہیں، منہ دھونے اور مسواک کرنے کی بھی تاکید ہے، اس سے طہارت اور پاکی کے علاوہ یہ غرض بھی ہو کہ روزہ دار ظاہری پریشان حالی اور پراگندگی کی نمایش کر کے ریا میں گرفتار نہ ہو، اور نہ یہ ظاہر ہو کہ وہ اس فرض کے ادا کرنے میں اور خدا کے اس حکم کے بجالانے میں نہایت تکلیف، مشقت اور کوفت برداشت کر رہا ہے بلکہ ہنسی خوشی، رضامندی اور مسرت ظاہر ہو،

۱۱۔ روزہ دوسری عبادتوں کے مقابلہ میں ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ تکلیف اور مشقت کی چیز ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ عام افراد اُمت کو اس میں غلو اور تعمق سے باز رکھا جائے؛ خود آنحضرت صلعم اکثر و بیشتر روزے رکھتے تھے، مہینوں میں کچھ دن مقرر تھے، ہفتوں میں بھی کچھ دن مقرر تھے، اُن کے علاوہ کبھی کبھی رات دن کا متصل روزہ بھی رکھتے تھے، لیکن دوسرے روزوں کو صرف استحباب تک رکھا، اور رات دن کے متصل روزہ کی تو مطلقاً ممانعت فرمائی، بعض صحابہ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا،

ایکم مثلی انی ابیت یطعمنی ربی ویسقینی،	تم میں مجھ سا کون ہے؟ مجھے تو میرا خدا کھلاتا پلاتا ہے، (یعنی روحانی غذا)

لوگوں نے اصرار کیا تو آپ نے کئی کئی دن تک متصل روزے رکھنے شروع کئے، جب مہینہ گذر گیا تو بطور سرزنش کے فرمایا، کہ اگر مہینہ ختم نہ ہو گیا ہوتا، تو میں اس سلسلہ کو اور بھی بڑھاتا، [1]

---

[1] بخاری جلد ا صفحہ ۲۶۳،

روزہ کے مقاصد

اس تفصیل کے بعد ہم کو غور کرنا ہے کہ اسلام مین روزہ کے کیا مقاصد ہین، گو سطور بالا سے کسی قدر ان کا انکشاف ہو چکا ہے، مگر ہم مزید تفصیل سے ان کی وضاحت کرنا چاہتے ہین

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی تعلیم ربانی محض حکم کے طور پر نہین ہے، بلکہ وہ سرتاپا حکمتون اور مصلحتون پر مبنی ہے، اس کے فرائض کی عمارت روحانی، اخلاقی، اجتماعی اور مادی فوائد اور منفعتون کے چارگانہ ستونون پر قائم ہے، اور ان مصلحتون اور منفعتون کے اصول اور جوہر کو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفۂ الہامی نے ظاہر کر دیا ہے، اور بتا دیا ہے، چنانچہ روزہ کے مقاصد اور اس کے اغراض بھی اس نے جیسا کہ ابھی کہا گیا تین مختصر فقرون مین بیان کر دیئے ہین

۱- لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (بقرہ - ۲۳)	۱- تاکہ خدا نے جو تم کو ہدایت کی ہے اس پر اس کی بڑائی اور عظمت ظاہر کرو،
۲- وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ، (بقرہ - ۲۳)	۲- اور تاکہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا کا شکر کرو،
۳- لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، (بقرہ - ۲۳)	۳- تاکہ تم پرہیزگار بنو، (یا تم مین تقویٰ پیدا ہو،)

اوپر گذر چکا ہے کہ شریعت والے پیغمبرون کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان مین سے ہر ایک نے شریعت کے اترنے سے پہلے ایک مدت متعینہ تک ملکوتی زندگی بسر کی، اور تا امکان کھانے پینے کی انسانی ضرورتون سے وہ پاک رہے، اور انھون نے اس طرح اپنی روح کو عالم بالا سے اتصال کے لائق بنایا، یہان تک کہ وہ مکالمۂ الٰہی سے سرفراز ہوئے، اور پیغام ربانی

نے ان پر نزول کیا، حضرت موسیٰؑ نے چالیس روز اسی طرح بسر کیے، تب توراۃ کی لوحین اُن کو سپرد ہوئین، حضرت عیسیٰؑ نے بھی چالیس روز اسی طرح گذارے، تب حکمت کا سرچشمہ ان کی زبان اور سینہ سے ابلا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا مین ایک مہینہ یعنی ۳۰ دن مصروفِ عبادت رہے، اس کے بعد فیضانِ الٰہی کا نور اس غار کے دہانہ سے طلوع ہوا،

حاملِ قرآن کی پیروی اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کی فرضیت سے سب سے پہلا مقصد انبیاء علیہم السلام کے ان متبرک مقدس ایام کی تقلید اور پیروی ہے، یہودی بھی حضرت موسیٰؑ کی پیروی مین ان دنون کا روزہ مناسب اور صرف چالیسوین دن کا روزہ فرض سمجھتے ہین، عیسائیون کو بھی حضرت عیسیٰؑ کی تقلید اور پیروی مین یہی چاہئے تھا، مگر انھون نے پال کی پیروی مین جیسے حضرت عیسیٰؑ کے اور احکام وسنن کی اتباع نہین کی اس کی بھی نہ کی، اسی طرح مسلمانون کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے رسول کی پیروی مین یہ چند دن اسی طرح گذارین، چنانچہ فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ	اے مسلمانو! جیسے تم سے پہلے لوگون
الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ	پر (ان کے رسولون کی پیروی اور
مِنْ قَبْلِكُمْ،	ہدایت ملنے کے شکریہ مین) روزہ فرض
(بقرہ - ۲۳)	کیا گیا تھا تم پر بھی فرض کیا گیا،

دینِ الٰہی کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور تعلیمِ محمدی کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گذشتہ امتون نے اپنے اپنے پیغمبرون کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کو چند ہی روز مین بھلا دیا، محمد رسول اللہ صلعم کی لاکھون اور کرورون امت اس کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہے، اور

اپنے رسول کی پیروی مین وہ بھی ایک مہینہ تک اسی طرح دن کو کھانے پینے اور دوسری نفسانی خواہشون سے اپنے کو پاک رکھتی اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے،

شکریہ کے | یہ روزہ انبیاء علیہم السّلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہین ہے، بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان کا جو اس نے اپنے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانون پر کیا، شکریہ ہے، اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے، وہ کتابِ الٰہی وہ تعلیمِ ربّانی، وہ ہدایتِ روحانی جو ان ایّام مین انسانون کو عنایت ہوئی جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ، اور ظلماتی سے نورانی بنایا، پستی و ذلّت کے عمیق غار سے نکال کران کو اوجِ کمال تک پہنچایا، ان کی وحشت کو تہذیب واخلاق سے، ان کی جہالت کو علم ومعرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے، اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا جس نے ان کی قسمتون کے پانسے الٹ دیئے، اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانون سے ان کے کاشانون کو معمور کر دیا جس نے ذرّۂ بے مقدار کو آفتاب اور مشتِ خاک کو ہمدوشِ ثریا بنا دیا، قرآنِ پاک اپنے ان الفاظ مین اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے،

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ، (بقرہ ۲۳-۲۳)	اور (یہ رمضان کا روزہ) اس لئے (فرض ہوا) تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی، اور تاکہ تم اسکا شکریہ ادا کرو

اس ہدایتِ ربانی اور کتابِ الٰہی کے عطیہ پر شکر گذاری کا یہ رمز واشارہ ہے کہ اس مہینہ کی راتون مین مسلمان اس پوری کتاب کو نمازون (تراویح) مین پڑھتے اور سنتے ہین، اور اس

مہینہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر اللہ اکبر کا ترانہ بلند کرتے ہوئے عیدگاہوں میں جاتے، اور خوشی و مسرت کے ولولوں کے ساتھ عید کا دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں،

تقویٰ | روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقویٰ اور دل کی پرہیزگاری اور صفائی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ فرمایا گیا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ	اے ایمان والو، تم پر بھی اسی طرح
الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ	روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے
مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ،	پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا، تاکہ تم تقویٰ
(بقرہ ۲۳-۲۳)	حاصل کرو،

"تقویٰ" دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجک معلوم ہونے لگتی اور نیک باتوں کی طرف اس کو بے تابانہ تڑپ ہوتی ہے اور روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو، بات یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں میں گناہوں کے اکثر جذبات بہیمی قوت کی افراط سے پیدا ہوتے ہیں، روزہ انسان کے ان جذبات کی شدت کو کمزور کرتا ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان نوجوانوں کا علاج جو اپنی مالی مجبوریوں کے سبب نکاح کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، اور ساتھ ہی اپنے نفس پر بھی قابو نہیں رکھتے، روزہ بتایا ہے، اور فرمایا ہے، کہ "روزہ شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لئے بہترین چیز ہے"[1]

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم،

۲۔ اسلام کے مختلف احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ روزہ کی مشروعیت مین ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ اس مین اس بات کا خاص اشارہ ہے کہ ۱۲ مہینون مین ایک مہینہ ہر مسلمان کو اس طرح بسر کرنا چاہئے کہ دن رات مین ایک وقت کھانا کھائے، اور ہوسکے تو ایک وقت کا کھانا اپنے فاقہ زدہ، محتاج اور غریب بھائیون کو کھلادے، ان تمام احکام پر نظر ڈالئے جو فدیہ اور کفارہ سے متعلق ہین، تو معلوم ہوگا کہ ان سب مواقع مین روزہ کا بدل غریبون کو کھانا کھلانا، قرار دیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ اور غریبون کو کھانا کھلانا، یہ دونون باہم ایک دوسرے کے قائم مقام ہین، ایسے لوگ جو فطرۃً کمزور، یا دائم المرض یا بہت بڈھے ہین، اور جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہین ان کو روزہ کے بجائے حکم ہوتا ہے،

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ	اور جو لوگ مشکل سے روزہ رکھ سکتے
طَعَامُ مِسْكِيْنٍ، (بقرہ-۲۳)	ہون، وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دین،

حج مین اگر کسی عذر یا بیماری کے سبب سے احرام سے پہلے سر منڈانا پڑے،

فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ	تو روزہ یا خیرات یا قربانی فدیہ دے
اَوْ نُسُكٍ، (بقرہ-۲۴)	

جو لوگ حج اور عمرہ ایک احرام مین ادا کرین جسکو تمتع کہتے ہین، ان پر قربانی واجب ہے جو غریبون ہی مین تقسیم کیجاتی ہے، اگر یہ نہ ہوسکے تو

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ	تو دس روزے رکھین، تین حج مین اور
وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ، (بقرہ-۲۴)	سات گھر آکر،

حج مین جانور کا شکار منع ہے، اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے تو اس پر اسی جانور کے مثل کی قربانی لازم آتی ہے، جو منیٰ لیجا کر ذبح کیا جائے، اگر یہ نہ ہو سکے تو

اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ — یا چند مسکینون کا کھانا یا اسی کے

عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا (مائدہ-۱۳) — برابر روزے،

اگر کوئی بالارادہ قسم کھا کر توڑ دے، تو اس پر دس مسکینون کا کھانا واجب ہے، یا ایک غلام کو آزاد کرنا، اگر یہ نہ ہو سکے،

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ (مائدہ-۱۲) — تو تین دن کے روزے،

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دے کر اس کو اپنے اوپر حرام کرلے، اور پھر اس کی طرف رغبت کرے، تو اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہے لیکن اگر یہ اس کی قدرت مین نہ ہو،

فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ (مجادلہ-۱) — تو دو مہینے متواتر روزہ،

اور یہ بھی ممکن نہ ہو،

فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا (مجادلہ-۱) — تو ساٹھ مسکینون کو کھانا کھلانا،

ان احکام سے بخوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت، صدقہ و خیرات، غریبون کے کھلانے، بلکہ غلامون کو آزاد کرنے کا قائم مقام ہے،

۳- روزہ ہی امیرون اور پیٹ بھرون کو بتاتا ہے کہ فاقہ مین کیسی اذیت، اور بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے، اور اسی وقت اس کو اپنے غریب اور فاقہ سے نڈھال بھائیون

کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ چند لقمون سے ان کی تکلیف کو دور کرنا کتنا بڑا ثواب ہی، جو خود بھوکا نہ ہو اس کو بھوک کی، اور جو خود پیاسا نہ ہو اس کو پیاس کی تکلیف کا احساس کیونکر ہوگا، بقول حافظ ابن قیم سوزِ جگر کے سمجھنے کے لئے پہلے سوختہ جگر ہونا ضروری ہے، روزہ اسی احساس کو زندہ اور ایثار، رحم اور ہمدردی کے جذبہ کو بیدار کرتا ہے، چنانچہ خود آنحضرت صلعم کا حال یہ تھا، کہ بعض صحابہ کہتے ہین کہ رمضان مین آپ کی سخاوت "بادروان" کی طرح ہوتی[1] تھی، اور اسی کا اثر ہے کہ آج تک مسلمانون کے یہان اس مہینہ مین غریبون اور فقیرون کی امداد و اعانت اور اُن کو شکم سیر کیا جاتا ہی،

۴- انسان کو کتنا ہی نعمت و ناز کے گودون مین پلا ہو، اور مال و دولت سے مالا مال ہو، تاہم زمانہ کا انقلاب اور زندگی کی کشمکش اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم کو مشکلات کا عادی اور سختیون کا خوگر بنائے، جہاد کے ہر متوقع میدان کے لئے، بھوک اور پیاس کے تحمل اور صبر اور ضبط سے اپنے آپ کو آشنا رکھنے کی ضرورت ہے، یہی سبب ہے کہ مسلمان مجاہد اور سپاہی میدانِ جنگ مین بھوک اور پیاس کی تکلیف کو جس طرح ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے، دوسرا نہین کرتا، یہ گویا ایک قسم کی جبری فوجی ورزش ہے، جو ہر مسلمان کو سال مین ایک مہینہ کرائی جاتی ہے، تاکہ وہ ہر قسم کے جسمانی مشکلات کے اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہے اور دنیا کی کشمکش، جد و جہد، سختی و محنت کا پوری طرح مقابلہ کر سکے، اسی لئے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی صبر کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے، تاکہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے،

---

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی،

۵- جس طرح حد سے زیادہ فاقہ اور بھوک انسان کے جسم کو کمزور کر دیتی ہے اس سے کہین زیادہ حد سے زیادہ کھانا انسان کے جسم کو مختلف امراض اور بیماریون کا نشانہ بنا دیتا ہی طب کے تجربے اور مشاہدے یہ ثابت کرتے ہین کہ اکثر حالتون مین انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کے لئے ضروری ہے مختلف بیماریون کا یہ قطعی علاج ہے طبی ہدایت ہی کہ کم از کم ہفتہ مین ایک وقت کھانا ناغہ کیا جائے، اسلام مین ہفتہ وار مسنون و مستحب روزے بھی ہین، مگر اسی کے ساتھ سال مین ایک دفعہ جسمانی فضلہ کی تخفیف کے لئے فرضاً روزہ رکھنا نہایت نفع بخش ہی جو مسلمان رمضان کے روزے رکھتے ہین، ان کو ذاتی تجربہ ہوگا کہ ایک مہینہ کا روزہ کتنی بیماریون کو دور کر دیتا ہے، بشرطیکہ انھون نے از خود کھانے پینے اور افطار و سحور مین بے اعتدالی نہ کی ہو، اس لئے یہ ایک قسم کا سالانہ جبری جسمانی علاج بھی ہی،

۶- انسان اگر اپنے دن رات کے اشغال اور مصروفیتون پر غور کرے، تو اُسے معلوم ہوگا کہ اس کے وقت کا ایک اچھا خاصہ حصہ محض کھانے پینے اور اس کے اہتمام مین صرف ہو جاتا ہے، اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا کم کردے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ جائے، یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت مین صرف کیا جا سکتا ہے اگر ہمیشہ نہین تو کم از کم سال مین ایک دفعہ تو اس غیر ضروری ضرورت کو کم کر کے یہ سعادت حاصل کی جائے،

۷- انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لئے مناسب فاقہ بہترین علاج ہی جب انسان کا معدہ ہضم اور فتور سے خالی اور دل و دماغ بخارات معدی کی مصیبت سے

پاک ہو، چنانچہ بڑے بڑے اکابر کا تجربہ اس حقیقت پر گواہ صادق ہے،

۸- روزہ بہت سے گناہوں سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے، اس لئے یہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے، چنانچہ اوپر جہاں روزہ اور خیرات کی یکسانی اور باہم بدل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، وہیں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گناہوں اور غلطیوں کا کفارہ بھی ہے، بلکہ توراۃ میں تو اس کو خاص کفارہ ہی کہا گیا ہے[1]، اور اسلام میں بھی بہت سے موقعوں میں یہ کفارہ بتایا گیا ہے، چنانچہ اگر قسم کھا کر کوئی اس کو توڑنے کا گناہ کرے تو اس گناہ کی معافی کی یہ صورت ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے، اگر اس کی سکت نہ ہو،

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ	تو تین دنوں کے روزے یہ تمہاری
كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ	قسموں کا کفارہ ہے، جب قسم کھا بیٹھو
وَاحْفَظُوْۤا اَيْمَانَكُمْ ؕ (مائدہ-۱۲)	اور اپنی قسموں کا لحاظ رکھو،

اسی طرح حج کی حالت میں شکار کرنے پر اگر قربانی نہ ہو سکے اور چند مسکینوں کو کھانا نہ کھلایا جا سکے تو

اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا	یا اس کے برابر روزہ، تاکہ وہ اپنے
لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ	گناہ کی سزا چکھے، اللہ نے معاف کیا
عَمَّا سَلَفَ ، (مائدہ-۱۳)	جو ہو چکا،

علیٰ ہذا اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کے ہاتھ سے غلطی سے قتل ہو جائے تو اس مسلمان پر خونبہا

---

[1] احبار ۱۶ - ۳۰ سے ۳۴ تک و ۲۳ - ۲۷،

یعنی ایک مسلمان غلام آزاد کرنا لازم آتا ہے، اگر غلام آزاد کرنے کی صلاحیت نہ ہو،

فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ، (نسآء-۱۳) — تو اس گناہ کو اللہ سے بخشوانے کیلئے دو مہینے کے لگاتار روزے،

اس سے اندازہ ہوگا کہ روزہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے،

۹-اس حقیقت کو ایک اور روشنی میں دیکھئے تو روزہ کی یہ امتیازی خصوصیت نمایاں ہوجائے گی، روزہ کی بھوک اور فاقہ ہمارے گرم و مشتعل قوی کو، تھوڑی دیر کے لئے سرد کر دیتا ہے، کھانے اور پینے کی مصروفیت سے ہم آزاد ہوتے ہیں، دوسرے سخت کاموں سے بھی ہم اس وقت پرہیز کرتے ہیں، دل و دماغ شکم سیر معدہ کے فاسد بخارات کی پریشانی سے محفوظ ہوتے ہیں، ہمارے اندرونی جذبات میں ایک قسم کا سکون ہوتا ہے، یہ فرصت کی گھڑیاں، یہ قوی کے اعتدال کی کیفیت، یہ دل و دماغ کی جمعیتِ خاطر، یہ جذبات کا سکون، ہمارے غور و فکر، اپنے اعمال کے محاسبہ، اپنے کاموں کے انجام پر نظر، اور اپنے کئے پر ندامت اور پشیمانی اور خدائے تعالیٰ کی بازپرس سے ڈر کے لئے بالکل موزوں ہے، اور گناہوں سے توبہ اور ندامت کے احساس کے لئے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کر دیتا ہے، اور نیکی اور نیک کاموں کے لئے ہمارے وجدانی ذوق و شوق کو ابھارتا ہے، یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمانہ تمام تر عبادتوں اور نیکیوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے، اس میں تراویح ہے، اس میں اعتکاف رکھا گیا ہے، اس میں زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے، اور خیرات کرنا سب سے بہتر ہے، حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی تو گو سدا بہار تھی لیکن رمضان

کے موسم مین وہ تیز ہواؤن سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی[1]،

۱۰۔ ان ہی باتون کو سامنے رکھ کر یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہین ہے، بلکہ یہ درحقیقت دل اور رُوح کی بھوک اور پیاس کا نام ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی متوقع غرض و غایت تقویٰ قرار دی ہے، اگر روزہ سے روزہ کی یہ غرض وغایت حاصل نہ ہو تو یہ کہنا چاہئے کہ گویا روزہ ہی نہین رکھا گیا، یا یون کہنا چاہئے کہ جسم کا روزہ ہو گیا لیکن رُوح کا روزہ نہ ہوا، اسی کی تشریح محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے ان الفاظ مین فرمائی ہے، کہ "روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہین ہے، کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے[2]" ایک اور حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا "روزہ برائیون سے روکنے کی ڈھال ہے، تو جو روزہ رکھے اُس کو چاہئے کہ لغو اور فحش باتین نہ بکے، اور نہ جہالت (غصہ) کرے، یہانتک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے پر آمادہ ہو، اور گالی بھی دے تو یہی کہے کہ مین روزہ سے ہون[3]"، بعض حدیثون مین ہے کہ آپ نے فرمایا "روزہ اس وقت تک ڈھال ہے جب تک اس مین سوراخ نہ کر دو[4]" صحابہ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ اس مین سوراخ کس چیز سے ہو جاتا ہے، فرمایا "جھوٹ اور غیبت سے[5]"

چنانچہ بعض علماء کی رائے مین جس طرح کھانے اور پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اسی طرح

---

[1] صحیح بخاری باب الوحی جلد اوّل صفحہ ۳، [2] صحیح بخاری کتاب الصوم جلد اوّل ص ۲۵۵ و ترمذی باب الصوم ص ۱۴۴ و ابو داؤد صوم ص ۲۳۶ و ابن ماجہ صوم ص ۱۲۲، [3] صحیح بخاری صوم جلد ا ص ۲۵۴، صحیح مسلم صوم جلد ا ص ۴۲۷ مصر و موطا امام مالک صوم، ۹۷، نسائی ۳۵۵، [4] سنن دارمی صفحہ ۲۱۸، مجمع الفوائد بحوالہ نسائی ص ۱۵۲ میرٹھ، [5] مجمع الفوائد بحوالہ طبرانی فی الاوسط ص ۱۵۲ میرٹھ،

گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے[1]،

۱۱- تمام عبادات میں روزہ کو تقویٰ کی اصل اور بنیاد اس لئے بھی قرار دیا گیا ہے کہ یہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے، جو ریا اور نمائش سے بری ہے، جب تک خود انسان اسکا اظہار نہ کرے، دوسروں پر اس کا راز افشا نہیں ہوسکتا اور یہی چیز تمام عبادات کی جڑ اور اخلاق کی بنیاد ہے،

۱۲- اسی اخلاص اور بے ریائی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا کہ روزہ دار میرے لئے اپنا کھانا پینا اور ملذذات کو چھوڑتا ہے، اس لئے،

الصوم لی وانا اجزی بہ[2]	روزہ میرے لئے ہے اور میں اسکی جزا دونگا

جزا تو ہر کام کی وہی دیتا ہے لیکن صرف اس کی عظمت اور بڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے اس کی جزا کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا، اور بعض علماء کے نزدیک اسی کا اشارہ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے،

اِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ، (زمر - ۲)	صبر کرنے والوں کو انکی مزدوری بے حساب پوری کیجائے گی،

اور اتنا ظاہر ہے کہ روزہ کی مشقت اٹھانا بھی صبر کی ایک قسم ہے، اس لئے روزہ دار بھی "صابرین" کی جماعت میں داخل ہو کر اجر بے حساب کے مستحق ہوں گے،

۱۳- روزہ بھی چونکہ صبر کی ایک قسم ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ صبر اور تحمل و برداشت کی

---

[1] فتح الباری جلد ۴ صفحہ ۸۰، [2] صحیح بخاری و موطا وغیرہ کتاب الصوم،

مشق اور ورزش کی ایک بہترین اور آسان ترین صورت ہے، اسی لئے مشکلات کے حل کرنے کے لئے دعا اور صبر کرنے کی خاص ہدایت ہوئی ہے،

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ - ۵)

اور (مشکلات پر) دعا اور صبر کے ذریعہ سے مدد حاصل کرو،

دعا مانگنے کی ریاضت تو ہر وقت ممکن ہے کہ وہ انسان کی اختیاری چیز ہے لیکن صبر کرنے کی مشق کرنا اختیاری نہیں، کیونکہ قدرتی مشکلات اور مصائب کا پیش آنا انسان کے اختیار میں نہیں، اس لئے اس کی مہارت اور مشق کے لئے شریعت نے روزہ رکھا ہے اسی لئے اس آیت بالا کی تفسیر میں صبر کے معنی روزہ کے بھی لئے گئے ہیں[1]،

۱۴۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ بھی ان اعمال حسنہ میں ہے جن کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے خطا پوشی، گناہوں کی معافی، اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے، ارشاد ہے،

...... وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا، (احزاب - ۵)

...... اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور خدا کو زیادہ یاد کرنے والے اور یاد کرنے والی عورتیں، انکے لئے اللہ نے تیار رکھی ہے معافی اور بڑی مزدوری،

اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ جس طرح ہمارے بعض مادی جرائم کا کفارہ ہے، اسی طرح ہمارے روحانی گناہوں کا بھی کفارہ ہے،

[1] تفسیر ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکورہ ج ۱ ص ۱۹۹ مصر،

حج

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ (آل عمران ۔ ۱۰)

حج اسلام کی عبادت کا چوتھا رکن، اور انسان کی خداپرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے، اس کے لفظی معنی "قصد اور ارادہ" کے ہیں، اور اس سے مقصود خاص مذہبی قصد و ارادہ سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے، لیکن اسلام میں یہ ملک عرب کے شہر مکہ میں جا کر وہاں کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد خانۂ کعبہ کے گرد چکر لگانے اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہو کر کچھ آداب اور اعمال بجالانے کا نام ہے،

انسانی تمدن کی ابتدائی تاریخ پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ انسانی جماعت کی ابتدائی شکل، خاندان اور خانوادہ کی صورت میں تھی، اس سے آگے بڑھی تو چند خیموں اور جھونپڑیوں کی ایک مختصر سی آبادی بنی، پھر وہ شہر کی صورت میں منتقل ہوئی، اس سے ترقی کر کے اس نے ایک قوم اور ایک ملک کا قالب اختیار کیا، اور بالآخر وہ تمام دنیا پر چھا گئی،

مکہ اس انسانی ترقی کے تمام مدارج اور مراتب کی ایک مرتب تاریخ ہے، وہ حضرت

ابراہیمؑ خلیل کے عہد مین ایک خاص خاندان کا تبلیغی مستقر بنا، پھر حضرت اسمٰعیلؑ کے زمانہ مین وہ چند خیمون اور جھونپڑون کی مختصر سی آبادی کی صورت مین ظاہر ہوا، پھر رفتہ رفتہ اس نے عرب کے مذہبی شہر کی جگہ حاصل کر لی، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد وہ اسلامی دنیا کا مذہبی مرکز قرار پایا،

دنیا کی ابتدائی آبادی کے عہد مین یہ دستور تھا کہ ہر آبادی کے محصور احاطہ مین دو خاص با عظمت مکان بنائے جاتے تھے، ایک اُس آبادی کے بادشاہ کا محل یا قلعہ، اور دوسرے اس آبادی کے کاہن کا معبد ہوتا تھا، عموماً ہر آبادی کسی نہ کسی دیوتا یا ستارہ کی طرف منسوب ہو کر اس کی حفاظت اور پناہ مین ہوتی تھی، اور وہی محافظ یا دیوتا یا ستارہ کی وہان پوجا ہوتی تھی، اس کے معبد کا صحن دار الامن ہوتا تھا، نذرانہ کی تمام رقمین اور پیداوارین اس مین جمع ہوتی تھین، اور جیسے جیسے اس آبادی کی بادشاہی اور حکمرانی بڑھتی جاتی تھی، اس دیوتا کی حکومت کا رقبہ بھی بڑھتا جاتا تھا،[1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آبائی وطن عراق تھا، جہان کلدانیون کی آبادی اور حکومت تھی یہان بھی بدستور ستارون کی پوجا ہوتی تھی، حضرت ابراہیمؑ نے نبوت پا کر ستارہ پرستی کے خلاف دنیا مین سب سے پہلی آواز بلند کی اور ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی، ان کے خاندان اور قوم کے لوگون نے ان کو اس کے لئے تکلیفین دین، اور بالآخر ان کو اپنا وطن چھوڑ کر شام، مصر اور عرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی، یہ تمام وہ مقامات تھے، جن مین سام کی اولاد پھیلی ہوئی

---

[1] توراۃ اور بابل، کلدان و یونان وغیرہ کی پرانی تاریخون اور آثار قدیمہ مین اس بیان کے شواہد ملین گے، اور میری تصنیف ارض القرآن مین ان کے اقتباسات مذکور ہین،

تھی، اور مختلف ناموں سے ان کی حکومتیں قائم تھیں، آثار قومیات، لسانیات اور دوسرے تاریخی قرائن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کا ملک سامی اقوام کا پہلا مسکن اور پہلی آبادی تھی، اور یہیں سے نکل کر وہ یمن اور خلیج فارس کے سواحل سے عراق پہنچی تھیں اور شام و فلسطین گئی تھیں اور مصر میں ہکسوس یا چرواہے (بدو) بادشاہوں کے نام سے حکمراں تھیں[1]،

حضرت ابراہیمؑ نے مختلف شہروں کے سفر کے بعد عرب و شام کی سرحد کا رُخ کیا، اور بحر میت کے پاس اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السّلام کو آباد کیا، اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو کنعان (فلسطین) میں بسایا، اپنے دوسرے بیٹوں مدین وغیرہ کو حجاز کی طرف بحر احمر کے ساحل پر اس مقام پر جگہ دی جس کو اُن کے انتساب سے آج تک مدین کہتے ہیں، اور اس سے آگے بڑھ کر فاران کی وادی میں حضرت اسمٰعیلؑ کی سکونت مقرر کی، یہ تمام مقامات وہ شاہراہیں تھیں جن پر سے مصر و شام سے حجاز و یمن، اور حجاز و یمن سے مصر و شام آنے جانے والے تاجروں سوداگروں اور قافلوں کا تانتا لگا رہتا تھا،

اپنی اولاد کو اس خاص سلسلہ سے آباد کرنے سے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے دو مقصد تھے ایک یہ کہ تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کی بنا پر اس کو غلہ اور ضروری سامان کے ملنے میں تکلیف نہ ہو، اور ساتھ ہی وہ بھی اس سوداگری میں بہ آسانی شریک ہوسکے، اور دوسرا یہ کہ خدا کی خاص توحید کی تبلیغ کے لئے قوموں کے یہ گذرگاہ بہترین تبلیغی مرکز تھے، یہاں وہ عراق و شام کی جبار و قہار قوموں کے حدود سے جو مشہور بت پرست اور ستارہ پرست تھیں علحدہ رہ کر گروگوں

[1] میری تصنیف ارض القرآن جلد اول میں اس پر مفصل بحث ہے،

مین دین حق کو پھیلا سکتی تھی،

بیت اللہ | حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا دستور یہ تھا کہ جہان کہین ان کو روحانیت کا کوئی جلوہ نظر آتا، وہان خدا کے نام سے ایک پتھر کھڑا کر کے خدا کا گھر اور قربان گاہ بنا لیتے تھے، چنانچہ توراۃ کتاب پیدائش مین اُن کی تین قربان گاہون یا "خدا کا گھر" بنانے کے واقعات مذکور ہین،

"تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کے کہا کہ یہی ملک مین تیری نسل کو دونگا اور اُس نے وہان خداوند کے لئے جو اس پر ظاہر ہوا ایک قربان گاہ بنائی اور وہان سے روانہ ہو کے اسنے "بیت ایل" (بیت اللہ) کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ کھڑا کیا، بیت ایل اس کے پچھم اور عئی اس کے پورب تھا، اور وہان سے اس نے خدا کے لئے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا" (۱۲ — ۷، ۸)

اس کے بعد ہے،

"اور وہ (ابراہیم) سفر کرتا ہوا دکھن سے بیت ایل مین اس مقام تک پہنچا۔ ۔ ۔ ۔ جہان اس نے شروع مین ایک قربان گاہ بنائی اور وہان سے ابراہیم نے خدا کا نام لیا" (۱۳-۴)

پھر ایک اور جگہ پہنچے جہان ان کو خدا کی وحی اور برکت کا پیام پہنچا، اور حکم ہوا،

"اٹھ اور اس ملک کے طول و عرض مین پھر کہ مین اُسے تجھ کو دون گا، اور ابراہیم نے اپنا ڈیرہ اٹھایا، اور ممرے کے بلوطون مین جو حبرون مین ہین جا رہا، اور ایک قربان گاہ بنائی، (۱۳-۱۷-۱۸)

اسی قسم کی قربان گاہیں، اور خدا کے گھر حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، اور حضرت موسیٰؑ نے بھی بنائے اور آخر حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس کی تعمیر کی، جو بنی اسرائیل کا کعبہ اور قبلہ قرار پایا، حضرت اسحاقؑ کے حال میں ہے، کہ جہاں ان پر وحی اور وعدہ کی بشارت نازل ہوئی،

"اور اس نے وہاں مذبح بنایا، اور خداوند کا نام لیا، اور وہاں اپنا خیمہ کھڑا کیا، اور وہاں اسحاقؑ کے نوکروں نے کنواں کھودا۔" (پیدائش ۲۶-۲۵)

حضرت یعقوبؑ کو جہاں مقدس رویا ہوئی، وہاں،

"اور یعقوب صبح سویرے اٹھا، اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنا تکیہ کیا تھا، کھڑا کیا، اور اس کے سرے پر تیل ڈالا، اور اس مقام کا نام بیت ایل رکھا، اور یہ پتھر جو میں نے ستون کھڑا کیا خدا کا گھر ہوگا، اور سب میں سے جو تو مجھے دیگا، دسواں حصہ (عشر) تجھے (خدا کو) دونگا۔" (۲۸-۱۸-۲۲)

حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے،

"اور اگر تو میرے لئے پتھر کی قربان گاہ بنائے، تو تراشے ہوئے پتھر کی مت بنائیو کیونکہ اگر تو اس کے لئے اوزار لگائے گا تو اُسے ناپاک کرے گا، اور تو میری قربانگاہ پر سیڑھی سے ہرگز مت چڑھیو تاکہ تیری برہنگی اس پر ظاہر نہ ہو۔" (خروج ۲۰-۲۵-۲۶)

حضرت موسیٰؑ نے خدا کے حکم کے بموجب،

"اور پہاڑ کے تلے ایک قربان گاہ اور بنی اسرائیل کے بارہ فرقوں کے لئے بارہ

ستون بنائے .... اور سلامتی کے ذبیحے بیلوں سے خداوند کے لئے ذبح کئے اور موسیٰ نے آدھا خون لے کے باسنوں میں رکھا، اور آدھا قربان گاہ پر چھڑکا" (خروج ۲۴-۴-۶)

اوپر کے اقتباسات میں اس قسم کی تعمیر یا مکان کا ایک نام (مذبح، قربان گاہ) بتایا گیا ہے اور دوسرا بیت ایل یعنی بیت اللہ اور خدا کا گھر، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی نسل میں اس قسم کی قربان گاہ اور بیت اللہ بنانے کا دستور تھا، اسی قسم کا وہ گھر ہے جو مکہ معظمہ میں کعبہ، مسجد حرام اور مسجد ابراہیم کے نام سے آج تک قائم ہے، بلکہ اس کی نسبت اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں خدا کا پہلا گھر ہے،

حضرت اسماعیلؑ کی قربانی اور اس کے شرائط

اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں یہ بحث تفصیل سے آچکی ہے کہ قرآن پاک کے بموجب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے جس محبوب اور اکلوتے بیٹے کی قربانی کا خواب دیکھا تھا اور توراۃ کے مطابق جس کی قربانی کا حکم ہوا تھا، وہ حضرت اسماعیلؑ تھے، اور یہ بحث بھی وہیں گذر چکی ہے کہ قربانی کرنے سے توراۃ کے محاورہ میں یہ مقصود ہے کہ وہ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لئے نذر کر دیا جائے، وہ نذر کردہ جانوروں پر ہاتھ رکھدیتا تھا، اور وہ جانور اس کی طرف سے قربانی کئے جاتے تھے، جو لوگ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لئے نذر کئے جاتے تھے، وہ نذر کے دنوں میں سر نہیں منڈاتے تھے جب نذر کے دن پورے ہو جاتے تھے تب اُن کا سر مونڈا جاتا تھا جو قربانی یا نذر پیش کیجاتی تھی وہ پہلے قربان گاہ پر ہلائی یا پھرائی جاتی تھی، اس کے بعد وہ قربانی کی جاتی یا جلائی جاتی تھی،

ملتِ ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے

توراۃ اور قرآنِ پاک دونون سے یہ ثابت ہے کہ ملتِ ابراہیمی کی اصلی بنیاد قربانی تھی، اور یہی قربانی حضرت ابراہیمؑ کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی اصلی خصوصیت تھی، اور اسی امتحان اور آزمائش مین پورے اترنے کے سبب سے وہ اور ان کی اولاد ہر قسم کی نعمتون اور برکتون سے مالامال کی گئی، توراۃ کی کتاب پیدائش مین ہے" (۲۲-۱۶-۱۷-۱۸)

"خداوند فرماتا ہے اس لئے کہ تو نے ایسا کام کیا، اور اپنا بیٹا ہان اپنا اکلوتا بیٹا دریغ نہ رکھا، مین نے اپنی قسم کھائی کہ مین برکت دیتے ہی تجھے برکت دونگا، اور بڑھاتے ہی تیری نسل کو آسمان کے ستارون اور دریا کے کنارے کے ریت کے مانند بڑھاؤنگا، اور تیری نسل اپنے دشمنون کے دروازہ پر قابض ہو جائیگی اور تیری نسل سے زمین کی ساری قوم برکت پائے گی، کیونکہ تو نے میری بات مانی۔"

قرآنِ پاک مین ہے،

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا، (بقرہ ۔ ۱۵)	اور جب ابراہیم کے پروردگار نے چند باتون مین اس کی آزمائش کی پھر اس نے ان کو پورا کیا، تو خدا نے اس سے کہا، کہ مین تجھ کو لوگون کے لئے پیشوا بنانے
وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ	اور ہم نے ابراہیم کو دنیا مین چنا اور وہ آخرت مین یقیناً نیکون مین سے ہے،

(بقرہ ۔ ۱۶)

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ	جب اُس کے خدا نے اس سے کہا کہ اپنے
اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ،	کو سپرد کردے، اس نے کہا مین نے
(بقرہ ۸-۱۲)	اپنے کو دنیا کے پروردگار کے سپرد کردیا
يٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ	اے ابراہیم تو نے اپنا خواب سچ
الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی	کر دکھایا، ہم یونہی اچھے کام کرنے والون
الْمُحْسِنِيْنَ ، (صفت-۳)	کو بدلہ دیتے ہین،

یہی وہ برکت ہے جس کو مسلمان دن مین پانچ مرتبہ خدا کے سامنے یاد کرتے ہین ،

اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ	خدایا تو محمدؐ اور محمدؐ کی (جسمانی وروحانی)
عَلٰىٓ اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى	نسل پر برکت نازل کر جس طرح تو نے
اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰىٓ اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ	ابراہیمؑ اور ابراہیمؑ کی (جسمانی وروحانی)
	نسل پر برکت نازل کی،

لیکن یہ قربانی کیا تھی؟ یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی، بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی، یہ ماسوی اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ مین تھی، یہ اپنی عزیز ترین متاع کو خدا کے سامنے پیش کر دینے کی نذر تھی، یہ خدا کی اطاعت، عبودیت اور کامل بندگی کا بے مثال منظر تھا، یہ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کا وہ امتحان تھا جس کو پورا کئے بغیر دنیا کی "پیشوائی" اور آخرت کی "نیکی" نہین مل سکتی، یہ باپ کا اپنے اکلوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کر دینا نہ تھا، بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشون، تمناؤن اور آرزوؤن کی قربانی تھی، اور خدا کے حکم

کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دینا تھا، اور جانور کی ظاہری قربانی اس اندرونی نقش کا ظاہری عکس، اور اس خورشیدِ حقیقت کا ظلِّ مجاز تھا،

اسلام قربانی ہے اسلام کے لفظی معنی "اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا اور طاعت اور بندگی کے لئے گردن جھکا دینا" ہے، اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کے اس ایثار اور قربانی سے ظاہر ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ ان باپ بیٹوں کی اس اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبہ کو صحیفۂ محمدی میں اسلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا،

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ،

(صٰفّٰت - ۳)

جب ابراہیم اور اسمٰعیل اسلام لائے (یا فرمانبرداری کی یا اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا) اور ابراہیم نے اپنے بیٹے (اسمٰعیل) کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا،

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ، وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(بقرہ ۷ - ۱۶)

اور کون ابراہیم کی ملت کو پسند نہ کرے گا، لیکن وہ جو خود بیوقوف بنے، ہم نے اس کو دنیا میں مقبول کیا، اور وہ آخرت میں بھی نیکوں میں سے ہوگا، جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ اسلام لا، (یا فرمانبرداری کر یا اپنے کو سپرد کر دے) اس نے کہا میں نے سارے جہان کے پروردگار کی فرمانبرداری کی (یا اپنے کو اس کے سپرد کیا)

الغرض ملت ابراہیمی کی حقیقت یہی اسلام ہے کہ انھوں نے اپنے کو خدا کے ہاتھ
مین سونپ دیا، اور اس کے آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا تھا، یہی اسلام کی حقیقت ہے، اور یہی
ابراہیمی ملت ہے، اور اسی بار امانت کو اٹھانے کے لئے حضرت ابراہیمؑ بار بار خدا سے
دعا فرماتے تھے کہ ان کی نسل مین اس بوجھ کے اٹھانے والے ہر زمانہ مین موجود رہین، اور
بالآخر ان کی نسل مین وہ **امین** پیدا ہو، جو اس امانت کو لے کر تمام دنیا پر وقف عام کر دے،
چنانچہ دعا فرمائی تو یہ فرمائی،

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ
وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً
لَّكَ ص وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا
وَتُبْ عَلَيْنَا ج إِنَّكَ أَنْتَ
التَّوَّابُ الرَّحِيمُ، رَبَّنَا
وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَ
يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ،

(بقرہ ۱۵ - ۱۵)

ہمارے پروردگار! ہم کو مسلمان (یعنی
اپنا فرمانبردار) بنا اور ہماری نسل مین
سے ایک مسلمان (یعنی اپنی فرمانبردار)
جماعت بنا، اور ہم کو مناسک (حج
کے دستور) بتا، اور ہم کو معاف کر،
بے شک تو معاف کرنے والا اور
رحم کرنے والا ہے، ہمارے پروردگار!
اس مین اپنا ایک رسول بھیج جو تیری
آیتین ان کو پڑھ کر سنائے، اور ان کو
کتاب، اور حکمت سکھلائے، اور ان کو
پاک وصاف کرے، تو غالب اور حکمت والا ہے،

یہ رسول محمد رسول اللہ صلعم تھے، یہ کتاب قرآن پاک تھی، یہ حکمت سینۂ محمدی کا خزانہ علمی و عملی تھا، اور یہ مناسک اسلام کے ارکان حج تھے،

یہ قربانی کہاں ہوئی | حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کہاں کی، توراۃ مین اس مقام کا نام مورہ یا موریہ بتایا گیا ہے، بعض بے احتیاط مترجمون نے اس نام کا بھی ترجمہ کر دیا ہے، اور بلوطون کے جھنڈ، یا بلند زمین اس کا ترجمہ کیا ہے، لیکن محتاط مترجمون نے اصل عبری نام کو قائم رکھا ہے، چنانچہ اس وقت ہمارے پیش نظر توراۃ کا وہ عربی ترجمہ ہے جو عبرانی، کلدانی اور یونانی زبانون کے مقابلہ سے ۱۸۹۱ء مین اوکسفورڈ یونیورسٹی کے مطبع مین چھپا ہے، اس مین اس مقام کا نام "مریا" لکھا ہے، اور اس کے فارسی ترجمہ مین جو انہی زبانون کے مقابلہ سے بائبل سوسائٹی لندن کی طرف سے ۱۸۸۵ء مین لندن مین چھپا ہے اس کا تلفظ "موریا" کیا ہے، اور درحقیقت یہ لفظ مَروہ ہے، جو مکہ مین بیت اللہ کعبہ کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے، اس فارسی ترجمہ کی عبارت یہ ہے،

"خدا ابراہیم را امتحان کردہ بدو گفت اے ابراہیم! عرض کرد لبیک، گفت کہ اکنون پسر خود را کہ یگانۂ تست و او را دوست می داری یعنی اسحاق را بردار و بزمین موریا برو، و او را در آن جا بر یکے از کوہ ہائیکہ بتو نشان می دہم برائے قربانی سوختنی بگذران، بامدادان صبح ابراہیم برخاستہ الاغ (گدھا) خود را بیاراست و دو نفر از نوکران خود را با پسر خویش "اسحاق" برداشتہ و ہیزم برائے قربانی سوختنی شکستہ روانہ شد و بسوئے آن مکانیکہ خدا او را فرمودہ بود، رفت، و در روز سوم ابراہیم چشمان خود را بلند

کردہ آن مکان را از دور دید آنگاہ ابراہیم بخادمان گفت شما این جا بمانید تا من با پسر بدانجا رویم، وعبادت (دوسرے ترجمون مین سجدہ ہی) کردہ نزد شما باز آئیم۔ (پیدائش ۲۲) قطعی اس عبارت مین اسحاقؑ کا نام یہود کی تحریف اور اضافہ ہے، اور مسلمان متکلمین نے دلیلون سے اس تحریف و اضافہ کو ثابت کیا ہے، اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ مین اس پر مختصر بحث گذر چکی ہے، اور ہماری جماعت مین سے جناب مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے "الرای الصحیح فی من ہو الذبیح" نام ایک عربی رسالہ خاص اس مسئلہ پر مدلل و مفصل لکھا ہے اس لئے یہان بحث بے محل ہے، بہرحال حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے لئے جو مقام بتایا گیا تھا وہ سرزمین **مروہ** تھی، وہ اس مقام سے جہان وہ قیام پذیر تھے چند روز کی مسافت پر تھی، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی شریعتون کے مطابق ضروری تھا کہ جس مقام پر قربانی گذرانی جائے وہ کوئی قربان گاہ (بیت اللہ) ہو، خاص کر اس لئے بھی کہ وہان حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی عبادت کی اور سجدہ کیا اور وہ قربانگاہ یا بیت اللہ ایسا معروف و مشہور ہو کہ ساتھ کے نوکرون کو یہ کہا جاسکے کہ "مین وہان جاکر عبادت کرکے واپس آتا ہون" یہ خصوصیتین کعبہ کے سوا کہین اور نہین پائی جاتین، اور نہ یہود و نصاریٰ اس کے لئے کسی دوسرے مقام کو ثابت کرسکے اور نہ اس عظیم الشان واقعہ کی کسی قسم کی بھی یادگار حضرت اسحاقؑ کی نسل (بنی اسرائیل) مین موجود تھی اور نہ ہی اور نہ بیت المقدس یا مسیحؑ کی ولادت گاہ سے اس واقعہ کے کسی یادگاری اثر کا تعلق پہلے تھا نہ اب ہے برخلاف اس کے بنو اسماعیل یعنی اسماعیلی عربون مین اس قربانی اور اس کے خصوصیات کی ایک ایک یادگار ہزارہا برس سے محفوظ چلی آتی تھی، اور گو اس مین امتداد زمانہ اور تغیرات

کے سبب سے کسی قدر کمی بیشی، یا بعد کی گمراہیون کے سبب سے اس مین بعض مشرکانہ رسوم کی آمیزش ہوگئی تھی، تاہم اصل شئی باقی تھی، عرب مین بت پرست بھی تھے، ستارہ پرست بھی تھے، کافر بھی تھے، مشرک بھی تھے، بلکہ عیسائی بھی تھے، اور یہودی بھی تھے، مگر عربون کے قدیم اشعار سے ثابت ہو کہ ان سب کو خانۂ کعبہ اور حج کے مراسم کی اہمیت کا یکسان اعتراف تھا، یہانتک کہ عیسائی عرب بھی اسی کی قسمین کھاتے تھے، اور غالبًا یہی وجہ ہے کہ خانۂ کعبہ مین جہان مشرکون کے بتون کی صفین تھین، حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی تصویرین بھی تھین[1]،

مکہ اور کعبہ | کعبہ وہ مقام ہے جو مسلمان عرفا کے خیال کے مطابق عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتون اور برکتون کا "سمت القدم" ہے، وہ ازل سے اس دنیا مین خدا کا معبد اور خدا پرستی کا مرکز تھا، سب بڑے بڑے پیغمبرون نے اس کی زیارت کی، اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتون کی سمت اس کو قرار دیا کہ

اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ، (آل عمران-۱۰) سب سے پہلا خدا کا گھر جو لوگون کیلئے بنایا گیا

وہ وہی تھا، لیکن حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیون مین اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا، حضرت ابراہیمؑ کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمت کدہ مین توحید کا چراغ پھر روشن کیا، تو حکم ہوا، کہ اس گھر کی چار دیواری بلند کر کے، دنیا مین توحید کا پتھر پھر نصب کیا جائے، چنانچہ قرآن پاک کے بیان کے مطابق (حج ۳-۴) کعبہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ مین بھی اَلْبَیْتُ الْعَتِیْقِ (پرانا گھر) تھا، کوئی نیا گھر نہ تھا، حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے مل کر

[1] اخبار مکہ للازرقی، و فتح الباری ابن حجر ذکر ہدم اصنام کعبہ، و سیرۃ ابن ہشام،

اس گھر کی پرانی بنیادوں کو ڈھونڈ کر، پھر نئے سرے سے ان پر چہار دیواری کھڑی کی، فرمایا اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ، (ابراہیم جب اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ بنیاد پہلے سے پڑی تھی حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے اس افتادہ بنیاد کو از سر نو بلند کیا، حضرت ابراہیمؑ نے عراق، شام، مصر، ہر جگہ پھر کر آخر اسی گمنام گوشہ کو منتخب کیا، جو باسطوت جباروں اور بت پرست اور ستارہ پرست قوموں کے حدود دسترس دور ایک بے نام و نشان صحرا میں ہر چہار طرف سے پہاڑیوں سے گھرا تھا، اس لئے قرآن پاک نے کہا،

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ	اور ہم نے ابراہیمؑ کے لئے اس گھر کی جگہ
الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْئًا	کو ٹھکانا بنایا کہ میرے ساتھ کسی کو
(حج - ۴)	شریک نہ بنا،

اس سے معلوم ہوا کہ گھر کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی، البتہ دیواریں بے نشان تھیں تو ہم نے ابراہیمؑ کو اسی گھر کی جگہ بتا دی، اور اس کو ان کی جائے پناہ اور ٹھکانا بنا دیا، کہ بت پرستوں کے شر اور فتنہ سے محفوظ رہ کر دین حق کی تبلیغ کریں، توراۃ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے یہ معبد موجود تھا، کیونکہ سامی دستور کے مطابق یہ ضروری تھا، کہ جس مقام پر خدا کی قربانی یا نذر یا عبادت کی جائے وہ کوئی معبد یا قربان گاہ ہو، اس بنا پر وہ مقام جہاں حضرت ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ کو قربانی کرنے کے لئے لائے تھے، اور جس کے متعلق اپنے خادموں سے کہا تھا کہ وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں، ضروری ہے، کہ وہ کوئی معبد ہو، اسی لئے قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی طرف اس گھر کی ایجاد نہیں، بلکہ تجدید اور تطہیر کی نسبت کی ہے، وَطَهِّرْ بَیْتِیَ (اور میرے

گھر کو عبادت گذاروں کے لئے پاک و صاف کر) اس وقت تک اس سرزمین کے لئے عرب کا لفظ بھی پیدا نہیں ہوا تھا، یہ لفظ تو مجموعۂ توراۃ میں حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے ملتا ہے اس سے پہلے اس کا نام پورب یا دکھن کا ملک تھا، کہ یہ شام کی جنوبی و مشرقی سمت میں واقع تھا، اور کبھی اس کا نام "بیابان" تھا، اور آخر یہی بیابان اس کا نام پڑ گیا، لفظ عرب (عربہ) کے اصلی معنی بیابان و صحرا ہی کے ہیں[1] اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے جس وقت یہ فرمایا تھا،

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي	خداوندا میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک
بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ (ابراہیم-۶)	بن کھیتی کی ترائی میں لا کر بسایا ہے،

تو حقیقت میں یہ "بن کھیتی کی ترائی" اور "بے آب و گیاہ میدان" اس وقت اس کی ایک امتیازی صفت تھی، اور آخر یہی صفت اس ملک کا خاص نام بن گئی، اور اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے یہاں حضرت اسمٰعیلؑ کو آباد کرتے ہوئے یہ دعا مانگی،

وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ	اور خداوندا یہاں کے رہنے والوں
(بقرہ ۵-۱۵)	کو پھلوں کی روزی پہنچا،

"مکہ" قدیم زبانوں کے بعض محققوں کے نزدیک بابلی یا کلدانی لفظ ہے، جس کے اصلی معنی "گھر" کے ہیں[2] اس سے دو حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ یہ آبادی اس وقت قائم ہوئی جب بابل و کلدان کے قافلے ادھر سے گذرتے تھے، اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور

[1] اس تحقیق پر مفصل بحث میری تصنیف ارض القرآن کی پہلی جلد میں ہے، از ص ۵ تا ص ۶ طبع اول،
[2] تاریخ العرب قبل الاسلام جرجی زیدان صفحہ ۲۴۴، مصر،

لغوی دلیل ہے، دوسرے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی آبادی اسی گھر کے تعلق سے وجود مین آئی اور یہ اس خانۂ کعبہ کی قدامت اور تقدس اور اہلِ عرب کی روایات کی صحت پر دلیلِ قاطع ہے، مکہ کا بکہ نام حضرت داؤدؑ کی زبور مین سب سے پہلے نظر آتا ہے، پہلی جلد کے مقدمہ مین اس کا حوالہ گذر چکا ہے، یہان یہ اضافہ کرنا ہے کہ قدیم شامی زبان مین "بک" کے معنی آبادی یا شہر کے ہین، جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام بعلبک ہے، یعنی بعل کا شہر (بعل دیوتا کا نام ہے) یہ اس آبادی کی قدامت کی دوسری لغوی شہادت ہے، اور کعبہ کی ابتدائی تعمیر کے وقت یہی نام قرآن پاک مین آیا ہے،

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ	پہلا گھر جو لوگون کی عبادت کے لئے
لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ۔ (آل عمران - ۱۰)	بنایا گیا وہ وہی ہے جو بکہ مین ہے،

کعبہ کے لغوی معنی "چوکھونٹے" کے ہین، چونکہ یہ گھر چوکھونٹا بنا تھا، اور اب بھی اسی طرح ہے، اس لئے کعبہ کے نام سے بھی مشہور ہوا،

یونانی تاریخون مین بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے، یونان کا مشہور مورّخ ڈیوڈورس جو حضرت عیسیٰؑ سے ایک صدی پہلے گذرا ہے، وہ عرب کے ذکر مین کہتا ہے،

"ثمودیون اور سباوالون کے درمیان ایک مشہور معبد ہے، جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے ہین[1]"

ثمود کا مقام شام و حجاز کے حدود مین تھا، اور سبا کا یمن مین، ظاہر ہے کہ ان دونون

---

[1] گبن کی تاریخ عروج و زوال روم باب ۵۰،

ملکوں کے درمیان حجاز ہی ہے، اور وہاں کا مشہور معبد جس کی عزت سارے عرب کرتے ہوں خانۂ کعبہ ہے، رومیوں کی تاریخ میں بھی خانۂ کعبہ کا ذکر ملتا ہے، پروکوپس مورخ لکھتا ہے کہ سنہ ۵۴۱ء میں رومی سپہ سالار بلیزیر نے اپنے تمام فوجی افسروں کا ایک جلسۂ مشاورت کیا، اس میں شام کے دو افسروں نے اٹھ کر کہا کہ وہ آیندہ لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے کیونکہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کردے گا، اس پر سپہ سالار نے کہا،

"تمہارا یہ خطرہ صحیح نہیں ہے کہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے جس میں عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لئے خاص کرتے ہیں، اور اس زمانہ میں ہر قسم کے ہتھیاروں سے وہ پرہیز کرتے ہیں[1]"

ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا بیان ہے،

ان تمام شہادتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ عرب یا بنی اسمٰعیل ہمیشہ سے اپنے ان مخصوص مذہبی مراسم کو ادا کرتے تھے، اور اس کی اکثر خصوصیات کو پوری حفاظت کے ساتھ باقی رکھے ہوئے تھے، جاہلیت کے اشعار میں حج اور ارکانِ حج کا ذکر بکثرت ملتا ہے[2]، یہاں تک کہ عیسائی عرب شعراء بھی عزت کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے تھے، عرب کے بازاروں اور میلوں کی روایات کے قائم رکھنے میں بھی اس موسم حج کا اچھا خاصہ حصہ تھا[3]، اور اسی کے سبب سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] نتائج الافہام فی تقویم العرب قبل الاسلام محمود پاشا فلکی مطبع امیریہ بولاق مصر صفحہ ۳۵ بحوالہ (فرنچ) ایشیاٹک جرنل اپریل ۱۸۵۸ء، [2] مولانا حمید الدین صاحب نے اپنی تصنیف الامعان فی اقسام القرآن میں اس قسم کے اشعار جمع کر دیئے ہیں، [3] کتاب الازمنہ والامکنہ امام مرزوقی طبع حیدرآباد جلد دوم صفحہ ۱۶۱ باب ۴۲،

کی دعوت کو ہجرت سے پہلے ہی عرب کے دور دراز گوشون مین یہانتک کہ یمن و بحرین تک مین پہنچنے مین کامیابی ہوئی کیونکہ حج کے موسم مین عرب کے تمام قبیلے مکہ کی وادی مین اس موروثی رسم کو ادا کرنے کے لیے جمع ہو جاتے تھے،

حج ابراہیمی یادگار ہے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی کا جو خواب دیکھا، اور اُس پر لبیک کہا تھا، اور جس کی تعمیل کے لیے وہ اس دور دراز مقام مین آئے تھے، اور عین اُس وقت جب چھری لے کر بیٹے کو خدا کی راہ مین قربان کرنا چاہا تھا اور بیٹے نے بھی خدا کا حکم سنکر گردن جھکا دی تھی، تو آواز آئی تھی،

اَنْ يّٰاِبْرٰاهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ	یہ کہ اے ابراہیمؑ تو نے اپنا خواب سچ
الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي	کر دکھایا، ہم ایسا ہی نیکوکارون کو بدلہ
الْمُحْسِنِيْنَ ...... وَفَدَيْنٰهُ	دیتے ہین ...... اور ایک بڑی
بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (صٰفّٰت - ۳)	قربانی دے کر ہم نے اسکے بیٹے کو چھڑا لیا

اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر بیٹے کو خدا کے گھر کی خدمت اور توحید کی دعوت کے لئے مخصوص کر دینا، اور اس کے ذریعہ سے اس گھر کو دائرۂ ارضی مین خدا پرستی کا مرکز بنانا ہے،

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ	اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگون
وَاَمْنًا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ	کا مرجع اور امن بنایا، اور (کہا کہ) ابراہیمؑ
مُصَلًّى وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ	کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ

أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ	بنائو اور ابراہیم و اسماعیل سے عہد لیا کہ
وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۝ وَ	تم دونون میرے گھر کو طواف اور
إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ	قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والون
هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ	کے لئے پاک کرو، اور یاد کرو جب
مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ	ابراہیم نے کہا کہ میرے پروردگار اسکو
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ قَالَ	امن والا شہر بنا اور اس کے بسنے والون
وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا	کو کچھ پھلون کی روزی دے، جو ان مین
ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ۖ	سے خدا اور پچھلے دن پر ایمان لائے
وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ وَإِذْ يَرْفَعُ	خدا نے کہا اور جس نے انکار کیا اسکو
إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ	تھوڑا فائدہ پہنچاؤنگا، پھر اس کو دوزخ
وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ	کے عذاب کے حوالہ کرونگا، اور وہ
إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝	کتنی بری بازگشت ہے، اور یاد کرو
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ	جب ابراہیم اور اسماعیل اس گھر کی
لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً	بنیادین اٹھا رہے تھے (اور یہ دعا
مُسْلِمَةً لَكَ ص وَأَرِنَا	مانگ رہے تھے کہ) ہمارے رب
مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ج	(ہماری اس تعمیر کو) ہم سے قبول فرما
إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝	بے شک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا
مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيٰتِكَ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ
الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ وَمَن يَرْغَبُ
عَن مِّلَّةِ إِبْرٰهِيمَ إِلَّا
مَن سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدِ
اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ
فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِينَ ۝
إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ
قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝

(بقرہ ۱۲۹ – ۱۳۱)

اے ہمارے رب! اور ہم کو اپنا ایک
تابعدار (مسلم) فرقہ بنا! اور ہم کو اپنے
حج کے ارکان دکھا! اور ہم پر اپنی
رحمت رجوع کر! (ہماری توبہ قبول
کر) تو توبہ قبول کرنے والا اور رحم
والا ہے! اے ہمارے رب! ان
ہی ان ہی میں سے ایک کو رسول
بنا کر بھیج، جو ان کو تیری آیتیں سنائے
اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم
دے، اور ان کو پاک و صاف بنائے،
بیشک تو غالب اور دانا ہے! اور
ابراہیم کے دین سے کون منہ پھیریگا
بجز اس کے جو اپنے آپ کو نادان
بنائے، حالانکہ ہم نے اس کو (ابراہیم
کو) دنیا میں چنا، اور آخرت میں وہ
نیکوکاروں میں سے ہوگا، یاد کرو جب
اس کے رب نے اس سے کہا کہ تابعدار

[illegible]

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ
الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا
وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَ
الْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ
وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ
رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ
يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ
لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ
يَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ
مَعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ
مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُوا
مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ
ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا
نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ
الْعَتِيقِ ۝ ذَٰلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ
حُرُمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ
عِنْدَ رَبِّهِ ۝ (حج-۴)

اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لئے
اس گھر کی جگہ کو ٹھکانا بنایا، کہ کسی کو
میرا ساجھی نہ بنانا، اور میرے گھر کو
طواف، قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے
والون کے لئے پاک کر، اور لوگون
مین حج کا اعلان کر دے، وہ تیرے
پاس پیادہ اور (دور کے سفر سے تھکی
ماندی) دبلی سواریون پر، ہر دور دراز
راستہ سے آئین گے، تاکہ وہ اپنے نفع
کی جگہون پر حاضر ہون، اور ہم نے
ان کو جو چوپایے جانور روزی دیئے
ہین، ان (کی قربانی) پر چند جانے
ہوئے دنون مین خدا کا نام لین، تو
ان مین سے کچھ تم کھاؤ اور بدحال فقیر
کو کھلاؤ، اس کے بعد اپنا میل کچیل دور
کرین، اور اپنی منتین پوری کرین اور
اس قدیم گھر کا چکر لگائین یہ سن چکے اور

جو کوئی، اللہ کے آداب کی بڑائی رکھے تو وہ اس کے لئے اس کے رب کے پاس بہتر ہے،

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ
هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ
وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ
رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا
مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ
فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ
مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ
زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا
لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً
مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ
وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ
يَشْكُرُوْنَ ۔ رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ
مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى
عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ
وَلَا فِي السَّمَآءِ ۔

(ابراھیم-٦)

اور یاد کرو جب ابراہیمؑ نے یہ دعا کی اے
میرے پروردگار اس شہر کو امن والا بنا
اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش
سے بچا۔ میرے پروردگار ان بتوں نے
بہتوں کو گمراہ کیا ہے، تو جو میری پیروی
کرے گا، وہ مجھ سے ہوگا، اور جو میری
نافرمانی کرے گا، تو تو بخشنے والا مہربان
ہے۔ اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی
کچھ اولاد کو اس بن کھیتی کی ترائی میں
تیرے مقدس گھر کے پاس بسایا ہے
اے ہمارے پروردگار، یہ اس لئے تاکہ
یہ تیری نماز کھڑی کریں، تو کچھ لوگوں کے
دلوں کو ایسا بنا کہ وہ اُن کی طرف مائل
ہوں، اور ان کو کچھ پھلوں کی روزی دے
تاکہ یہ تیرے شکر گذار رہیں، اے ہمارے
پروردگار تجھے معلوم ہے جو ہم چھپائیں اور
جو ظاہر کریں اور اللہ سے زمین میں اور نہ

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ	کہہ کہ خدا نے سچ فرمایا، تو ابراہیم کے
اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ	دین کی پیروی کرو، شرک سے منہ موڑ
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ	کر، اور ابراہیم مشرکون مین نہ تھا، بیشک
وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ	وہ پہلا گھر جو لوگون کے لئے بنایا گیا
مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ	وہی ہے جو بکہ مین ہی، با برکت اور
فِيْهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ	دنیا کے لیے راہ نما، اس مین کچھ کھلی ہوئی
وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا وَ	نشانیان ہین، ابراہیم کے کھڑے
لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ	ہونے کی جگہ، اور جو اس مین داخل ہو
مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا	وہ امن پا جائے، اور خدا کا لوگون
وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ	پر اس گھر کا قصد کرنا فرض ہی جن کو
الْعٰلَمِيْنَ،	اس کے راستہ (سفر) کی طاقت ہو
	اور جو (اس قدرت کے باوجود)
(آل عمران ـ ۱۰)	اس سے باز رہی تو خدا دنیا والون سی
	بے نیاز ہے،

یہ وہ آیتین ہین جن کا تعلق اس موضوع سے ہے، ان مین نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیم کو بت پرست اور ستارہ پرست ملکون سے ہٹا کر جن مین وہ سرگردان اور آوارہ پھر رہے تھے، اور ایک اُن کے سنسان مقام کی تلاش مین تھے،

تاکہ وہ خدائے واحد کی پرستش کے لئے ایک گھر بنائین، یہ تھا کا نا عنایت کیا جو ازل سے اس کام کے لئے منتخب تھا، تاکہ وہ یہان خدا کے گھر کی منہدم چہار دیواری کو کھڑی کرین اور پھر اس کو توحید کا مرکز اور عبادت گذارون کا مسکن بنائین،

یہ مقام ویران اور پیداوار سے خالی تھا، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی کہ خداوندا یہان تیرے مقدس گھر کے پڑوس مین اپنی کچھ اولاد بساتا ہون، اُن کو روزی پہنچانا، اور لوگون کے دلون کو مائل کرنا کہ وہ ادھر آتے رہین، اور ان کو اس لئے یہان بساتا ہون تاکہ وہ آس پاس کی بت پرست قومون کی بت پرستی سے بچے رہین اور تیری خالص عبادت بجا لائین، ان مین جو نکوکار ہون وہ میرے ہین، اور جو بدکار اور گمراہ ہون ان کا تو مالک ہے، تو رحم والا اور معاف کرنے والا ہے، اور خداوندا میری اولاد مین ایک رسول بھیجنا، جو اُن کو نیک تعلیم دے،

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس مقام اور اس گھر مین حضرت ابراہیمؑ کی بہت سی یادگار نشانیان ہین، اور اُن کے کھڑے ہونے اور نماز پڑھنے کی جگہ، اور قربانی کا مقام ہے، اس لئے لوگون کو چاہئے کہ دور دور سے یہان آئین اور اپنے دینی و دنیاوی فائدون کو حاصل کرین، اور اس قدیم خانۂ خدا کا طواف کرین، اور یہان اسمٰعیلؑ کی یادگار مین قربانی کرکے غریبون کو کھلائین، اپنی نذر پوری کرین، اور اس حالت مین وہ امن و سلامتی کے مجسم پیکر ہون، نہ وہ کسی پر ہتھیار اٹھا سکتے ہون، نہ ایک چیونٹی تک کو مار سکتے ہون، اور وہ اس حالت مین ظاہری زیبائش و آرائش اور عیش و آرام اور پرتکلف مصنوعی زندگی سے بھی پاک ہون، اور چند روز یہان

ابراہیمی یادگارون پر ٹھہر ٹھہر کر ابراہیمی زندگی بسر کر کے ابراہیمی طریقہ پر خدا کو یاد کرین،

اوپر توراۃ کے حوالون سے گذر چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور اُن کی اولاد کا دستور تھا کہ وہ جہان کہین کوئی ربانی کرشمہ دیکھتے تھے تمدن کے اس ابتدائی عہد مین کسی بڑی تعمیر کے بجائے وہ بن گھڑے پتھر کو کھڑا کر کے خدا کا گھر بنا لیتے، وہان قربانی گذرانتے، اور خدا کی عبادت کرتے تھے، اسی قسم کا گھر یہ خانۂ کعبہ تھا، یہ بھی توراۃ کے حوالون سے گذر چکا ہے، کہ خدا کے گھر کی خدمت اور عبادت کے لئے جو شخص نذر کیا جاتا تھا، وہ اتنے دنون تک سر نہین منڈاتا تھا، نذر پوری کر لینے کے بعد وہ سر پر استرہ لگاتا تھا، پھر جہان یہ مذکور ہے کہ "اس گھر کی چھت پر نہ چڑھنا کہ تیری برہنگی نہ ظاہر ہو"[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بن سلا کپڑا پہنتے تھے، اور کمر مین تہبند باندھتے تھے، توراۃ کے فارسی اقتباس مین جو اوپر نقل ہوا ہے مذکور ہے، کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے لئے آواز دی تو حضرت ابراہیمؑ نے جواب مین "لبیک" کہا اور اردو مین ہے کہ "مین حاضر ہون" کہا یہی صدا لبیک اللّٰھم لبیک اسلامی حج مین اٹھتے بیٹھتے لگائی جاتی ہے، یہ بھی گذر چکا ہے، کہ جس کو نذر یا قربانی کرتے تھے اس کو قربانگاہ کے چارون طرف پھراتے تھے، یا نثار کرتے تھے، حج مین یہ طواف کہلاتا ہے، غرض ان ہی سب ابراہیمی مراسم کے مجموعہ کا نام اسلام مین "حج" ہے،

حج کی حقیقت ان تفصیلات کے بعد معلوم ہوا ہوگا کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتون اور برکتون کے مورد خاص مین حاضری، حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا، اور اس عظیم الشان

---

[1] خروج ۲۰ - ۲۶،

قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے یعنی ان دو برگزیدہ بندوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم ورضا اور فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس بندگی کو اور عبودیت کے اظہار کو اسی طرح بجالانا جس طرح وہ ہزاروں برس پہلے بجالائے، اور خدا کی نوازشوں اور بخششوں سے مالامال ہوئے، یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے، یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستوروں کے مطابق حج میں اپنے عمل او رکیفیت سے مجسم کرکے ظاہر کرتے ہیں تمدن کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنوں بن سلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں، وہ خود اپنے کو حضرت اسمٰعیل کی طرح خدا کے حضور میں نذر کرنے جاتے ہیں، اس لئے اتنے دنوں تک سر کے بال نہ منڈاتے ہیں نہ ترشواتے ہیں، دنیا کے عیش ونشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں، نہ خوشبو لگاتے ہیں، نہ رنگین کپڑے پہنتے ہیں، نہ سر چھپاتے ہیں، اور اسی والہانہ انداز سے جس طرح ابراہیم واسمٰعیل علیہما السّلام تین دن کے سفر کے گرد وغبار میں اَٹے ہوئے، دوڑے ہوئے خدا کے گھر میں آئے تھے، آتے ہیں، اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا، وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کی زبانوں پر ہوتا ہے،

لبّیک اللّٰہم لبّیک، لبّیک	میں حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں
لاشریک لک لبّیک، ان	میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں سب
الحمد والنعمۃ لک والملک	خوبیاں اور سب نعمتیں تیری ہی ہیں اور
لک، (صحیح مسلم حج)	سلطنت تیری ہی ہے تیرا کوئی شریک نہیں

یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ، اور یہ توحید کی صدا، ان تمام مقامات اور حدود میں بلند کرتے پھرتے ہیں، جہاں جہاں ان دونوں بزرگوں کے نقشِ قدم پڑے تھے، اور چونکہ وہ خود اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربانگاہ پر نذر کرنے چلتے ہیں اس لئے اپنے آپ کو سات دفعہ اس بیت ایل یا بیت اللہ کے چاروں طرف پھرا کر تصدّق کرتے ہیں، پھر جہاں سے جہاں تک (صفا سے مروہ تک) حضرت ابراہیمؑ دوڑ کر گئے تھے مروہ پر پہنچکر بیٹے کی قربانی کرینگے، وہاں ہم دوڑتے ہیں، اور دعا کرتے ہیں، اور گناہوں کی بخشایش چاہتے ہیں، اور عرفات کے سب سے بڑے میدان میں جمع ہو کر، اپنی تمام گذشتہ عمر کے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں، خدا کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں، روتے ہیں، قصور معاف کراتے ہیں، اور آیندہ زندگی کے لئے، خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت، بندگی اور اطاعت کا نیا عہد و پیمان باندھتے ہیں، اور یہی درحقیقت حج کا اصلی رکن ہے[1]، یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یاد، ان بزرگوں کے نقشِ قدم، اور ان کی دعا کے مقامات، اور تجلیاتِ ربانی کے مناظر، دور دراز سفر اور ہر قسم کی محنت کے بعد، اکثروں کو عمر میں ایک دفعہ اس مقام پر آسکنے کا موقع، اور لاکھوں بندگانِ خدا کا، ایک ہی وحدت کے رنگ میں، ایک ہی لباس اور شکل و صورت، ایک ہی حالت اور جذبہ میں سرشار ایک بے آب و گیاہ اور خشک میدان، اور جلے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں اکٹھے ہو کر، دعا، و مغفرت کی پکار، گذشتہ عمر کی کوتاہیوں اور بربادیوں کا ماتم، اپنی بدکاریوں کا اقرار، اور پھر اس احساس کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ابراہیمؑ خلیل اللہ

---

[1] ترمذی کتاب الحج باب ما جاء من ادرک الامام بجمع فقد ادرک الحج،

سے لے کر محمد رسول اللہ تک بہت سے انبیاء اسی حالت اور اسی صورت میں اور یہیں پر کھڑے ہوئے تھے، ایسا روحانی منظر ایسا کیف، ایسا اثر، ایسا گداز، ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے، جسکی لذت تمام عمر فراموش نہیں ہوتی، پھر اپنی نذر کے دن پورے کر کے اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیمؑ کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل میں جسمانی طور سے ذبح کرتے ہیں اور اس وقت اسی اطاعت، اسی فدویت، اسی سرفروشی، اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں، جو کبھی اسی میدان میں اسی موقع پر اور اسی حالت، اور اسی شکل میں دنیا کے سب سے پہلے داعی توحید نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے ظاہر کی تھی، اور وہی جذبات اس وقت حاجیوں کے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں اور اُن کی زبانوں سے حضرت ابراہیمؑ ہی کے الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، (صحیح مسلم کتاب الحج)

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ	میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اسکی
فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	طرف منہ کیا جس نے آسمانوں کو اور
حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ	زمین کو پیدا کیا، موحد بن کر اور میں
(انعام - ۹)	ان میں نہیں جو خدا کا شریک بناتے ہیں
اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ	میری نماز اور میری قربانی، اور میرا
وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ	جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لئے ہے
لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ	جو تمام دنیا کا پروردگار ہے، اس کا
اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ	کوئی شریک نہیں، اور یہی حکم مجھ کو ملا

ہو، اور میں سب سے پہلے فرمانبرداری

(اسلام) کا اقرار کرتا ہون، (انعام - ۲۰)

یہی حج کی حقیقت اور یہی اس عظیم الشان عبادت کے مراسم اور ارکان ہین،

حج کی اصلاحات | حج کی فرضیت دوسرے عبادات سے بالکل مختلف تھی، عام اہل عرب نماز کے اوقات، ارکان اور خصوصیات سے عملاً نابلد تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی تعلیم دی، اور بتدریج ان کو ترقی دی، زکوٰۃ ان مین سرے سے موجود نہ تھی، اس لئے عام صدقہ اور خیرات کے آغاز سے زکوٰۃ کی عملی فرضیت تک متعدد منزلین طے کرنی پڑین، روزہ نے بھی یوم عاشوراء سے لیکر رمضان تک مختلف قالب بدلے، لیکن حج عرب کا ایک ایسا عام شعار تھا جس کے تمام اصول و ارکان پہلے سے موجود تھے، صرف ان کا محل اور طریقۂ استعمال بدل گیا تھا، یا اُن مین بعض مشرکانہ رسوم داخل ہو گئے تھے، اسلام نے ان مفاسد کی اصلاح کر کے بہ یک دفعہ حج کے فرض ہونے کا اعلان کر دیا،

ان اصلاحات کی تفصیل حسب ذیل ہے،

۱- ہر عبادت کی اصلی غرض ذکر الٰہی، طلبِ مغفرت اور اعلاے کلمۃ اللہ ہے، لیکن اہلِ عرب نے حج کو ذاتی و خاندانی نام و نمود کا ذریعہ بنا لیا تھا، چنانچہ جب تمام مناسک حج سے فارغ ہو چکتے تھے، تو تمام قبائل منیٰ مین آکر قیام کرتے تھے، مفاخرت عرب کا قومی خاصہ تھا اور اس مجمع عام سے بڑھ کر اس کے لئے کوئی موقع نہین مل سکتا تھا، اس بنا پر ہر قبیلہ ذکر الٰہی کی جگہ اپنے اپنے آباء و اجداد کے کارنامے اور محاسن بیان کرتا تھا، شعرا

یہ آیت نازل ہوئی،

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ	جس طرح اپنے باپ دادون کا ذکر کرتے
اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا،	ہو اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند
(بقرہ ۸-۲۵)	آہنگی کے ساتھ خدا کی یاد کرو،

۲- قربانی کرتے تھے، تو اس کے خون کو خانہ کعبہ کی دیوارون پر لگاتے تھے، کہ خدا سے تقرب حاصل ہو جائے، یہودیون میں بھی یہ رسم تھی، کہ قربانی کے خون کا چھینٹا قربان گاہ پر دیتے تھے اور قربانی کا گوشت جلا دیتے تھے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ دونون باتین مٹا دی گئین، اور یہ آیت اتری،

لَنْ يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا	خدا کے پاس قربانیون کا خون اور گوشت
وَلٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ،	نہین پہنچتا، اس کے پاس صرف تمھارا
(حج-۵)	تقوی پہنچتا ہے،

اور آگے چل کر یہ بھی بتا دیا کہ اس قربانی کا مقصد یہ ہے کہ غریبون کی ضیافت کی جائے، اور اس جشن ابراہیمی کے موقع پر ان کو شکم سیر کیا جائے،

۳- اہل یمن کا دستور تھا، کہ جب حج کی غرض سے سفر کرتے تھے، تو زاد راہ لے کر نہین چلتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم متوکل علی اللہ ہین، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب مکہ مین پہنچتے تھے، تو بھیک مانگنے کی نوبت آتی تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

لہ بخاری جلد ا صفحہ ۲۰۶ کتاب الحج،

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ، (بقرہ ۔ ۲۵) — زادِ راہ ساتھ لے کر چلو، کیونکہ بہترین زادِ راہ پرہیزگاری ہے،

۴۔ قریش نے عرب کے دوسرے قبیلوں کے مقابل مین جو امتیازات قائم کرلئے تھے، انکی بنا پر قریش کے سوا تمام قبیلے ننگے ہوکر خانۂ کعبہ کا طواف کرتے تھے، اس غرض سے خانۂ کعبہ مین لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا جس پر تمام لوگ کپڑے اتار اتار کر رکھ دیتے تھے، ان لوگون کی ستر پوشی صرف قریش کی فیاضی کرسکتی تھی، یعنی اس موقع پر قریش کی طرف سے حسبتہً للہ کپڑا تقسیم کیا جاتا تھا، اور مرد مردون کو اور عورتین عورتون کو خاص طواف کے لئے کپڑا استعار دیتی تھین، اور وہ لوگ اسی کپڑے مین طواف کرتے تھے، لیکن جو لوگ اس فیاضی سے محروم رہ جاتے تھے ان کو برہنہ طواف کرنا پڑتا تھا[۱]، اسلام نے اس بے حیائی کے کام کو قطعًا موقوف کردیا، اور یہ آیت اتری،

خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف ۔ ۳) — ہر عبادت کے وقت اپنے کپڑے پہنو،

اور سنہ ۹ھ کے موسم حج مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو اس اعلان کے لئے بھیجا کہ آیندہ کوئی ننگے ہوکر طواف نہ کرنے پائے، چنانچہ اس کا اعلان کیا گیا اور اس وقت سے یہ رسم اٹھ گئی،

۵۔ قریش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اور تمام قبائل عرفات مین قیام کرتے تھے

---

[۱] طبقات ابن سعد تذکرۂ حضرت حمزہ سید الشہداء، [۲] بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۲۶، کتاب الحج، [۳] صحیح بخاری کتاب الحج باب لا یطوف عریان،

لیکن وہ خود حدودِ حرم کے اندر سے باہر نکلنا اپنے مذہبی منصب کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے، اسلام نے قریش کے اس امتیاز کا خاتمہ کر دیا، چنانچہ یہ آیت[1] اتری،

ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ، (بقرہ ۲۵)	کوچ وہیں سے کرو جہاں سے تمام لوگ کرتے ہیں،

۶- صفا اور مروہ کے درمیان میں جو وادی ہے، اس سے تیزی کے ساتھ دوڑ کر گذرتے تھے، اور یہ ایک مذہبی سنت قرار پا گئی تھی لیکن اسلام نے اس کو کوئی سنت نہیں قرار دیا[2]، یعنی اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی،

۷- جاہلیت کے زمانہ میں حج کی مذہبی حیثیت تو یوں ہی سی رہ گئی تھی، ورنہ اس نے درحقیقت ایک بڑے میلہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی جس میں ہر طرف سے ہر قماش کے لوگ جمع ہوتے تھے اور وہ سب کچھ ہوتا تھا جو میلوں میں ہوتا ہے شور و غل ہوتا تھا، دنگا فساد ہوتا تھا، عورتوں سے چھیڑ خانی ہوتی تھی، غرض فسق و فجور کا ہر تماشہ وہاں ہوتا تھا، اسلام آیا تو اس نے یک لخت ان باتوں کو بند کر دیا، اور حج کو تقدس، تورّع، نیکی اور ذکر الٰہی کا سرتاپا مرقع بنا دیا حکم آیا،

فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ ط وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ط (بقرہ ۲۵)	پھر جس نے ان مہینوں میں حج کی نیت کی تو پھر حج میں نہ شہوت رانی کی باتیں کرنا اور نہ گناہ کرنا اور نہ لڑائی دنگا ہے، اور تم جو نیکی کرو گے اللہ کو معلوم ہو گی،

---

[1] بخاری کتاب الحج جلد اول ص ۲۲۶ ۔ [2] بخاری جلد اول ص ۵۴۴ ،

۸۔ مناسک حج کے بعد جو لوگ واپس آنا چاہتے تھے، ان میں دو گروہ ہو گئے تھے، ایک کہتا تھا کہ جو لوگ ایام تشریق ہی میں واپس آتے ہیں وہ گناہگار ہیں، دوسرا ان لوگوں کو الزام لگاتا تھا جو دیر میں واپس ہوتے تھے، چونکہ ان میں درحقیقت کوئی گروہ گنہگار نہ تھا اس لئے قرآن مجید نے دونوں کو جائز رکھا،

فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ	جو شخص عجلت کرکے ایام تشریق کے
اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ	دو ہی دنوں میں واپس آیا اس پر بھی
اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى ،	کوئی گناہ نہیں ہے اور جس نے دیر کی
	اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے، بشرطیکہ
(بقرہ۔۲۵)	اس نے تقویٰ اختیار کیا،

۹۔ ایک خاموش حج ایجاد کر لیا تھا یعنی حج کا احرام باندھتے تھے تو چپ رہتے تھے چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک عورت کو خاموش دیکھا تو وجہ پوچھی، معلوم ہوا کہ اس نے خاموش حج کا احرام باندھا ہے، انھوں نے اس کو منع کیا اور کہا کہ یہ جاہلیت کا کام ہے[1]،

۱۰۔ خانۂ کعبہ تک پیادہ پا جانے کی نذر کرتے تھے، اور اس کو بڑا ثواب کا کام سمجھتے تھے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڈھے کو دیکھا، کہ اپنے دو بیٹوں کے سہارے پیادہ پا جا رہا ہے، وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ اس نے پیادہ پا چلنے کی نذر مانی ہے، ارشاد ہوا کہ خدا اس سے بے نیاز ہے، کہ یہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے، چنانچہ آپ نے اس کو سواری پر چلنے کا

[1] بخاری جلد اصفحہ ۵۴۱،

حکم دیا[1]، اسی طرح عورتین خانۂ کعبہ تک کھلے سر اور برہنہ پا جانے کی نذر مانتی تھین آپنے ایک بار اسی قسم کی ایک عورت کو دیکھا تو فرمایا کہ "خدا اس پریشان حالی کا کوئی معاوضہ نہ دے گا اس کو سوار ہونا اور دوپٹہ اوڑھنا چاہیئے"[2] اسی سبب سے قربانی کے لئے گھر سے جو جانور لاتے تھے، اس پر صرف اس خیال سے کہ وہ قربانی کا جانور ہے، سوار نہین ہوتے تھے، چنانچہ ایک بار آپنے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ ہانکے ہوئے لے جا رہا ہے، فرمایا کہ اس پر سوار ہو لو، اس نے جواب دیا کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، چنانچہ آپنے تین بار اس کو اونٹ پر سوار ہونے کی تاکید کی[3]،

۱۱۔ انصار حج کرکے واپس آتے تھے تو دروازہ کی راہ سے گھر مین نہین داخل ہوتے تھے بلکہ پچھواڑے سے کود کر آتے تھے، اور اس کو کار ثواب سمجھتے تھے، چنانچہ ایک شخص حج کرکے آیا، اور دستور کے خلاف دروازہ سے گھر مین گھس آیا، تو لوگون نے اس کو بری لعنت ملامت کی، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی،

لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ	گھر کے پچھواڑے سے آنا کوئی نیکی نہین ہے
مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ	نیکی صرف اس کی ہے جس نے تقوی
مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ	حاصل کیا، اور گھرون مین دروازے
اَبْوَابِهَا، (بقرہ-۲۴)	کی راہ سے آؤ،

۱۲۔ بعض لوگ طواف کرتے تھے تو اپنے گنہگار اور مجرم ہونے کی حیثیت کو مختلف نامناسب طریقون سے ظاہر کرتے تھے، کچھ لوگ ناک مین نکیل ڈال لیتے تھے، اور اسکو

---

[1] ترمذی کتاب النذور والایمان باب فی من یحلف بالمشی ولا یستطیع [2] ترمذی کتاب النذور والایمان [3] بخاری جلد اص ۲۲۹ کتاب الحج، ایضاً ص ۲۴۳،

پکڑ کر ایک شخص کھینچتا پھرتا تھا، آنحضرت صلعم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اسی طریقہ سے طواف کر رہا ہے تو اس کی نکیل کٹوا دی[1]، اسی طرح آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے رسی سے اپنا ہاتھ ایک شخص سے باندھ دیا ہے، اور وہ اس کو طواف کرا رہا ہے، آپ نے رسی کاٹ دی اور فرمایا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف کراؤ[2]، ایک بار آپ نے دیکھا کہ دو شخص ایک رسی مین جڑے ہوئے ہین، وجہ پوچھی تو دونون نے کہا کہ ہم نے یہ نذر مانی ہے کہ اسی طرح جڑے ہوئے خانہ کعبہ کا حج کرینگے، آپ نے فرمایا کہ اس شکنجے کو دور کر دو یہ نذر نہین ہے، نذر وہ ہے جس سے خدا کی ذات مقصود ہو[3]،

۱۳ - اہل عرب ایام حج مین عمرہ نہین کرتے تھے، کہتے تھے کہ جب سواریان حج سے واپس آجائین اور ان کی پیٹھ کے زخم اچھے ہو جائین اس وقت عمرہ جائز ہو سکتا ہے لیکن رسول اللہ صلعم نے خاص ایام حج مین عمرہ کیا، اور عملاً اس بے ضرورت رسم کو مٹا دیا[4]،

۱۴ - جاہلیت کے زمانہ مین کچھ لوگ تو حج کی نیت کرتے تھے، وہ ان دنون تجارت نہین کرتے تھے، اور اس کو طریقۂ حج کے خلاف سمجھتے تھے، اس لئے اکثر لوگ جو صرف تجارت اور بیوپار کے لئے آتے تھے وہ حج مین شریک نہین ہوتے تھے، بلکہ وہ صرف میلہ کی خاطر جمع ہوتے تھے، ان کو حج سے سروکار نہ تھا، وہ عکاظ اور ذوالمجاز وغیرہ بازارون مین جمع ہو کر صرف تجارت اور بیوپار کرتے تھے، اسلام آیا تو یہ دونون طریقے الگ الگ جاری تھے، اسکا نقصان یہ تھا کہ حاجی تجارت کے منافع سے محروم رہتے تھے، اور غیر حاجیون کا جو مجمع ہوتا تھا وہ صرف

---

[1] نسائی کتاب الحج صفحہ ۱۶۲ باب الکلام فی الطواف، [2] بخاری کتاب الحج باب الکلام فی الطواف [3] فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۳۸۶، [4] صحیح بخاری باب ایام الجاہلیۃ،

تماشائیون کی بھیڑ ہوتی تھی، بازاری مقصد کے لوگ ہوتے تھے، جن مین ہر قسم کی برائیان جاری ہوتی تھین، اسلام نے اس تفریق کو مٹا دیا، اور کہدیا کہ تجارت اور بیوپار، حج کے تقدس و حرمت کے خلاف نہین، اس لئے یہ دونون فریضے ایک ساتھ ادا ہوسکتے ہین، فرمایا[1]،

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ، (بقرہ ۲۵)

تمھارے لئے یہ گناہ نہین کہ (حج کے زمانہ مین) فضل الٰہی (تجارت) کی تلاش کرو،

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص جو اس موقع پر جمع ہوتا تھا، حج کی نسبت سے جمع ہوتا تھا، اس سے جاہلیت کے زمانہ کے اجتماعی مفاسد کا خاتمہ ہوگیا، اور ساتھ ہی اس اجتماع کے جائز تجارتی مشاغل کی ترقی ہوگئی،

۵۱- صفا و مروہ کے طواف کے متعلق پہلے ہی دو گروہ پیدا ہوگئے تھے، انصار مناۃ کا احرام باندھتے تھے، جو مشلّل مین قائم کیا گیا تھا، اور طواف نہین کرتے تھے، اُن کے علاوہ تمام عرب صفا و مروہ کا طواف کرتے تھے، خدا نے جب پہلے خانہ کعبہ کے طواف کا حکم دیا، اور صفا و مروہ کے متعلق کوئی آیت نازل نہین ہوئی تو آخر الذکر گروہ نے آنحضرت صلعم سے سوال کیا کہ یہ کوئی ناجائز فعل ہے؟ انصار نے بھی اس کے متعلق استفسار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی[2]،

---

[1] اس آیت کے شان نزول مین روایتین مختلف ہین، کچھ روایتون سے معلوم ہوتا ہو کہ اہل عرب حج مین تجارت کرنا برا جانتے تھے، اس لئے یہ آیت اتری، دوسری روایتون مین ہو کہ اہل عرب ان دنون تجارت کرتے تھے، اسلام جب آیا تو صحابہ نے یہ سمجھا کہ اب حج خالص خدا کے لئے ہوگیا، اسلئے اب اس مین تجارت مناسب نہین، یہ آیت اس خیال کی تردید کیلئے اتری، لیکن تمام روایتون کے جمع کرنے سے وہ حقیقت معلوم ہوتی ہو جو اوپر متن کتاب مین لکھی گئی ہو، اور روایتون کے جمع کرنے سے اسکی تصدیق ہوتی ہو، (دیکھو تفسیر طبری و اسباب النزول واحدی مین آیت مذکور) [2] صحیح بخاری کتاب الحج جلد ۱ صفحہ ۲۲۳،

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ	صفا و مروہ خدا کا شعائر ہیں، پس جو شخص
فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ	حج یا عمرہ کرے، اس کے لئے ان دونوں
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ (بقرہ ۔ ۱۹)	کا پھیرا لگانا گناہ نہیں ہے،

حج کے ارکان اب اس اصلاح، ترمیم و اضافہ کے بعد حج کی حقیقت جن ارکان سے مرکب ہوئی ان کی تفصیل اور ان کی مشروعیت کی مصلحتیں حسب ذیل ہیں،

احرام، تمام اعمال اگرچہ نیت پر مبنی ہوتے ہیں لیکن نیت کا اظہار عمل کے بغیر نہیں ہو سکتا نماز کے لئے تکبیر اسی نیت کا اعلان ہے، احرام بھی حج کی تکبیر ہے، احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمولی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت میں آجاتا ہے، اس لئے اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہو جاتی ہیں، جو دنیوی عیش و نشاط، زیب و زینت اور تفریح طبع کا ذریعہ تھیں، وہ شکار نہیں کر سکتا کہ محض کام و دہن کی لذت کے لئے کسی جاندار کی جان لینا، بہر حال خود غرضی ہے، بی بی سے متمتع نہیں ہو سکتا کہ یہ نفسانی و شہوانی لذتوں سے احتراز کا موقع ہے، سلے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتا کہ یہ جاہ و جلال کے اظہار کا ذریعہ ہے، اسی بنا پر اہل عرب برہنہ طواف کرتے تھے لیکن خدا کی بارگاہ میں یہ بھی ایک بے ادبی تھی، اس لئے اسلام نے اس کو جائز نہیں رکھا اور یہ مقرر کیا کہ احرام کی نیت کے ساتھ شاہ و گدا اپنے اپنے سلے ہوئے کپڑوں کو اتار دیں اور انسان کے ابتدائی دور کا بن سلا کپڑا زیب بر کیا جائے، ایک چادر کمر سے لپیٹ لیجائے اور دوسری سر کھول کر گردن سے اس طرح لپیٹ لیجائے کہ داہنا ہاتھ ضروری کاموں کیلئے باہر رہے، یہ عہد ابراہیمی کے لباس کی تمثیل ہے، جو اس لئے اس وقت کے لئے پسند کیا گیا تا کہ

اس مبارک عہد کی کیفیت ہماری ظاہری شکل و صورت سے بھی ظاہر ہو، یہ گویا شہنشاہ عالم و عالمیان کے دربار میں حاضری کی وردی ہے، جو بالکل سادہ بے تکلف، اور زیب و زینت سے خالی مقرر کی گئی ہے،

طواف یعنی خانہ کعبہ کے چارون طرف گھوم کر اور پھر کر دعائین مانگنا، اس رسم کو ادا کرنا ہے، جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد مین نذر اور قربانی کو قربان گاہ کے چارون طرف پھرا کر ادا کی جاتی تھی، چونکہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھاتا ہے، اس لئے وہ اس کے چارون طرف پھرتا ہے، اور اس گردش کی حالت مین وہ اپنی مغفرت کی دعائین اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے جس کا ایک ضروری ٹکڑا آخر مین یہ ہوتا ہے، کہ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ "خداوندا ہم کو دنیا مین نیکی دے اور آخرت مین نیکی دے، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا"

طواف حقیقت مین ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ "خانہ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے، صرف فرق یہ ہے کہ تم اس مین بول سکتے ہو، مگر نیک بات کے سوا اس حالت مین کچھ اور نہ بولو[1]" اور حکم ہوا کہ

وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (حج - ۴) اور اس پرانے گھر کا طواف کرین،

حجر اسود کا استلام، "حجر اسود" کے لفظی معنی "کالے پتھر" کے ہین، یہ کالے رنگ کا ایک پتھر ہے، جو خانہ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ مین قد آدم بلند لگا دیا گیا ہے، خانہ کعبہ بیسیون دفعہ گرا

---

[1] ترمذی، نسائی، دارمی و مستدرک حاکم،

اور بنا، کبھی سیلاب میں بہ گیا، اور کبھی آگ میں جل گیا، اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں پڑی تھی، ایک پتھر بھی اس میں باقی نہیں مگر اس عہدِ عتیق کی یادگار صرف یہی ایک پتھر رہ گیا تھا جس کو اہلِ عرب نے جاہلیت میں بھی بڑی حفاظت سے قائم رکھا، اور ساڑھے تیرہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب ہے، (الا یہ کہ ۳۱۷ھ میں باطنیہ اس کو کچھ دنوں کے لئے نکال کر لے گئے، اور پھر واپس کر گئے) یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہے جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑیگا، اور اسی لئے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکن شامی ہے، اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمر ہے، اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے طواف کے شروع اور ختم کرنے کیلئے وہ ایک نشان کا کام دے، ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہیں، سینہ سے بھی لگا سکتے ہیں، ہاتھ یا کسی لکڑی یا اور کسی چیز سے اس کو چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہیں، یہ بھی نہ سہی تو اس کی طرف صرف اشارہ پر بھی قناعت کر سکتے ہیں، یہ پتھر کہنے کے لئے تو ایک معمولی پتھر ہے، جس میں نہ کوئی آسمانی کرامت ہے، نہ کوئی غیبی طاقت ہے، صرف ایک یادگاری پتھر ہے، مگر ایک مشتاقِ زیارت کی نگاہ میں اس تخیل کے ساتھ کہ تمام دنیا بدل گئی، شہر مکہ کا ذرہ ذرہ بدل گیا، کعبہ کی ایک ایک اینٹ بدل گئی، مگر یہ وہ پتھر ہے جس پر ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کے مقدس لب، یا مبارک ہاتھ بالیقین پڑے ہیں، اور پھر تمام خلفائے راشدینؓ صحابۂ کرامؓ ائمۂ اعلام، اکابرِ اسلام اور حکمائے عظام کے ہاتھوں نے اس کو مس کیا ہے، اور آج ہمارے گنہگار لب اور ہاتھ بھی اس کو مس کر رہے ہیں، ہمارے

دون اور آنکھون مین تاثیر اور کیفیت کی ایک عجیب لہر پیدا کر دیتا ہے، اور بااین ہمہ ہم مسلمان یہی سمجھتے ہین کہ یہ ایک پتھر ہے، جس مین کوئی قدرت نہین اور جیسا کہ بادۂ توحید کے ایک ہشیار متوالے[1] نے اس کو چوم کر کہا "اے کالے پتھر مین خوب جانتا ہون کہ تو ایک معمولی پتھر ہے، نہ تو نفع پہنچا سکتا ہے، اور نہ نقصان، لیکن مین اس لئے تجھے بوسہ دیتا ہون کہ مین نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا تھا"[2] الغرض یہ بوسہ تعظیم کا نہین، بلکہ اس محبت کا نتیجہ ہے، جو اس یادگار کے ساتھ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی روحانی اولاد کو ہے، ورنہ اگر کوئی نہ اس کو چھوئے اور نہ بوسہ دے، نہ اشارہ کرے تو اس سے اس کے اداے حج مین کوئی نقصان لازم نہین آتا،

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا

صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیان تھین، جو گو اب برائے نام رہ گئی ہین، تاہم کچھ کچھ ان کے نشانات باقی ہین، صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے، یہان حضرت ابراہیمؑ اپنی سواری کے گدھون اور نوکرون کو چھوڑ کر اکیلے حضرت اسمٰعیلؑ کو لے کر آگے بڑھے تھے، اور مروہ وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی، اور آخر منادیِ غیب کی آواز سے رک گئے، اور اسمٰعیلؑ کی جگہ پر مینڈھا قربانی کیا، بعض روایتون مین ہے، کہ حضرت ہاجرہؑ حضرت اسمٰعیلؑ کو لیکر جب یہان آئی تھین اور وہ پیاس سے بیتاب ہو گئے تھے، تو حضرت ہاجرہؑ صفا و مروہ کے درمیان پانی کی تلاش مین دوڑی تھین، اور آخر زمزم کا چشمہ ان کو نظر آیا، یہ صفا و مروہ کی سعی

---

[1] یعنی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، [2] مسلم و ترمذی و مستدرک وغیرہ باب الاستلام،

ان ہی کی اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے، بہرحال حج مین پہلے صفا پر پھر مروہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منھ کرکے خدا کی حمد کرتے اور دعا مانگتے ہین، پھر اس سے اتر کر دعائین مانگتے ہوے مروہ پر آتے ہین، وہان بھی دعائین مانگتے ہین، کہ یہ دونون وہ مقامات ہین جہان ربانی کرشمے کے عظیم الشان جلوے حضرت ابراہیمؑ اور ہاجرہؑ کو نظر آئے،

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ	بے شک صفا اور مروہ خدا کا شعار
فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ	ہین، تو جو خانہ کعبہ کا حج کرے یا عمرہ
فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطَّوَّفَ	کرے اس پر اس کا پھیرے لگانا
بِھِمَا، (بقرہ ۲۔ ۱۹)	گناہ نہین،

وقوف عرفہ ۔ عرفات مین نوین ذیحجہ کو تمام حاجیون کو ٹھہرنا، اور زوال کے بعد سے غروب تک یہان دعا، اور خدا کی حمد مین مصروف رہنا پڑتا ہے، اور اصل حج اسی کا نام ہے یہان کوسون تک جہان تک نظر کام کرتی ہے، ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس مین کھڑے ہو کر رو رو کر اپنے گناہون کی معافی مانگتے، اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہین یہین جبل رحمت کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا کے آئے ہوے حاجیون کے سامنے خطبۂ عام دیتا ہے، اور ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے، عرفات کے اس وقوف مین ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمایش ہوتی ہے، اور دوسری طرف یہ اجتماع عظیم روز حشر کی یاد دلاتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ سورۂ حج کا آغاز حشر کے بیان سے ہوتا ہے، یہ اجتماع اور اس کا بے نظیر مؤثر منظر دلون مین مغفرت اور رحمت الٰہی

کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے، ہر شخص کو دا ہنے بائیں، آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے، تو وہ خود اثر میں ایسا ڈوب جاتا ہے، کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہجاتی ہے،

قیام مزدلفہ ۔ حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ، اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے، عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے تھے، اسی حالت میں اگر منیٰ کو براہِ راست چلے جاتے تو راستہ کی خستگی سے چور ہو جاتے، اس لئے انھوں نے ذرا سا سکون اور آرام اٹھانے کے لئے مزدلفہ کو ایک بیچ کی منزل قرار دے لیا تھا، اسلام نے اس کو اس لئے باقی رکھا کہ یہیں وہ مسجد واقع ہے جس کو مشعرِ حرام کہتے ہیں، اور یہ عبادت کا خاص مقام تھا، اس لئے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوعِ فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا،

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ	تو جب عرفات سے چلو تو مشعرِ حرام
فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ	کے پاس خدا کو یاد کرو، اور اس کو یاد
وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ	کرو جس طرح اس نے تم کو بتایا، اور
كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّاۗلِّيْنَ	تم اس سے پہلے حق کی راہ کو بھولے
(بقرہ - ۲۵)	ہوئے تھے،

منیٰ کا قیام ۔ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قربانی کا اصلی مقام مروہ کی پہاڑی ہے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی تھی، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قربانگاہ مروہ اور پھر مکہ کی تمام گلیاں ہیں[1] رفتہ رفتہ جب مسلمانوں کی کثرت سے حج کے دائرہ نے وسعت

[1] موطا امام مالک، باب ما جاء فی النحر فی الحج،

وسعت حاصل کی، اور قربانیوں کی کوئی حد نہ رہی، اور وہ مروہ اور مکہ کا تمام میدان شہر اور آبادی کی صورت مین بدل چکا تھا، اس لئے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ایک میدان کو اس کیلئے منتخب کیا جس کا نام منیٰ ہے یہان تمام حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہین یہین قربانی کیجاتی ہے، باہم دعوتین ہوتی ہین، بازار لگتے ہین خرید و فروخت ہوتی ہے،

جاہلیت مین عرب کے لوگ یہان جمع ہوکر اپنے اپنے باپ دادون کی بزرگی پر فخر کیا کرتے تھے، جو اکثر لڑائی بھڑائی کی صورت اختیار کر لیتی تھی، اس بیہودہ رسم کے روکنے کا بہتر طریقہ یہ تھا، کہ بجاے اس کے خدا کی حمد و عبادت کا حکم دیا جائے، اور اس مقام کو قومون اور خاندانون کی مفاخرت کے بجائے مسلمانون کے باہم تعارف، محبت، مساوات اور یکجہتی کا مقام قرار دیا جاے، فرمایا،

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ (بقرہ ۲۵) خدا کو چند گنتی کے دنون مین یاد کرو،

قربانی یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے، اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ منیٰ کے سہ روزہ قیام مین یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جائے جس مین لوگ ایک دوسرے کو، دوست احباب کو، اور فقراء اور مساکین کو کھانا کھلائین

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ	اور مقررہ دنون مین خدا کا نام اس پر
مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ	لیا جائے جو جانور خدا نے روزی مین
مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا	دیا تو اس مین سے کچھ خود کھاؤ اور مصیبت

مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِیْرَ (حج-۴) کے مارے فقیر کو کھلاؤ،

اگر بعض حالات میں قربانی نہ ہوسکے تو دس روزے رکھیں، کہ یہ بھی ذاتی ایثار ہی کی تمثیل ہے

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَی الْحَجِّ تو جو عمرہ اور حج دونوں کا ساتھ فائدہ

فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ فَمَنْ اٹھائے تو جو قربانی اس سے ممکن ہو

لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ کرے جس کو یہ بھی میسر نہ ہو تو تین دن

فِی الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ کے روزے حج میں، اور سات

(بقرہ-۲۴) دن واپس ہوکر،

حلق راس، منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں، یہ اس پرانی رسم کی تعمیل ہے، کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے[1] ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ چھپا ہے، تمدن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا اُس کے سر کے بال منڈوا دیے جاتے تھے، یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی،[2] چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہے، اس لئے انسانیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی،

مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَکُمْ وَمُقَصِّرِیْنَ (فتح-۴) اپنے سروں کو منڈا کر یا بال ترشوا کر،

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَکُمْ حَتّٰی یَبْلُغَ اور اپنے سر نہ منڈاؤ، جب تک قربانی

---

[1] توراۃ قاضی ۱۳-۵ گنتی ۶-۵ [2] ابن سعد جزء ثانی قسم اول ص۳۳ و سیرۃ ابن ہشام ذکر بیر معونہ، واقعہ عمرو ابن امیہ وجز ناصیۃ و اعتقہ،

اَلْهَدْىُ مَحِلَّهٗ ، (بقرۃ-۲۴) اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے ،

رمیِ جمار - منیٰ ہی کے میدان میں پتھر کے تین ستون کھڑے ہیں ، کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو قربانی کے لئے لے چلے تو شیطان نے ان موقعوں پر انکے دل میں وسوسہ ڈالا ، انھوں نے اس کو یہاں رجم کیا ، جس کے لفظی معنی کنکریاں مارنے کے ہیں ، اور جو پہلے زمانہ میں لعنت کے اظہار کا طریقہ تھا ، اور اسی لئے شیطان کو "رجیم" یعنی کنکری مارا گیا کہتے ہیں ، صاحب نظام القرآن کا نظریہ ہے کہ ابرہہ کے لشکر نے مکہ پر جب چڑھائی کی تھی تو چند غدار ثقفی عربوں نے اس کی رہنمائی کی ، باقی عربوں نے اس ناگہانی حملہ کا بدویانہ سنگ اندازی سے مقابلہ کیا ، جس کا ذکر سورۂ فیل کی آیت تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ میں ہے ، اس سے اللہ تعالیٰ نے اس لشکر کو تباہ کیا ، اور وہ غدار بھی ہلاک ہوئے ، یہ کنکریوں کا پھینکنا اسی ترمیھم کی سنگ باری کی یادگار ہے ، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں بت پرستی کا سب سے بڑا مظاہرہ پتھر کے بتوں کی صورت میں ہوا ہے ، اس لئے پتھر کے ان ستونوں کو کنکری مار کر بت پرستی کے اس سب سے بڑے مظاہرہ کو سنگسار کیا جاتا ہے ، بہرحال خدا کی تسبیح اور حمد پڑھ کر ان کنکریوں کو ان ستونوں پر پھینکتے ہیں ، اور شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں ، چونکہ کنکری مارنا یا پھینکنا بظاہر ایک بے کار کام معلوم ہوتا ہے ، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصریح فرما دی کہ اس کنکری پھینکنے سے مقصود اس بہانہ سے خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے[1] ، قرآن پاک نے بھی اسی حقیقت کی طرف اپنے الفاظ میں

---

[1] مشکوٰۃ باب رمی جمار بحوالہ دارمی ، و ترمذی قال الترمذی حدیث حسن صحیح ،

اشارہ کیا ہے،

فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ	جب سب ارکان ادا کر چکو تو اپنے باپ
فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ	دادون کو جیسے یاد کرتے تھے، ویسے ہی
اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا، (بقرہ-۲۵)	خدا کو یاد کرو، بلکہ اس سے بڑھ کر،

اسی رمیِ جمار پر مراسمِ حج کا خاتمہ ہوتا ہے،

ان رسوم کی غایت اوپر کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ حج کے تمام مراسم اس پرانے عہد کے طریقِ عبادت کی یادگار ہین جس کا باقی رہنا اس لئے ضروری ہے، تاکہ انسانیت کے روحانی دورِ ترقی کا عہدِ آغاز ہماری نگاہون کے سامنے ہمیشہ قائم رہے، اور ہمارے جذبات واحساسات کو یہ تاریخ کی یاد سے پہلے کے واقعات ہمیشہ متحرک کرتے رہین، اور خدا کی یاد، اپنے گناہون کی مغفرت، اور آیندہ اپنی نیک زندگی گذارنے کا عہد ہماری حج سے پہلے اور حج کے بعد کی زندگیون مین جوڑ پیدا کرکے، تغیر و اصلاح کا ایک نیا باب کھولنے کا موقع دے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا، کہ "کنکری مارنے، صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے، اور خانۂ کعبہ کے طواف کرنے کا مقصد خدا کی یاد قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہین ہے[1]" اور قرآنِ پاک کا اشارہ بھی اسی طرف ہے،

وَیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ فِیْٓ اَیَّامٍ	اور تاکہ ان مقررہ دنون مین خدا کا نام
مَّعْلُوْمٰتٍ، (حج-۴)	یاد کرو،

[1] ترمذی، نسائی، دارمی و مستدرک حاکم کتاب الحج،

حج کے مقامات عموماً پیغمبرانہ شان اور ربّانی نشان کے جلوہ گاہ ہیں، جہاں پہنچکر اور جنکو دیکھ کر وہ خدائی رحمت و برکت کے واقعات یاد آتے ہیں، اور اسی لئے قرآن پاک کی اصطلاح میں ان کا نام شَعَائِرُ اللّٰہ اور حُرُمٰتِ اللّٰہِ ہے، یعنی خدا کے نشانات اور خدا کی محترم باتیں اور چیزیں، اور ان ہی شعائر اللہ اور حرمت اللہ کی تعظیم و زیارت کا نام ارکانِ حج ہے، سورۂ حج میں حج کے بعض ارکان کی تفصیل کے بعد ہے،

وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ، (حج ۔۴)	اور جو اللہ کی محترم چیزوں کا ادب کرے، تو وہ اس کے پروردگار کے نزدیک بہتر ہے،

صفا و مروہ کی نسبت ہے،

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ، (بقرہ ۱۹-۱۹)	بیشک صفا اور مروہ خدا کا شعار ہیں،

اور سورۂ حج میں فرمایا،

ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ، (حج ۴)	یہ ہے اور جو اللہ کے شعائر کا ادب کرے تو یہ دلوں کی پرہیزگاری ہے،

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حج کا ایک بڑا مقصد ان محترم مقامات کا ادب و احترام ہے تاکہ ان مقامات سے جو مقدس روایتیں وابستہ ہیں، اُن کی یاد قائم رہے، اور دلوں میں تاثیر کی کیفیت پیدا کرتا رہے،

حج کے آداب | حج کے لئے یہ ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے لے کر احرام اتارنے تک ہر حاجی نیکی و پاکبازی، اور امن و سلامتی کی پوری تصویر ہو، وہ لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد نہ کرے، کسی کو تکلیف نہ دے، یہانتک کہ کسی چیونٹی تک کو بھی نہ مارے، شکار تک اس کے لئے جائز نہین، کیونکہ وہ اس وقت ہمہ تن صلح و آشتی اور امن و امان ہوتا ہے،

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ، (بقرہ ۔ ۲۵)	تو جو ان مہینون مین حج اپنے اوپر فرض کرے تو حج مین نہ شہوت رانی کی باتین کرنا اور نہ گناہ کرنا، اور نہ جھگڑا کرنا ہے، اور جو بھی نیک کام کرو اللہ اس کو جانتا ہے،

غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ، (مائدہ ۔ ۱) حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت مین

اسی طرح جو لوگ حج کی نیت سے روانہ ہون، اُن کو راستہ مین تکلیف دینا یا ان کے مال اور سامان کو لوٹنا یا چرانا بھی خاص طور سے منع کیا گیا، کہ یہ اُس خانۂ الٰہی کے پاس ادب کے خلاف ہے، تاکہ عرب جیسے بے امن ملک مین ان ڈاکوؤن اور رہزنون اور بدمعاشون کی وجہ سے قافلون کا آنا جانا نہ رُکے،

وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنْ رَبِّهِمْ وَرِضْوَانًا، (مائدہ ۔ ۱)	اور نہ اس ادب کے گھر کے قصد کرنے والون کو حلال سمجھو جو اپنے پروردگار کی مہربانی اور خوشنودی کو تلاش کرنے

اگر کسی حاجی سے کسی جانور کے قتل کی حرکت قصداً صادر ہو تو اس پر اس کا خون بہا لازم آتا ہے جس کا نام کفارہ ہے، یعنی اُس مقتول جانور کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی، یا چند محتاجوں کو کھانا کھلانا، یا اتنا ہی روزہ رکھنا، فرمایا،

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا	اے ایمان والو! جب تم احرام میں ہو
الصَّیْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ	تو شکار کو مت مارو، اور تم میں جو جان کر
قَتَلَہٗ مِنْکُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ	مارے گا تو اس کے مارے ہوئے کے
مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ	برابر بدلہ ہے مواشی میں سے، اس کا
یَحْکُمُ بِہٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْکُمْ	فیصلہ تم میں سے دو بہتر آدمی کریں کہ
ھَدْیًا بٰلِغَ الْکَعْبَۃِ اَوْ	اس کو کعبہ تک پہنچا کر قربانی کیجائے
کَفَّارَۃٌ طَعَامُ مَسٰکِیْنَ اَوْ	یا اس کے گناہ کا اتارا ہے، کچھ محتاجوں
عَدْلُ ذٰلِکَ صِیَامًا	کو کھانا کھلانا، یا اسی کے برابر روزے
لِّیَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِہٖ، (مائدہ-۱۳)	تاکہ وہ مجرم اپنے جرم کی سزا چکھے،

اس سے ثابت ہوا کہ حج تمام تر صلح و سلامتی، اور امن و آشتی ہے، اس مقصد کے خلاف حاجی سے اگر کوئی حرکت ہو جائے تو اس کا کفارہ اس پر واجب آجاتا ہے،

حج کی مصلحتیں اور حکمتیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس شریعت کا تکمیلی صحیفہ لے کر آئے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ دین و دنیا کی جامع ہے، اور اس کا ایک ایک حرف مصلحتوں اور حکمتوں کے دفتروں سے معمور ہے، وہ اپنے احکام اور عبادات کے فائدہ

منفعت اور غرض و غایت کے بتانے کے لئے کسی باہر کی امداد کا محتاج نہین بلکہ اس نے ان اسرار کے چہرہ سے خود اپنے ہاتھ سے پردہ ہٹایا ہے، نماز، زکوۃ اور روزہ کی طرح حج کے مقاصد اور فوائد بھی خود اسلام کے صحیفہ ربانی مین مذکور ہین،

قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے خانۂ کعبہ کی تعمیر اور اسمٰعیل کی نذر اور مکہ مین ان کے قیام کے سلسلہ مین جو دعا مانگی وہ تمام تر ان فوائد و مقاصد کو جامع ہے، آئیے ان آیتون پر ایک دفعہ اور نظر ڈال لین،

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا، وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ، وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ، (بقرہ ۵-۱۵)	اور جب ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگون کا مرجع و مرکز اور امن بنایا، اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ، اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کے یہ ذمہ کیا کہ تم دونون میرے گھر کو طواف کرنے والون اور کھڑے ہونے والون اور رکوع کرنے والون اور سجدہ کرنے والون کے لئے پاک و صاف کرو، اور جب ابراہیم نے کہا میرے پروردگار اس کو امن والا شہر بنا، اور اس کے رہنے والون کو پھلون سے روزی دے

عربی	اردو
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ	اے ہمارے پروردگار اور ہم کو اپنا
وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً	تابعدار گروہ بنا، اور ہماری اولاد مین
لَّكَ ص وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا	سے کچھ کو اپنا فرمبردار گروہ بنا، اور
وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ	ہم کو ہمارے حج کے دستور بتا، اور ہم کو معاف
التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ، رَبَّنَا	کر، تو بیشک معاف کرنے والا، رحم کرنے
وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا	والا ہے، اے ہمارے پروردگار اور ان مین
مِّنْهُمْ، (البقرہ-۱۵)	ان ہی مین سے ایک رسول بھیجنا،
وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ	اور جب ہم نے ابراہیم کو یہ گھر کی جگہ
الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ	ٹھکانا دی، کہ کسی کو میرا شریک نہ بنانا، اور
شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ	میرے گھر کو طواف کرنے والون،
وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ	کھڑے ہونے والون، رکوع کرنے
وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ	والون اور سجدہ کرنے والون کیلئے
يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ	پاک وصاف کر، اور لوگون مین حج
ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ	کا اعلان کردے، وہ تیرے پاس پیادہ
عَمِيْقٍ، لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ	اور سفر کی ماری دبلی پتلی ہو جانے
لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ	والی اونٹنیون پر سوار ہو کر، دور دراز
فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا	راستہ سے آئین گے، تاکہ فائدے کی

رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ
الْاَنْعَامِ،

(حج-۴)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ
هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ
وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ،
رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا
مِّنَ النَّاسِ ج فَمَنْ تَبِعَنِيْ
فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ
فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، رَبَّنَآ
اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ
غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ
الْمُحَرَّمِ، رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ
تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ
مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ

(ابراهيم-۶)

جگھون مین آکر جمع ہون، اور چند مقررہ
دنون مین اس بات پر خدا کا نام یاد کرین
کہ ہم نے ان کو جانور روزی کئے،
جب ابراہیم نے کہا میرے پروردگار
اس آبادی کو امن والی بنا، اور مجھے
اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم
بتون کی پوجا کرین، میرے پروردگار
ان بتون نے بہت سے لوگون کو گمراہ
کیا، تو جس نے میرا کہا مانا وہ مجھ سے
ہے، اور جس نے میری نافرمانی کی تو
تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، ہمارے
پروردگار! مین نے اپنی کچھ اولاد اس
بن کھیتی کی ترائی مین تیرے مقدس گھر
کے پاس آباد کی ہے، ہمارے پروردگار
تاکہ وہ نماز کھڑی رکھین، تو لوگون کے
کچھ دلون کو ایسا بنا کہ وہ ان کی طرف
جھکین، اور اُن کو پھلون کی روزی

ان آیتون مین حسب ذیل باتون کی تصریح ہے،

۱- خانہ کعبہ اہل توحید کا ایک مرکز و مرجع، اور ملت ابراہیمی کا موطن و مسکن ہی،

۲- حضرت ابراہیمؑ نے یہان اپنی اولاد کو اس غرض سے بسایا کہ اس مقدس گھر کی خدمت گذاری اور خدائے واحد کی عبادت کرتی رہے، اور بت پرست قومون کے میل جول اور اختلاط سے وہ محفوظ رہے، تاکہ پہلے کی طرح یہ گھر پھر بے نشان نہ ہو جائے، اور آخر ان مین وہ رسول مبعوث ہو، جس کی صفتین ایسی ہون،

۳- یہ لوگ ایک ویرانہ مین جس مین کھیتی نہین، آباد ہوئے ہین، اور صرف اس غرض سے آباد ہوئے ہین، کہ تیرے گھر کو آباد رکھین، تو تو اس بے ثمر اور شور زمین مین ان کی روزی کا سامان کرنا، اور لوگون کے دلون کو ان کی طرف جھکانا، کہ وہ ان سے محبت کرین،

۴- حکم ہوا کہ لوگون مین اس گھر کے حج کا اعلان عام کر، ہر قریب اور دور کے راستہ سے لوگ لبیک کہین گے، تاکہ یہان آکر دین و دنیا کا فائدہ حاصل کرین، اور چند مقررہ ایام مین خدا کا نام لین،

۵- جو لوگ یہان عبادت اور حج کی نیت سے آئین، خداوندا! تو ان کے گناہ معاف کر، تو بڑا مہربان اور رحیم ہے،

۶- خداوندا! میری اولاد وہی ہی جو میرے مشرب و مذہب اور میرے راستہ پر چلے، اس لئے تمام وہ لوگ جو ملت ابراہیمی کے پابند ہون، آل ابراہیم ہین، اور وہی حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤن اور برکتون کے مستحق ہین،

الغرض حج کے یہی منافع اور مقاصد ہین جنمین سے ہرایک کے ماتحت متعدد فوائد اور اغراض ہین،

مرکزیت، خانۂ کعبہ اس دنیا مین عرشِ الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتون اور برکتون کا نقطۂ قدم ہے، یہ وہ آئینہ ہے جس مین اس کی رحمت وغفاری کی صفتین اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعون سے منور کرتی ہین، یہ وہ منبع ہے جہان سے حق پرستی کا چشمہ ابلا، اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا، یہ روحانی علم ومعرفت کا وہ مطلع ہے جن کی کرنون نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشان کیا، یہ وہ جعفرافی شیرازہ ہے جس مین ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہین جو مختلف ملکون اور اقلیمون مین بستے ہین، مختلف زبانین بولتے ہین، مختلف لباس پہنتے ہین، مختلف تمدنون مین زندگی بسر کرتے ہین، مگر وہ سب کے سب باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانۂ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہین، اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہین، اور ایک ہی مقام کو امّ القریٰ مان کر، وطنیت، قومیت، تمدن ومعاشرت، رنگ روپ اور دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن، ایک ہی قومیت (آلِ ابراہیم) ایک ہی تمدن ومعاشرت (ملتِ ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) مین متحد ہوجاتے ہین، اور یہ وہ برادری ہے جس مین دنیا کی تمام قومین اور مختلف ملکون کے بسنے والے، جو وطنیت اور قومیت کی بندشون مین گرفتار ہین، ایک لمحہ اور ایک آن مین داخل ہوتے ہین جس سے انسانون کی بنائی ہوئی تمام زنجیرین اور قیدین اور بیڑیان کٹ جاتی ہین، اور تھوڑے دن کے لئے عرصۂ حج مین تمام قومین ایک ملک مین، ایک لباسِ احرام مین، ایک وضع مین، دوش بدوش ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہین، اور ایک ہی بولی مین خدا سے باتین کرتی ہین

یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے، جو انسانوں میں جنگ وجدل اور فتنہ و فساد کے اسباب ہیں، اس لئے یہ حرمِ ربانی نہ صرف اسی معنی میں امن کا گھر ہے، کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم وستم ناروا ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کرکے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہیں، مٹا دیتا ہے، لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیت و وطنیت کی تنگنائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد میں داخل ہوں، مگر ملتِ ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملتِ محمدی کی تجدیدی پکار نے سینکڑوں ہزاروں برس پہلے اس خواب کو دیکھا، اور دنیا کے سامنے اسکی تعبیر پیش کی، لوگ آج تمام دنیا کے لئے ایک واحد زبان (اسپرنٹو) کی ایجاد و کوشش میں مصروف ہیں، مگر خانۂ کعبہ کی مرکزیت کے فیصلہ نے آلِ ابراہیم کے لئے مدت دراز سے اس مشکل کو حل کر دیا ہے، لوگ آج دنیا کی قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے ایک ورلڈ کانفرنس یا عالمگیر مجلس کے انعقاد کے درپے ہیں، لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ مجلس دنیا میں قائم ہے، اور اسلام کے علم، تمدن، مذہب اور اخلاق کی وحدت کی علمبردار ہے آج دنیا کی قومیں ہیگ (ہولینڈ) میں اقوامِ عالم کی مشترکہ عدالت گاہ کی بنیاد ڈالتی ہیں، لیکن اس کے فیصلوں کو کسی طاقت سے منوا نہیں سکتیں لیکن مسلمان اقوامِ عالم کے لئے یہ مشترکہ عدالت گاہ ہمیشہ سے قائم ہے، جس کی عدالت کا حقیقی کرسی نشین خود احکم الحاکمین ہے، جس کے فیصلہ سے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں،

مسلمان ڈیڑھ سو برس تک جب تک ایک نظمِ حکومت یا خلافت کے ماتحت رہے

یہ حج کا موسم اُن کے سیاسی اور تنظیمی ادارہ کا سب سے بڑا عنصر رہا، یہ وہ زمانہ ہوتا تھا جس مین امورِ خلافت کے تمام اہم معاملات طے پاتے تھے، اسپین سے لے کر سندھ تک مختلف ملکون کے حکام اور والی جمع ہوتے تھے، اور خلیفہ کے سامنے مسائل پر بحث کرتے تھے، اور طریق عمل طے کرتے تھے، اور مختلف ملکوں کی رعایا آکر، اگر اپنے والیوں اور حاکموں سے کچھ شکایتیں ہوتی تھیں، تو ان کو خلیفہ کی عدالت مین پیش کرتی تھی، اور انصاف پاتی تھی،

غالبًا یہی وجہ ہے کہ مسائلِ حج کے فورًا ہی بعد اللہ تعالیٰ نے ملک مین فساد اور بے امنی کی برائی کی، اور فرمایا

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ	بعضے آدمی ایسے ہین کہ اُن کی بات
قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ	دنیا کی زندگی مین بھلی معلوم ہوتی ہے،
اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ	اور جو اس کے دل مین ہے اُس پر
اَلَدُّ الْخِصَامِ، وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى	وہ خدا کو گواہ بناتے ہین، حالانکہ وہ
فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا	پرلے درجہ کے جھگڑالو ہین، اور جب
وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ،	پیٹھ پھیرتے ہین تو ملک مین دوڑتے پھرتے
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ،	ہین، کہ اس مین بے امنی برپا ہو، اور
	تاکہ کھیتیان اور جانین تلف ہون،
(بقرہ - ۲۵)	اور اللہ فساد پیدا کرنے کو پسند نہین کرتا

پھر دو آیتون کے بعد فرمایا،

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ، (بقرہ۔۲۵)

اے ایمان والو، تم سب کے سب امن مین داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو، کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے،

اسلام کے احکام اور مسائل جو دم کے دم مین اور سال بسال دور دراز اقلیمون، ملکون اور شہرون مین اُس وقت پھیل سکے جب سفر اور آمد و رفت کا مسئلہ آسان نہ تھا، اس کا اصلی راز یہی سالانہ حج کا اجتماع ہے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سب سے آخری حج جو حجۃ الوداع کہلاتا ہے، اسی اصول پر کیا، وہ انسان جو تیرہ برس تک مکہ مین یکہ و تنہا رہا، ۲۳ برس کے بعد وہ موقع آیا جب اس نے تقریبًا ایک لاکھ کے مجمع کو بیک دفعہ خطاب کیا، اور سب نے سمعًا و طاعةً کہا، آپ کے بعد خلفاے راشدین اور دوسرے خلفاے زمانہ، صحابہ کرامؓ اور ائمۂ اعلامؒ نے اسی طرح سال بسال جمع ہو کر احکامِ اسلام کی تلقین و تبلیغ کی خدمت ادا کی اسی کا نتیجہ تھا کہ نت نئے واقعات اور مسائل کے متعلق دنیا کے مختلف گوشون مین اسلام کے جوابی احکام اور فتوے پہنچتے رہے اور پہنچتے رہتے ہین،

یہ اسی مرکزیت کا اثر ہے کہ بڑے بڑے صحابہؓ اور عالم، محدث، مفسر، اور فقیہ جو اسلامی فتوحات اور نو آبادیون کے سلسلہ مین تمام دنیا مین پھیل گئے تھے وہ سال بسال پھر آکر یہان سمٹ جاتے تھے، اور تمام دنیا کے گوشون سے آکر حرمِ ابراہیمؑ مین جمع ہو جاتے تھے، اور باہم ایک دوسرے سے مل کر اس علم کو جو ابھی دنیا مین متفرق و پراگندہ تھا، ابراہیمی درسگاہ کے صحن

مین ایک دفتر مین جمع کر دیتے تھے یہین آکر بخارا کا باشندہ، اسپین اور مراکش کے رہنے والون سے، شامی، عراقی اور مصری حجازی سے، بصری کوفی سے، کوفی بصری سے، ترمذی نیشاپوری سے، اندلسی، سندھی، (ہندوستانی) سے، رومی یمنی سے فیض پاتا تھا، اور دم کے دم مین سندھ کا علم اسپین مین، اور اسپین کی تحقیق سندھ مین پہنچ جاتی تھی مصر کی تصنیف و روایت ترکستان مین، اور ترکستان کا فیصلہ مصر و شام مین پہنچ جاتا تھا، عبد اللہ بن مسعودؓ کے شاگرد و عبد اللہ ابن عمرؓ اور عائشہؓ کے تلامذہ سے اور ابن عباسؓ کے مسترشد ابوہریرہؓ کے مستفیدون سے، اور انسؓ کے حلقے کے فیضیاب علیؓ کے شاگردون سے مستفید و سیراب ہوتے تھے، یہی وہ مرکز تھا جہان ائمۂ مجتہدین باہم ایک دوسرے سے ملتے اور ایک دوسرے کے علم سے فیضیاب ہوتے تھے، اور یہی تعارف وہ اصلی ذریعہ تھا جس کی بناء پر صحابۂ کرام اور اُن کے تلامذہ اور مستفیدین کے تمام دنیا مین پھیل جانے کے باوجود بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و واقعات و مغازی اور احکام و فرامین و وصایا کا سارا دفتر پھر سمٹ کر ایک ہوگیا، اور آپ کے سیر و مغازی اور احادیث و تعلیمات مرتب و مدوّن ہو کر ہر مسلمان کے سامنے آگئین، اور مؤطا، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی اور احادیث کے متعدد دفاتر عالمِ وجود مین آئے، اور ائمہ مجتہدین کے لئے یہ ممکن ہوسکا کہ مسائل کے متعلق دوسرے امامون کے خیالات و معلومات سے مستفید ہو کر اجماعی مسائل کو الگ کرسکین، اور اس سے پہلے کہ کتابین مدوّن ہون اور پھیلین ہر ملک اور ہر شہر کے علماء دوسرے ملک اور شہر کے علماء کے خیالات و معلومات سے واقف ہوسکے اور زمانہ کے حالات کے زیر اثر آج تک کم و بیش یہ سلسلہ قائم ہے،

یہ اسی کی مرکزیت کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمان جو اپنے اپنے ملکون مین اپنے اپنے حالات مین گرفتار ہین، وہ دور دراز مسافتون کو طے کرکے اور ہر قسم کی مصیبتون کو جھیل کر، دریا، پہاڑ، جنگل، آبادی، اور صحرا کو عبور کرکے یہان جمع ہوتے، ایک دوسرے سے ملتے، ایک دوسرے کے درد وغم سے واقف اور حالات سے آشنا ہوتے ہین، جس سے ان مین باہمی اتحاد اور تعاون کی روح پیدا ہوتی ہے، یہین آکر چینی مراکشی سے، تونسی ہندی سے، تاتاری حبشی سے، فرنگی زنگی سے، عجمی عربی سے، یمنی نجدی سے، ترکی افغانی سے، مصری ترکستانی سے، بدوی الجزائری سے، افریقی یورپین سے، جاوی بلغاری سے ملتا ہے، اور سب مل کر باہم ایک قوم، ایک نسل، ایک خاندان کے افراد نظر آتے ہین،

اسی کا اثر تھا اور ہے کہ معمولی سے معمولی مسلمان بھی اپنے ملک سے باہر کی کچھ دنیا دیکھ آتا ہے، زمانہ کے رنگ کو پہچاننے، اور سیاسیات کی پیچیدگیون کو سمجھنے لگتا ہے، بین الاقوامی معاملات سے دلچسپی لیتا ہے، اور دنیا کے ہر اس گوشہ کے حالات سے جس کے منارہ سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہو اس کو خاص ذوق ہوتا ہے، اور اسی کا اثر ہے کہ ہر مسلمان دنیائے اسلام اور اسلامی ملکون کے حالات و واقعات کے لئے بیچین نظر آتا ہے، پھر اسی کا نتیجہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمانون کی بھی اچھی خاصی تعداد ایسی ملیگی جس کو دنیا کے سفر کا کچھ تجربہ ہوگا، اور خشکی وتری سے اس کو کچھ واقفیت ہوگی، دنیا کے جغرافی معلومات کے بڑھانے اور ترقی دینے مین سفرِ حج نے بہت کچھ مدد کی ہے، مسلمانون مین بکثرت ایسے جغرافیہ نویس اور سیاح گذرے ہین، جنھون نے اصل مین حج کی نیت سے سفر کیا، اور بالآخر اس سفر نے دنیا کی ایک عام

سیاحت کی حیثیت اختیار کرلی، یاقوت رومی نے اپنے جغرافیہ تقویم البلدان کے مقدمہ مین مسلمانون مین جغرافی معلومات کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ اسی سفرِ حج کو قرار دیا ہے،

رزقِ ثمرات - اس مرکز کو قائم اور آباد رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس شورہ ویرانے مین بسنے والون کے لئے رزق کا کوئی سامان کیا جائے، اسی لئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی تھی، کہ "خداوندا مین نے اپنی اولاد کو اس بے حاصل اور بے آب وگیاہ سرزمین مین آباد کیا ہے تو لوگون کے دل اُن کی طرف جھکانا، اور اُن کے رزق کا سامان کرنا، اور اُن کو پھل کی روزی دینا" اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی، اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ یہان کے بسنے والون کے لئے زکوٰۃ وخیرات کی کوئی رقم خاص کیجاتی، لیکن یہ اُن لوگون کی اخلاقی پستی اور دون فطرتی کا سبب ہوجاتی، وہ لوگون کی نظرون مین ذلیل وخوار ہوجاتے، جو ان کے منصب کی عزت اور شرف کے مناسب نہ ہوتا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ تدبیر کی کہ ان کے دلون مین تجارت کا شوق پیدا کیا، اور اس کو اُن کی روزی کا سامان بنا دیا، حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کا جہان کہین پرانی تاریخون مین وجود نظر آتا ہے، وہ تجارت اور سوداگری کے بھیس مین ملتی ہے، حضرت یعقوبؑ ہی کے زمانہ مین جو حضرت اسمٰعیلؑ کے بھتیجے اور حضرت اسحاقؑ کے بیٹے تھے، بنی اسماعیل کا تجارتی قافلہ عرب سے مصر کو جاتا ہوا نظر آتا ہے، (تکوین ۳۷-۲۸ سے ۳۶ تک) توراۃ کے متعدد مقامات مین عرب سوداگرون اور تاجرون کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے، خود قریش بھی اپنے زمانہ کے بڑے تاجر اور سوداگر تھے جس کا ذکر سورۂ "لایلف قریش" مین ہے، وہ ایک طرف یمن اور حبشہ تک اور دوسری طرف شام ومصر وروم تک جاتے تھے،[1]

[1] تفصیل اور حوالون کے لئے دیکھو میری تالیف ارض القرآن جلد دوم باب تجارت العرب قبل الاسلام ۱۲

لیکن چونکہ یہ تجارت بھی مکہ معظمہ کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی شکم سیری کے لئے کافی نہ تھی، اس لئے خود مکہ کی سرزمین کو اور حج کے مقام کو تجارت کی منڈی بنانے کی ضرورت تھی، چنانچہ اسلام سے پہلے بھی حج کا موسم عرب کا ایک بڑا میلہ تھا، اور عکاظ وغیرہ کا بڑا بازار لگتا تھا، اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا، کہ یہ دعائے ابراہیمی کا مصداق، اور اس شور و بے حاصل زمین کے بسنے والوں کے لئے روزی کا سامان تھا، اسلام کے بعد تمام دنیا سے مسلمان یہاں آنے لگے، چنانچہ سال کے دو تین مہینے میں یہاں کے رہنے والے تجارت اور سوداگری سے اس قدر کما لیتے ہیں کہ وہ سال بھر کھا پی سکیں، مکہ سے مدینہ کو جب قافلہ جاتا ہے، تو پورے راستہ اور منزلوں کے بدو اپنے پھل اور پیداوار لے کر آتے ہیں، اور خرید و فروخت سے اپنی زندگی کا سامان حاصل کرتے ہیں، کھانا، پینا، مکان، سواری اور دوسرے ضروریات اسی شہر اور اس کے آس پاس سے تمام حاجی حاصل کرتے ہیں، اور اس کا معاوضہ ادا کرتے ہیں، اور آخر یہی زرِ معاوضہ اہلِ مکہ کے قوتِ لایموت کا ذریعہ بنجاتا ہے،

قربانی کی اقتصادی حیثیت

اس ملک کی فطری پیداواروں میں اگر کوئی چیز ہے تو وہ جانوروں کی پیداوار ہے، اس بنا پر قربانی کے فریضہ نے بھی ان اہلِ عرب اور اہلِ بادیہ کے لئے ان جانوروں سے اپنی روزی کے پیدا کرنے کا سامان کر دیا، ہر سال تقریبًا ایک لاکھ حاجی قربانی کرتے ہیں جنمیں سے بعض کئی کئی کرتے ہیں، اس حساب سے سالانہ دو لاکھ جانوروں سے کم کی قربانی نہیں ہوتی، اور عمومًا دنبہ کی قیمت آٹھ روپیے، اور بکری کی چار روپیے وہاں ہوتی ہے، تو اس تقریب سے کم و بیش دس بارہ لاکھ روپیے ہر سال اہلِ بادیہ کو اپنے جانوروں کی فروخت سے ملتے

ہین، اور یہ اس بے آب وگیاہ اور ویران ملک کے باشندون کی بہت بڑی مدد ہے،

ابراہیمی دعا کی مقبولیت | حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعا مین خاص طور سے پھلون کا ذکر کیا تھا،

وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ،	اور یہان کے رہنے والون کو پھلون
(بقرہ - ۱۵)	مین سے روزی دینا،

اس دعا کا یہ اثر ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ مکۂ معظمہ کے بازارون مین ہر وقت تازہ سے تازہ پھل، میوے، سبزی اور ترکاریان نظر آتی ہین، اور دعاے ابراہیمی کا وہ جلوہ دکھاتی ہین کہ زبان کے ذائقہ کے ساتھ ایمان کی حلاوت کا مزہ بھی ملنے لگتا ہے،

تجارت | قرآنِ پاک کے محاورہ مین "خدا کا فضل تلاش کرنے" سے مقصود تجارت اور روزی حاصل کرنا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حج کا ایک صریح مقصد تجارت اور حصولِ رزق کو بھی قرار دیا ہے، چنانچہ سورۂ مائدہ مین ہے،

وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ	اور نہ ان کو (ستاؤ) جو اس ادب
يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ	والے گھر کے قصد سے جا رہے ہون
وَرِضْوَانًا،	اپنے پروردگار کا فضل اور خوشنودی
(مائدہ - ۱)	تلاش کرتے ہوئے،

یعنی ان کے مال واسباب کو لوٹنا جائز نہین، کہ اس بے اطمینانی سے حج کا ایک بڑا مقصد فوت ہو جائے گا،

تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر دنیا کا ایک کام معلوم ہوتا ہے، اس لئے اسلام کے

بعد بعض صحابہ نے اپنے اس خالص مذہبی سفر مین تجارت وغیرہ کسی دنیاوی غرض کو شامل کرنا اچھا نہین سمجھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ لوگون سے بھیک مانگ کر حج کرنا اچھا نہین کہ یہ تقویٰ کے خلاف ہے، بلکہ تجارت کرتے ہوئے چلو تو بہتر ہے فرمایا،

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ	اور راہ کا توشہ (خرچ) لے کر چلو، کہ
التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يٰاُولِي	راستہ کا سب سے اچھا توشہ تقویٰ (بھیک
الْاَلْبَابِ، لَيْسَ عَلَيْكُمْ	نہ مانگنا) ہے، تم پر گناہ نہین ہے کہ
جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا	تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرتے
مِّنْ رَّبِّكُمْ (بقرہ ۲۵)	ہوئے چلو، (یعنی بیوپار کرتے ہوئے)

یہ اندیشہ کہ یہ دنیا کا کام ہے جو دین کے سفر مین جائز نہین، درست نہ تھا، کہ اول تو "طلبِ رزق" ہر حال مین بجائے خود اسلام مین عبادت اور نیکی کا کام ہے، دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی بنا پر یہ خود حج کے مقاصد مین ہے، کہ اس کے بغیر اس شہر کی آبادی ترقی اور بقا ممکن نہین یعنی حج کا ایک مقصد یہ بھی ہے، کہ خانۂ کعبہ کی حفاظت اور خدمت کے لئے اس شہر کی آبادی اور رونق قائم رہے، جس کا بڑا ذریعہ تجارت ہے، یہ مقام گویا مسلمانون کے عالمگیر تجارتی کاروبار کا مرکز، اور ممالکِ اسلامیہ کی صنعتون کی سالانہ نمایش گاہ ہے جس کا پچھلا بقیہ نمونہ آج بھی موجود ہے، وہ کونسا اسلامی ملک ہے جہان کی صنعت کا نمونہ یہان دیکھنے والے کو نظر نہین آسکتا، لیکن افسوس ہے کہ آجکل کے مسلمانون نے حج کے اس اہم نکتہ کی اہمیت کو کچھ تو بھلا دیا ہے، اور کچھ غیر مسلمانون کی تجارتی چیرہ دستی سے وہ دبے بھی ہین،

اور آج وہ مرکز جو اسلامی ملکوں کا مرکزی بازار تھا یورپ کے مصنوعات کا مرکزی بازار بن رہا ہے، اس جنگِ عظیم کے بعد سے حالات اور بھی زیادہ انحطاط پذیر ہین،

روحانیت۔ روحانیت سے مقصود وہ تاثرات اور کیفیتین ہین جو ان مقامات کی زیارت اور ان ارکانِ حج کے ادا کرنے سے قلب و روح مین پیدا ہوتی ہین، اُن کی ایک حیثیت تو وطنی، دوسری تاریخی اور تیسری خالص روحانی ہے، وطنی ہونے کے یہ معنی کہ گو مسلمان دنیا کے ہر ملک مین رہتے، ہر زبان بولتے، اور ہر لباس پہنتے ہین، تاہم ان کے اندر یہ احساس باقی رہتا ہے کہ وہ جسمانی طور سے کہین ہون، تاہم روحانی طور سے ان کا مسکن عرب ہی کی سرزمین ہے، وہی ملتِ ابراہیمی کا مقام، اسلام کا مولد، اور قرآن کا مہبط ہے، اس لئے دور دراز مسافتون سے ولولہ اور شوق کے بازوون سے اُڑ کر جب لوگ یہان پہنچتے ہین، تو اس ریگستان اور پہاڑ کو دیکھ کر ان کی محبت کا سرچشمہ ابلنے لگتا ہے، اور اُن کے دل مین اسلام کے وطن اور قرآن کی سرزمین کے مشاہدہ سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے، مسلمان جس ملک مین بھی ہے، اس کو وہان اسلام اپنے خالص وطن مین نظر نہین آتا، ہر جگہ اس کو اپنے ساتھ دوسری قومین بھی نظر آتی ہین، اپنے مذہب کے ساتھ اس کو دوسرے مذہب بھی دکھائی دیتے ہین اپنے تمدن کے ساتھ دوسرے تمدنون کا بھی منظر سامنے ہوتا ہے، لیکن یہان اسلام اُس کو اپنے خالص رنگ مین جلوہ گر معلوم ہوتا ہے، گرد و پیش، آگے پیچھے، داہنے بائین، ہر طرف اور ہر سمت اس کو اسلام ہی کا مجسم پیکر دکھائی دیتا ہے، اور اس وقت سرزمین حجاز اور دنیا کے کل ممالک کا تعلق اس کی نگاہ مین ایسا نظر آتا ہے جس طرح نوآبادیون کے رہنے والون کی نگاہ مین اپنی مادرِ وطن (مدر لینڈ)

کی حیثیت، آج انگریز، ہندوستان، عراق، مصر، فلسطین، سائپرس، جبل الطارق، نیوزیلینڈ، سنگاپور، آسٹریلیا، یوگنڈا، ٹرنسوال، زنجبار، اور افریقہ اور کنیڈا (امریکہ) کے متفرق ملکون مین آباد ہین، تاہم انگلینڈ کا چھوٹا سا جزیرہ اُن کی نگاہ مین اس وسیع برطانی مملکت کا جس مین آفتاب نہین غروب ہوتا، مرکز ہے، وہ اُن کا اصلی آبائی وطن اور مسکن ہے، وہ تمدن، معاشرت، اخلاق، تعلیم، لٹریچر ہر چیز مین اپنے اس آبائی وطن و مسکن کی پیروی کرتے ہین، جب ان کی آنکھین اس کے دیدار سے مشرف ہوتی ہین تو اپنی خالص اور بے میل تہذیب، اخلاق، اور تمدن کے ملک کو دیکھکر مسرت اور خوشی سے روشن ہو جاتی ہین، وہ اس کے ایک ایک در و دیوار کو عزت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہین، اس وقت اُن کے دل مین وہ احساسات پیدا ہوتے ہین، جو دوسرے ملکون، قومون، اور تمدنون مین رہنے کی وجہ سے ان کی فرسودہ اور پژمردہ ہو جانے والی فکر اور عمل کی قوتون کو بیدار کر دیتے ہین، اور وہ یہان آکر اپنی خالص تہذیب و تمدن کے پاک و صاف چشمۂ حیات مین نہا کر نئے سرے سے پھر جوان ہو جاتے ہین، بلا تشبیہ اسی قسم کی کیفیت اور لذت ان مسلمانون کی ہے جو عرب کو اپنا، اپنے مذہب کا، اپنی قومیت کا، اپنے تمدن کا، اپنے علوم و فنون کا مولد و مسکن سمجھتے ہین، ان مین سے جب کسی کو اس ملک اور اس شہر کی زیارت کا موقع ملتا ہے، تو اُس کا ذرہ ذرہ اس زائر کے دامنِ دل سے لپٹ جاتا ہے اور وہ چلا اُٹھتا ہے،

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

یہی فلسفہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وصیت فرمائی کہ اس ملک مین اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب، کعبہ کے سوا کوئی دوسرا قبلہ اور قرآن کے سوا کوئی دوسرا صحیفہ نہ رہنے دیا جائے، اور قرآن نے حکم دیا کہ مشرک و کافر اس ادب والی مسجد کے قریب بھی نہ آنے پائین، تاکہ یہان اسلام کا سرچشمہ ہر طرح پاک وصاف، اور کفر وشرک کی ہر قسم کی نجاستون سے محفوظ رہے، تاکہ ہر گوشہ اور ہر سمت سے یہان آکر مسلمان خالص پاکیزگی حاصل اور روحِ ایمانی کو تازہ کرسکین، قرآن پاک نے مکہ معظمہ کو "ام القریٰ" یعنی "آبادیون کی مان" کہا ہے، اگر مکہ معظمہ تمام دنیا کی آبادیون کی مان اور اصل نہ بھی ہو تو اسلامی دنیا کی آبادیون کی مان اور اصل و مرجع اور ماوی تو ضرور ہے،

تاریخیت۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ کا حرف حرف اسی عرب اور حرم پاک کے ذرہ ذرہ سے مرتب ہوا ہے، آدمؑ سے لے کر ابراہیمؑ تک اور ابراہیمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ تک جو کچھ ہوا ہے، اس کا تمامتر تعلق ارضِ حرم کے کوہ وصحرا اور در و دیوار سے ہے یہین حضرت آدمؑ نے سکونت کی، اور عرش کے سایہ مین خدا کا گھر بنایا یہین حواؑ نے آکر ان سے ملاقات کی، یہین نوحؑ کی کشتی نے آکر دم لیا حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے یہان پناہ لی، حضرت ابراہیمؑ نے یہان ہجرت کی، حضرت اسمٰعیلؑ نے یہین سکونت اختیار کی، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہان ولادت پائی، یہین وہ پہاڑی ہے (صفا) جہان حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ اپنے گدھے چھوڑ کر اترے، یہین وہ دوسری پہاڑی ہے (مروہ) جس پر باپ نے بیٹے کی قربانی کرنی چاہی، یہین وہ چشمہ ہے (زمزم) جو حضرت ہاجرہؑ کو پیاس کے عالم مین نظر آیا یہین وہ خانۂ خدا ہے

جس کی چہار دیواری کو ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے بلند کیا، یہین وہ مقام ہے جہان کھڑے ہو کر انھون نے خدا کے آگے سر جھکائے، اسی کے قریب منیٰ مشعر حرام، اور عرفات ہین، جو شعائر اللہ ہین یہین وہ پتھر (حجر اسود) ہے، جو ابراہیم و اسمٰعیل اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھون سے مس ہوا، یہی وہ سرزمین ہے، جہان ملت ابراہیمی کی بنیاد پڑی، یہی وہ آبادی ہے، جہان اسلام کا آفتاب طلوع ہوا، یہین وہ گلیان اور راستے ہین جو جبرئیل امین کے گذرگاہ تھے، یہین وہ غار حرا ہے جس سے قرآن کی پہلی کرن پھوٹی تھی، یہی وہ صحن حرم ہے جس مین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترپن سال بسر کئے، اور یہی وہ مقام ہے، جہان براق کے قدم پڑے تھے، اور یہی وہ مکانات ہین جن کی ایک ایک اینٹ اسلام کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہے، کیا قرآن پاک کا اشارہ ان ہی مناظر اور مشاہد کی طرف نہین، جہان اس نے کہا،

فِيهِ اٰيَاتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرَاهِيْمَ (آل عمران - ۱۰)	اس حرم مین کھلے کھلے (ربانی) نشانات ہین، ابراہیم کے قیام کی جگہ،

ان مقامات اور مناظر مین کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے، تو اس کے ادب کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہین، اس کی عقیدت کا سر جھک جاتا ہے، اس کے ایمان کا خون جوش مارنے لگتا ہے، اسکے جذبات کا سمندر متلاطم ہو جاتا ہے، جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے، اور محبت کی روح اس کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ مین تڑپنے لگتی ہے، جدھر نظر ڈالتا ہے دل وجد کرتا ہے، آنکھین اشکبار ہوتی ہین، اور زبان تسبیح و تہلیل مین مصروف ہو جاتی ہے، اور یہی وہ لذت اور لطف ہے جو ایمان کو تازہ، عقیدت کو مضبوط، اور شعائر اللہ کی محبت کو زندہ کرتا ہے،

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا	اور جو خدا کی نشانیون اور یادگارون
مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ،	کی عظمت کرتا ہے، تو وہ دلون کے
(حج-۴)	تقوٰی کے سبب سے ہے،
وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ	اور جو خدا کی حرمتون کی تعظیم کرتا ہو
خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ،	تو وہ اس کے لئے اس کے خدا کے
(حج-۴)	نزدیک بہتر ہے،

خالص روحانیت - "حج کی حقیقت" مین گذر چکا ہے، کہ وہ دراصل اس رسمی قربانی اور اس دوڑ دھوپ کا نام نہین، یہ تو حج کی روحانیت کی صرف جسمانی اور مادّی شکل ہے، حج کے یہ ارکان ہمارے اندرونی احساسات، کیفیات اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلین ہین، اسی لئے سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ نے اصلی اور صحیح حج کا نام صرف حج نہین بلکہ "**حج مبرور**" رکھا ہے یعنی "وہ حج جو سراپا نیکی ہو" اور یہی حج ان تمام برکات اور رحمتون کا خزانہ ہے، جو عرفات کے سائلون کے لئے خاص ہے، حج کی روحانیت درحقیقت توبہ، انابت، اور گذشتہ ضائع اور کھوئی ہوئی عمر کی تلافی کے عہد، اور آیندہ کے لئے اطاعت اور فرمانبرداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے، اور اس کا اشارہ خود دعائے ابراہیمی مین مذکور ہے،

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ	اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار
وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً	(مسلم) بنا، اور ہماری اولاد مین سے
لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ	اپنا ایک فرمانبردار گروہ بنا، اور ہم کو

عَلَيْنَا ۚ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۔ (بقرہ کا ۔ ۱۵)

اپنے حج کے احکام اور دستور سکھا اور ہم پر رجوع ہو (یا ہم کو معاف کر) تو (بندوں کی طرف) رجوع ہونے والا (یا اُن کو معاف کرنے والا) اور رحم کرنے والا ہے ۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا بھی ان کی دوسری دعاؤں کی طرح ضرور قبول کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوا کہ حج درحقیقت خدا کے سامنے اس سرزمین مین حاضر ہو کر، جہان اکثر نبیون، رسولون اور برگزیدون نے حاضر ہو کر اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا اعتراف کیا، اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد و اقرار ہے، اور ان مقامات مین کھڑے ہو کر، اور چل کر خدا کی بارگاہ مین اپنی سیہ کاریون سے توبہ کرنا اور اپنے روٹھے ہوئے مولیٰ کو منانا ہے تاکہ وہ ہماری طرف پھر رجوع ہو، کہ وہ تو اپنے تائب گنہگارون کی طرف رجوع ہونے کے لئے ہر وقت تیار ہے، وہ تو رحم و کرم لطف و عنایت کا بحر بیکران ہے ۔

یہی سبب ہے کہ شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "حج اور عمرہ گناہون کو اس طرح صاف کر دیتے ہین، جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے اور جو مومن اس دن (یعنی عرفہ کے دن) احرام کی حالت مین گذارتا ہے، اس کا سورج جب ڈوبتا ہے تو اس کے گناہون کو لے کر ڈوبتا ہے[1]"

[1] نسائی و ترمذی و بزاز و طبرانی کبیر بحوالہ جمع الفوائد کتاب الحج جلد اول صفحہ ۱۶۳ میرٹھ ۔

صحیح مسلم اور نسائی مین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے یہ بشارت دی کہ عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہین جس مین خدا اپنے بندون کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہو، وہ اس دن اپنے بندون سے قریب ہوکر جلوہ گر ہوتا ہے، اور اپنے اُن بندون پر فرشتون کے سامنے فخر کرتا ہے، اور کہتا ہے، کہ جو انھون نے مانگا (وہ ہم نے قبول کیا) "موطا امام مالک" مین ہے کہ آپ نے یہ خوشخبری سنائی کہ "بدر کے دن کے سوا عرفہ کے دن سے زیادہ شیطان کسی دن ذلیل، رسوا اور غضبناک نہین ہوتا، کیونکہ اس دن وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی رحمت برس رہی ہے اور گناہ معاف ہو رہے ہین" اسی طرح اور بہت سی حدیثین ہین جنمین مخلصانہ حج ادا کرنے والون کو رحمت اور مغفرت کی نوید سنائی گئی ہے، یہ تمام حدیثین درحقیقت اسی دعاے ابراہیمی وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا (اور ہمارے حج کے دستور ہم کو سوجھا، اور ہماری توبہ قبول فرما) کی تفسیرین ہین،

ان تمام بشارتون سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج درحقیقت توبہ اور انابت ہے اسی لئے احرام باندھنے کے ساتھ لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ "خداوندا مین حاضر ہون مین حاضر ہون" کا ترانہ دم بدم اس کی زبان سے بلند ہونے لگتا ہے، طواف مین، سعی مین، کوہ صفا پر، کوہ مروہ پر، عرفات مین، مزدلفہ مین، منیٰ مین، ہر جگہ جو دعائین مانگی جاتی ہین، اُن کا بڑا حصہ توبہ اور استغفار کا ہوتا ہے اور اس بنا پر کہ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ[1] "گناہ سے بصدق دل توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسا وہ جس کا کوئی گناہ نہین ہے، اسی لئے حج مبرور والون کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہین،

---

[1] سنن ابن ماجہ، باب ذکر التوبہ،

گو کہ توبہ سے ہر جگہ گناہ معاف ہو سکتے ہین، اس کے لئے کعبہ اور عرفات کی کچھ تخصیص نہین، لیکن حج کے مشاعر مقامات اور ارکان اپنے گوناگون تاثرات کی بنا پر دوسرے فوائد برکات کے علاوہ جو یہان کے سوا اور کہین نہین، صدقِ توبہ کے لئے بہتر سے بہتر موقع پیدا کرتے ہین ان مقامات کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب مین ہے، اس کا نفسیاتی اثر دل پر بڑا گہرا پڑتا ہے، وہ مقامات جہان انبیاء علیہم السلام پر برکتون اور رحمتون کا نزول اور انوارِ الٰہی کی بارش ہوئی، وہ ماحول، وہ فضا، وہ تمام گنہگارون کی ایک جگہ اکٹھا ہو کر دعا وزاری، فریاد و بکا اور آہ و نالہ، وہ قدم قدم پر نبوی مناظر اور ربانی مشاہد، جہان خدا اور اس کے برگزیدہ بندون کے بیسیون ناز و نیاز کے معاملات گذر چکے ہین، دعا اور اس کے تاثر اور اس کے قبول کے بہترین موقع ہین، جہان حضرت آدمؑ و حواؑ نے اپنے گناہون کی معافی کی دعا کی، جہان حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اور اپنی اولاد کے لئے دعا مانگی، جہان حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد اپنی پناہ ڈھونڈھی، جہان دوسرے پیغمبرون نے دعائین کین، جہان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر اپنی اور اپنی امت کے لئے دعائین مانگین، وہی مقامات، وہی مشاہد اور دعاؤن کے وہی ارکان، ہم گنہگارون کی دعاے مغفرت کے لئے کس قدر موزون اور مناسب ہین، کہ پتھر سے پتھر دل بھی، ان حالات اور ان مشاہد کے درمیان موم بننے کے لئے تیار ہو جاتے ہین، اور انسان اُس ابرِ کرم کی چھینٹون سے سیراب ہو جاتا ہے، جو وقتاً فوقتاً یہان برگزیدگانِ الٰہی پر عرشِ الٰہی سے برستا رہا ہے اور ہنوز آن ابرِ رحمت دُر فشان است،

انسان کی نفسیت (سائکالوجی) یہ ہے، اور روزمرہ کا تجربہ اس کا شاہد ہے کہ وہ اپنی زندگی

ہین کسی بڑے اور اہم تغیر کے لئے ہمیشہ زندگی کے کسی موڑ اور حدِ فاصل کی تلاش کرتا ہے، جہان پہنچکر اس کی گذشتہ اور آیندہ زندگی کے دو ممتاز حصے پیدا ہو جائین، اسی لئے لوگ اپنے تغیر کے لئے جاڑا، گرمی یا برسات کا انتظار کرتے ہین، بہت سے لوگ شادی کے بعد یا صاحب اولاد ہونے کے بعد، یا تعلیم سے فراغت کے بعد، یا کسی نوکری کے بعد، یا کسی بڑی کامیابی یا کسی خاص مہم اور سفر کے بعد، یا کسی سے مرید ہو جانے کے بعد بدل جاتے ہین، یا اپنے کو بدل لینے پر قادر ہو جاتے ہین، کیونکہ اُن کی زندگی کے یہ اہم واقعات اور سوانح ان کی اگلی اور پچھلی زندگی مین فصل اور امتیاز کا خط ڈال دیتے ہین، جہان سے اِدھر یا اُدھر مڑ جانا ممکن ہو جاتا ہے، حج درحقیقت اسی طرح انسان کی گذشتہ اور آیندہ زندگی کے درمیان ایک حدِ فاصل کا کام دیتا ہے، اور اصلاح اور تغیر کی جانب اپنی زندگی کو پھیر دینے کا موقع بہم پہنچاتا ہے، یہان سے انسان اپنی پچھلی زندگی جیسی بھی ہو اس کو ختم کر کے نئی زندگی شروع کرتا ہے، اُن بابرکت مقامون پر حاضر اور وہان کھڑے ہو کر، جہان جلیل القدر انبیائے کرام اور خاصانِ الٰہی کھڑے ہوئے، خدا کے گھر کے سامنے، قبلہ کے روبرو جو اسکی نمازون اور عقیدتون اور مناجاتون کی غائبانہ سمت ہے، اپنی پچھلی زندگی کی کوتاہیون پر ندامت اور اپنے گناہون کا اعتراف، اور آیندہ اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ اور اقرار وہ اثر پیدا کرتا ہے کہ شر سے خیر کی طرف، خیر سے اور زیادہ خیر کی طرف، زندگی کا رُخ بدل جاتا ہے، اور زندگی کا گذشتہ باب بند ہو کر اس کا دوسرا باب کھل جاتا ہے، بلکہ یون کہنا چاہئے کہ وہ اس کے بعد اپنے نئے اعمال کے لئے نئے سرے سے پیدا ہوتا ہے، اسی لئے سرورِ کائنات علیہ الصلوات نے یہ فرمایا،

من حجّ للّٰہ فلم یرفث ولم   جس نے خدا کے لئے حج کیا، اور اس

يفسق رجع كيوم ولدته امه،

مین ہوس رانی نہ کی، اور نہ گناہ کیا، تو وہ ایسا ہو کر لوٹتا ہے، جیسے اس دن تھا،

یعنی ایک نئی زندگی، ایک نئی حیات، اور ایک نیا دور شروع کرتا ہے، جس مین دین اور دنیا دونون کی بھلائیان جمع اور دونون کی کامیابیان شامل ہونگی، یہ فلسفہ خود قرآنِ پاک کی ان آیتون کا خلاصہ ہے، جو حج کے باب مین ہین، اور جن کی آخری آیتین، طواف کی دعا کا آخری ٹکڑہ ہین،

ثُمَّ اَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ، فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُولُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ، وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُولُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ، اُولٰٓئِكَ لَهُمْ

پھر طواف کے لئے وہین سے چلو جہان سے لوگ چلے، اور خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگو، بیشک خدا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے، اور جب حج کے تمام ارکان ادا کر چکو تو اللہ کو اس طرح یاد کرو، جس طرح اپنے باپ دادون کو یاد کرتے ہو، یا اُن سے بھی زیادہ، تو بعض لوگ (حج کی دعا مین) کہتے ہین، اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا مین دے، اور ایسون کیلئے آخرت مین کوئی حصہ نہین، اور بعض وہ

---

[1] سنن ابی داؤد کے علاوہ بقیہ تمام کتبِ صحاح کی کتاب الحج میں یہ حدیث موجود ہے،

نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ،

(بقرہ ۲ - ۲۵)

(ترجمہ) اور بعض ایسے ہین، جو کہتے ہین کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا مین بھلائی دے اور آخرت مین بھی بھلائی دے، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، یہ وہ ہین جنکو اپنی کمائی کا حصہ ملیگا، اور اللہ تمھارے اعمال کا تم سے

حج کے بعض اور چھوٹے چھوٹے اخلاقی مصالح بھی ہین، مثلاً

۱۔ حج کے ذریعہ سے انسان اپنی تمام ذمہ داریون کا احساس کرسکتا ہے، حج اس وقت فرض ہوتا ہے جب اہل وعیال کے نفقہ سے کچھ رقم بچتی ہے، اس لئے آدمی حج کے لئے اس وقت نکلتا ہے، جب اہل وعیال کی ضرورتون کا سامان کرلیتا ہے، اس لئے اس کو اہل وعیال کے مصارف کی ذمہ داریان خودبخود محسوس ہوجاتی ہین، معاملات مین قرض انسان کے سر کا بوجھ ہے، اور حج وہی شخص اداکرسکتا ہے جو اس سے سبکدوش ہوجائے، اس لئے معاملات پر اس کا نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے،

عام طرز معاشرت اور دنیوی کامون مین آدمی اپنے سیکڑون دشمن پیدا کرلیتا ہے، لیکن جب خدا کی بارگاہ مین جانے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے بری الذمہ ہوکے جانا چاہتا ہے، اس لئے اس رخصت کے وقت ہر قسم کے بغض وحسد سے اپنے دل کو صاف کرلیتا ہے، لوگون سے اپنے قصور معاف کراتا ہے، روٹھون کو مناتا ہے، قرض خواہون کے قرض اداکرتا ہے، اس لحاظ سے حج معاشرتی، اخلاقی اور روحانی اصلاح کا بھی ایک ذریعہ ہے،

۲- اسلام آج ہر ملک مین ہے، اس لئے ہر ملک کی زبان اس کی زبان ہے، تاہم اس کی ایک عمومی زبان بھی ہے، جو اس ملک کی زبان ہے، جہان دنیا کے ہر ملک سے مسلمان آتے جاتے رہتے ہین، اور اس زبان کے بولنے اور سیکھنے پر اس سفر مین کچھ نہ کچھ مجبور ہوتے ہین اسکا اثر یہ ہے کہ ہر مسلمان قوم جو کوئی بھی بولی بولتی ہو، وہ اُس ملک کی زبان سے اور زبان سے نہ سہی تو الفاظ سے آشنا ہوتی ہے، اور یہ اسلام کی عالمگیر اخوت کی ایک مضبوط کڑی ہے،

۳- مساوات اسلام کا سنگِ بنیاد ہے، اگرچہ نماز بھی محدود طریقہ پر اس مساوات کو قائم کرتی ہے لیکن پوری وسعت کے ساتھ اس کی اصلی نمایش حج کے زمانہ مین ہوتی ہے، جب امیر و غریب، جاہل و عالم، بادشاہ و رعایا، ایک لباس مین، ایک صورت مین ایک میدان مین ایک ہی طرح خدا کے سامنے کھڑے ہوجاتے ہین، نہ کسی کے لئے جگہ کی خصوصیت ہوتی ہے نہ آگے پیچھے کی قید،

۴- بہت سی اخلاقی خوبیون کا سرچشمہ کسبِ حلال ہے، چونکہ ہر شخص حج کے مصارف مین مالِ حلال صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے خود حلال و حرام کی تفریق کرنی پڑتی ہے، اور اس کا جو اثر انسان کی روحانی حالت پر پڑسکتا ہے وہ ظاہر ہے،

الغرض حج اسلام کا صرف مذہبی رکن نہین، بلکہ وہ اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی یعنی قومی و ملی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو پر حاوی اور مسلمانون کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے،

جہاد

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (حج - ۱۰)

عام طور سے اسلام کے سلسلۂ عبادات مین جہاد کا نام فقہار کی تحریرون مین نہین آتا، مگر قرآن پاک اور احادیثِ نبوی مین اس کی فرضیت اور اہمیت بہت سے دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدرجہا زیادہ ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اس فریضۂ عبادت کو اپنے موقع پر جگہ دیجائے اور اس کی حقیقت پر ناواقفیت کے جو تو بر تو پردے پڑ گئے ہین اُن کو اٹھایا جائے،

"جہاد" کے معنی عموماً قتال، اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہین، مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے، "جہاد" کا لفظ "جہد" سے نکلا ہے، جہاد اور مجاہدہ، فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہین، اور لغت مین اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہین، اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنی بھی ہین یعنی حق کی بلندی، اور اس کی اشاعت اور حفاظت کے لئے ہر قسم کی جد و جہد، قربانی، اور ایثار گوارا کرنا، اور ان تمام جسمانی و مالی و دماغی قوتون کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندون کو ملی ہین، اس راہ مین صرف کرنا، یہانتک کہ اس کے لئے اپنی، اپنے عزیز و قریب کی اہل و عیال کی، خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا، اور حق کے مخالفون اور دشمنون کی کوششون

کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رائگان کرنا، ان کے حملوں کو روکنا، اور اس کے لئے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے، تو اس کے لئے بھی پوری طرح تیار رہنا ہی جہاد ہے، اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے،

افسوس ہے کہ مخالفوں نے اتنے اہم اور اتنے ضروری اور اتنے وسیع مفہوم کو جس کے بغیر دنیا میں کوئی تحریک نہ کبھی سرسبز ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے، صرف "دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ" کے تنگ میدان میں محصور کر دیا ہے، یہ بات بار بار کہی اور دکھائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس تعلیم اور شریعت کو لے کر دنیا میں آئے، وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہیں، بلکہ عمل اور سرتاپا عمل ہے، آپ کے مذہب میں نجات کا استحقاق، گوشہ گیری، رہبانیت، نظری مراقبہ، دھیان اور الٰہیات کی فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہیں، بلکہ خدا کی توحید، رسولوں اور کتابوں اور فرشتوں کی سچائی، قیامت اور جزا وسزا کے اعتقاد کے بعد ان ہی کے مطابق عملِ خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے، اسی لئے قرآن پاک میں "جہاد" کا مقابل لفظ "قعود" (بیٹھنا یا بیٹھ رہنا) استعمال کیا گیا ہے، جس سے مقصود سستی، تغافل اور ترکِ فرض ہے، سورۂ نساء میں ہے،

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ	"مسلمانوں میں سے وہ جن کو کوئی جسمانی
الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ	معذوری نہ ہو، اور پھر بیٹھے رہیں، اور
وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ	وہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان و مال
بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ	سے جہاد کر رہے ہوں، برابر نہیں، اللہ
اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ	نے اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں

وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً ط وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ط وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۔ (نسا - ۱۳)

کو بیٹھنے والون پر درجہ کی فضیلت عطا کی ہے، اور ہر ایک سے خدا نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے، اور جہاد کرنے والون کو بیٹھنے والون پر بڑے اجر سے فضیلت بخشی ہے

اس "بیٹھنے" اور "جہاد" کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے، کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے سستی کرنے اور آرام ڈھونڈھنے کے سراسر خلاف ہے،

یہان ایک شبہہ کا ازالہ کرنا ضروری ہے، اکثر لوگ یہ سمجھتے ہین کہ "جہاد" اور "قتال" دونون ہم معنی ہین، حالانکہ ایسا نہین ہے، قرآن پاک مین دونون لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہین، اس لئے "جہاد فی سبیل اللہ" (خدا کی راہ مین جہاد کرنا) اور "قتال فی سبیل اللہ" (خدا کی راہ مین لڑنا) ان دونون لفظون کے ایک معنی نہین ہین، بلکہ ان دونون مین عام وخاص کی نسبت ہے، یعنی ہر "جہاد" قتال نہین ہے، بلکہ جہاد کی مختلف قسمون مین سے ایک قتال اور دشمنون سے لڑنا بھی ہے، اسی لئے قرآن پاک مین ان دونون لفظون کے استعمال مین ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے چنانچہ اسی سورۂ نساء کی اوپر کی آیت مین اور دوسری آیتون مین جہاد کی دو صریح قسمین بیان کی گئی ہین، جہاد بالنفس اور جہاد بالمال، یعنی اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کرنا، جان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت کے لئے ہر قسم کی جسمانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے، یہانتک کہ اپنی جان تک کو جوکھون مین ڈال دینے آگ مین جلائے جانے سولی پر لٹکائے جانے، تیر او نیزے مین چھد جانے، اور تلوار سے کٹ جانے کے لئے ہر وقت

آمادہ اور مستعد رہے، مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو کامیاب اور سربلند کرنے کے لئے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لیے تیار رہے، اسی جان اور مال کی باطل محبت شخص اور قوم دونوں کی ترقی و سعادت کی راہ مین رکاوٹ ہے؛ اگر یہ دونون بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائین تو ہم کامل موحد ہو جائین، اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہین سکتی، جسمانی و روحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے، اس کے سوا کچھ اور نہین،

ترقی و سعادت کا یہ گر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا اور آپ ہی نے یہ نکتہ اپنی امت کو سکھایا، اسی جہاد کا جذبہ اور اسی کے حصول ثواب کی آرزو تھی جس کے سبب سے کہ مسلمانون نے تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفون کا بہادرانہ مقابلہ کیا، ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری سل، طوق و زنجیر کی گرانباری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت، نیزہ کی انی، تلوار کی دھار، بال بچون سے علحدگی، مال و دولت سے دست برداری، اور گھر بار سے دوری کوئی چیز بھی ان کے استقلال کے قدم کو ڈگمگا نہ سکی، اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ مین انھون نے تلوار کی چھاؤن مین جس طرح گذارے وہ دنیا کو معلوم ہے،

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا	مومن وہی ہین جو اللہ اور اس کے رسول
بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا	پر ایمان لائے، اور پھر اس مین وہ ڈگمگائے
وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ	نہین، اور خدا کے راستہ مین اپنی جان
فِي سَبِيلِ اللَّهِ، أُولَئِكَ	سے اور اپنے مال سے جہاد کیا، یہی سچے

هُمُ الصّٰدِقُوْنَ، (حجرات-۲) — اترنے والے لوگ ہین،

فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا — پھر جنھون نے اپنا گھر بار چھوڑا، اور اپنے

مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ — گھرون سے نکالے گئے، اور میری راہ

وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ — مین ستائے گئے، اور لڑے اور مارے

سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ — گئے ہین اُنکے گناہوں کو اُن سے اتار دونگا

جَنّٰتٍ، الآیہ (آل عمران-۲۰) — اور ان کو بہشت مین داخل کرونگا،

جہاد کی قسمین ۱- جب جہاد کے معنی محنت، سعی بلیغ، اور جد وجہد کے ہین تو ہر نیک کام اس کے تحت مین داخل ہوسکتا ہے، علماے دل کی اصطلاح مین "جہاد" کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کیساتھ جہاد کرنا ہے، اور اسی کا نام اُن کے ہان "جہادِ اکبر" ہے، خطیب نے تاریخ مین حضرت جابرؓ صحابی سے روایت کی ہے، کہ آپنے اُن صحابہ سے جو ابھی ابھی لڑائی کے میدان سے واپس آئے تھے، فرمایا "تمھارا آنا مبارک، تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو، کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہواے نفس سے لڑنا ہے" [1] حدیث کی دوسری کتابون مین اس قسم کی اور بعض روایتین بھی ہین، چنانچہ ابن نجار نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کی ہے کہ آپنے فرمایا کہ "بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرے" یہی روایت دیلمی مین ان الفاظ مین ہے کہ "بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کیلئے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو" یہ تینون روایتین گو فن کے لحاظ سے چندان مستند نہین ہین مگر یہ درحقیقت بعض صحیح حدیثون کی تائید اور قرآنِ پاک کی اس آیت کی تفسیر ہین،

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا — اور جنھون نے ہمارے بارہ مین جہاد

[1] بحوالہ کنز العمال کتاب الجہاد ج ۲ ص ۲۰۵ حیدر آباد دکن،

لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ، (عنکبوت-۷)

کیا، (یعنی محنت اور تکلیف اٹھائی) ہم انکو اپنا راستہ آپ دکھائینگے اور بیشبہ خدا نیکو کارون کے ساتھ ہے

اس پورے سورہ مین اللہ تعالی نے مسلمانون کو حق کے لئے ہر مصیبت و تکلیف مین ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے، اور اگلے پیغمبرون کے کارنامون کو ذکر کیا ہے کہ وہ ان مشکلات مین کیسے ثابت قدم رہے، اور بالآخر خدا نے ان کو کامیاب اور ان کے دشمنون کو ہلاک کیا، سورہ کے آغاز مین ہے،

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ، (عنکبوت-۱)

اور جو کوئی جہاد کرتا ہے (یعنی محنت اٹھاتا ہے) وہ اپنے ہی نفس کے لئے جہاد کرتا ہے، اللہ تو جہان والون سے بے نیاز ہے،

اور سورہ کے آخر مین فرمایا کہ "ہمارے کام مین یا خود ہماری ذات کے حصول مین، یا ہماری خوشنودی کی طلب مین جو جہاد کرے گا اور محنت اٹھائے گا ہم اس کیلئے اپنے تک پہنچنے کا راستہ آپ صاف کر دینگے، اور اس کو اپنی راہ آپ دکھائین گے" یہی مجاہدہ، کامیابی کا زینہ اور روحانی ترقیون کا وسیلہ ہے سورۂ حج مین ارشاد ہوا،

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ

اور محنت کرو اللہ مین پوری محنت، اس نے تم کو چنا ہے، اور تمہارے دین مین تم پر کوئی تنگی نہین کی تمہارے

یہ "اللہ میں محنت اور جہاد کرنا" وہی جہادِ اکبر ہے، جس پر ملتِ ابراہیمی کی بنا ہے، یعنی حق کی راہ میں عیش و آرام، اہل و عیال، اور جان و مال ہر چیز کو قربان کر دینا، ترمذی، طبرانی، حاکم اور صحیح ابن حبان میں ہے[1] کہ آنحضرت صلعم نے صحابہ سے فرمایا کہ "المجاھد من جاھد نفسہ" یعنی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے" صحیح مسلم میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے صحابہ سے پوچھا کہ "تم پہلوان کس کو کہتے ہو؟" عرض کیا "جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں" فرمایا "نہیں پہلوان وہ ہے، جو غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے"[2] یعنی جو اُس پہلوان کو پچھاڑ سکے، اور اُس حریف کو زیر کر سکے جس کا اکھاڑہ خود اس کے سینہ میں ہے،

۲- جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالعلم ہے، دنیا کا تمام شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے اس کا دور کرنا ہر حق طلب کے لئے ضروری ہے، ایک انسان کے پاس اگر عقل و معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے، تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے تاریک دلوں کو فائدہ پہنچائے، تلوار کی دلیل سے قلب میں وہ طمانیت نہیں پیدا ہو سکتی جو دلیل و برہان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتی ہے، اسی لئے ارشاد ہوا کہ

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ	تو لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستہ کی
وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡھُمۡ	طرف آنے کا بلاوا حکمت و دانائی کی باتوں
بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ، (نحل - ۱۶)	کے ذریعہ سے اور اچھی طرح سمجھا کر دے

[1] بحوالہ کنز العمال کتاب الایمان جلد اص ۳۹، [2] صحیح مسلم باب من یملک نفسہ عند الغضب جلد ۲ ص ۳۹۶، مصر،

دین کی یہ تبلیغ و دعوت بھی جو سراسر علمی طریق سے ہے، جہاد کی ایک قسم ہے، اور اسی طریقہ دعوت کا نام "جہاد بالقرآن" ہے، کہ قرآن خود اپنی آپ دلیل، اپنی آپ موعظت، اور اپنے لئے آپ مناظرہ ہے، قرآن کے ایک سچے عالم کو قرآن کی صداقت اور سچائی کے لئے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روحانی جہاد یعنی روحانی بیماریوں کی فوجوں کو شکست دینے کے لئے اسی قرآن کی تلوار ہاتھ میں دی گئی اور اسی سے کفار و منافقین کے شکوک و شبہات کے پرون کو ہزیمت دینے کا حکم دیا گیا، ارشاد ہوا،

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ	تو کافرون کا کہنا مان، اور بذریعہ
بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا، (فرقان - ۵)	قرآن کے تو ان سے جہاد کر، بڑا جہاد

بذریعہ قرآن کے جہاد کر یعنی قرآن کے ذریعہ سے تو ان کا مقابلہ کر، اس قرآنی جہاد و مقابلہ کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کبیر "بڑا جہاد" اور بڑے زور کا مقابلہ فرمایا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اس جہاد بالعلم کی اہمیت قرآن کی نظر میں کتنی ہے، علما نے بھی اس اہمیت کو محسوس کیا ہے، اور اس کو جہاد کا عظیم الشان درجہ قرار دیا ہے، امام ابوبکر رازی حنفی نے احکام القرآن میں اس پر لطیف بحث کی ہے، اور لکھا ہے کہ جہاد بالعلم کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونون سے بڑھ کر ہے[1]، ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ حق کی حمایت اور دین کی نصرت کے لئے عقل، فہم، علم اور بصیرت حاصل کرے اور اُن کو اس راہ میں صرف کرے، اور وہ تمام علوم جو اس راہ میں کام آسکتے ہوں انکو اس لئے حاصل کرے کہ اُن سے حق کی اشاعت اور دین کی مدافعت کا فریضہ انجام پائے گا،

[1] احکام القرآن رازی قسطنطنیہ جلد ۳ ص ۱۱۹،

علم کا جہاد ہے، جو اہلِ علم پر فرض ہے،

۳- جہاد بالمال،

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت عطا کی ہے اس کا منشا بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستوں مین خرچ کیا جائے، یہانتک کہ اس کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے آرام و آسایش کے لئے بھی خرچ کیا جائے، تو اسی کی مرضی کیلئے، دنیا کا ہر کام روپیہ کا محتاج ہے، چنانچہ حق کی حمایت اور نصرت کے کام بھی اکثر روپیے پر موقوف ہین، اس لیے اس جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہین ہے، دوسری اجتماعی تحریکون کی طرح اسلام کو بھی اپنی قسم کی تحریکات اور جدّوجہد مین سرمایہ کی ضرورت ہے، اس سرمایہ کا فراہم کرنا اور اس کے لئے مسلمانون کا اپنے اوپر ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وصحبت کی برکت سے صحابۂ کرام نے اپنی عام غربت اور ناداری کے باوجود اسلام کی سخت سی سخت گھڑیون مین جس طرح مالی جہاد کیا ہے، وہ اسلام کی تاریخ کے روشن کارنامے ہین، اور ان ہی سیرابیون سے دینِ حق کا باغ چمن آرائے نبوت کے ہاتھون سرسبز و شاداب ہوا، اور اسی لئے اسلام مین ان بزرگون کا بہت بڑا رتبہ ہے،

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ، (انفال-۱۰)	بے شک وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال اور جان سے جہاد کیا،

قرآن پاک مین مالی جہاد کی تنبیہ و تاکید کے متعلق بکثرت آیتین ہین، بلکہ یہ مشکل کہین جہاد کا

حکم ہوگا، جہاں اس جہاد بالمال کا ذکر نہ ہو، اور قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو تقدم بخشا گیا ہے، جیسے،

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا	ہلکے یا بھاری ہو کر جس طرح ہو نکلو،
بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اور اپنے مال اور اپنی جان سے
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ	خدا کے راستے میں جہاد کرو، یہ تمہارے
تَعْلَمُوْنَ ، (توبہ-۶)	لئے بہتر ہے، اگر تم کو معلوم ہو،
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ	مومن وہی ہیں، جو اللہ اور رسول پر
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ	ایمان لائے، پھر اس میں شک نہیں
لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا	کیا، اور اپنے مال اور اپنی جان سے
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ	خدا کے راستہ میں جہاد کیا، یہی
سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ	سچے اترنے والے ہیں،
فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ	اپنے مال اور نفس سے جہاد کرنے والوں
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى	کو اللہ نے بیٹھ رہنے والوں پر ایک
الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً ، (نساء ۱۳)	درجہ کی فضیلت دی ہے،

(حجرات-۲)

اس تقدم کے کئی اسباب اور مصلحتیں ہیں،

میدانِ جنگ میں ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کے لئے ممکن نہیں، لیکن مالی شرکت ہر ایک کے لئے آسان ہے،

جسمانی جہاد یعنی لڑائی کی ضرورت ہر وقت نہیں پیش آتی ہے، لیکن مالی جہاد کی ضرورت ہر وقت اور ہر آن ہوتی ہے،

انسانی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت، اُس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آجاتی ہے،

گر جان طلبی مضائقہ نیست — گر زر طلبی سخن درین است

اس لئے مال کو جان پر مقدم رکھکر ہر قدم پر انسان کو اس کی اس کمزوری پر ہشیار کیا گیا ہے،

۴۔ جہاد کے ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادا مین اپنی جان ومال اور دماغ کی قوت صرف کرنے کا نام بھی اسلام مین جہاد ہے، عورتین حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین آکر عرض کرتی ہین کہ یا رسول اللہ! ہم کو غزوات کے جہاد مین شرکت کی اجازت دیجائے، ارشاد ہوا کہ تمھارا جہاد نیک حج ہے[1] کہ اس مقدس سفر کے لئے سفر کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرنا، صنف نازک کا ایک جہاد ہی ہے، اسی طرح ایک صحابی مین سے چل کر خدمتِ اقدس مین اس غرض سے حاضر ہوتے ہین کہ کسی لڑائی کے جہاد مین شرکت کرین آپ نے اُن سے دریافت فرمایا کہ کیا تمھارے ماں باپ ہین، عرض کی جی ہان فرمایا "ففیہما فجاھد" تو تم اُن ہی کی خدمت مین جہاد کرو[2] یعنی ماں باپ کی خدمت کرنا بھی جہاد ہے، اسی طرح خطرناک سے خطرناک موقع پر حق کے اظہار مین بیباک ہونا بھی جہاد ہے آپ نے فرمایا

ان من اعظم الجهاد كلمة عدلٍ	ایک بڑا جہاد کسی ظالم قوت کے سامنے
عند سلطانٍ جائرٍ (ترمذی، ابواب الفتن)	انصاف کی بات کہدینا ہے،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد، [2] ابوداؤد و ترمذی کتاب الجہاد،

۵۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جہاد بالنفس، یعنی اپنے جسم و جان سے جہاد کرنا جہاد کے اُن تمام اقسام کو شامل ہے جن مین انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو، اور اس کی آخری حد خطرات سے بے پروا ہو کر اپنی زندگی کو بھی خدا کی راہ مین نثار کر دینا ہے، نیز دین کے دشمنون سے اگر مقابلہ آپڑے اور وہ حق کی مخالفت پر تل جائین تو اُن کو راستہ سے ہٹانا، اور اس صورت مین اُنکی جان لینا یا اپنی جان دینا جہاد بالنفس کا انتہائی جذبہ کمال ہے، ایسے جان نثار اور جانباز بندے کا انجام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیز ترین متاع کو خدا کی راہ مین قربان کیا، وہ ہمیشہ کے لئے اس کو بخشدیجائے، یعنی فانی حیات کے بدلہ اس کو ابدی حیات عطا کر دیجائے، اسی لئے ارشاد ہوا

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ	جو خدا کی راہ مین مارے گئے، اُن
سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ	کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہین لیکن
وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ، (بقرہ۔۱۹)	تم کو اس کا احساس نہین،

آل عمران مین ان جانبازون کی قدر افزائی ان الفاظ مین کی گئی ہے،

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا	جو خدا کی راہ مین مارے گئے ان کو
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ	مردہ گمان نہ کرو، بلکہ وہ زندہ ہین
اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ يُرْزَقُوْنَ	اپنے پروردگار کے پاس اُن کو روزی
فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ	دی جا رہی ہے، خدا نے اُن کو اپنی
فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ	جو مہربانی عطا کی ہے، اس پر وہ خوش
لَمْ يَلْحَقُوْا بِھِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ	ہین، اور جو آج تک اُن سے اس

اَلَّا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ	زندگی مین ہونے کی وجہ سے نہین ملے
يَحۡزَنُوۡنَ	ہین، اُن کو خوشخبری دیتے ہین کہ انکو
(آل عمران - ۱۷)	نہ کوئی خوف ہے، نہ وہ غم مین ہین،

ان جان نثارون کا نام شریعت کی اصطلاح مین "شہید" ہے، یہ عشق و محبت کی راہ کے شہید زندہ جاوید ہین،

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق	ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

یہ اپنے اسی خونی گلگون پیراہن مین قیامت کے دن اٹھین گے، اور حق کی جو عملی شہادت اس زندگی مین انھون نے ادا کی تھی، اس کا صلہ اس زندگی مین پائین گے، وَلِيَعۡلَمَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَيَتَّخِذَ مِنۡكُمۡ شُهَدَآءَ، (آل عمران - ۱۴) اسی کے ساتھ وہ جانباز بھی جو گو اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان مین اترے تھے، لیکن اُن کے سر کا ہدیہ دربارِ الٰہی مین اس وقت اس لئے قبول نہ ہوا، کہ ابھی ان کی دنیاوی زندگی کا کارخانہ ختم نہین ہوا تھا، وہ بھی اپنے حسنِ نیت کے بدولت رضاے الٰہی کی سند پائین گے، اسی لئے ان کو عام مسلمان ادب و تعظیم کے لئے "غازی" کے لقب سے یاد کرتے ہین،

وَمَنۡ يُّقَاتِلۡ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ	اور جو خدا کی راہ مین لڑتا ہے، پھر وہ
فَيُقۡتَلۡ اَوۡ يَغۡلِبۡ فَسَوۡفَ نُؤۡتِيۡهِ	یا مارا جاتا ہے یا وہ غالب آتا ہے، تو ہم
اَجۡرًا عَظِيۡمًا، (نساء - ۱۰)	اس کو بڑا بدلہ عنایت کرینگے،
فَالَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا وَاُخۡرِجُوۡا	تو جنھون نے میری خاطر گھر بار چھوڑا

صحیح مسلم کتاب الامارۃ

مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي	اور اپنے گھرون سے نکالے گئے، اور ان
وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ	کو میری راہ مین تکلیفین دی گیئن، اور
سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ	وہ لڑے اور مارے گیے، ہم اُن کے
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا	گناہون کو چھپا دینگے، اور اُن کو جنت
مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَهُ	مین داخل کرینگے، جس کے نیچے نہرین
حُسْنُ الثَّوَابِ،	بہتی ہونگی، خدا کی طرف سے اُن کو یہ
(آل عمران - ۲۰)	بدلہ ملیگا، اور خدا کے پاس اچھا بدلہ ہے،

ان آیات کی تفسیر و تشریح مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ احادیث مین مذکور ہے، جس مین شہیدون کی فضیلتین، اور اُن کی اُخروی نعمتون کی تفصیل نہایت مؤثر الفاظ مین ہے، اسی شہادت اور غزا کے عقیدے نے مسلمانون مین مشکلات کے مقابلہ اور دشمنون سے بے خوفی کی وہ روح پیدا کردی جس کی زندگی اور تازگی کا ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی وہی عالم ہے، یہی وہ جذبہ ہے جو مسلمانون کو دین کی خاطر جان دینے پر اس قدر جلد آمادہ کر دیتا ہے، اور اس حیاتِ جاوید کی تلاش مین ہر مسلمان بیتاب نظر آتا ہے، یہ وہ رتبہ ہے جس کی تمنا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر کی، اور فرمایا کہ "مجھے آرزو ہے کہ مین خدا کی راہ مین مارا جاؤن، اور دوبارہ مجھے زندگی ملے، اور مین اس کو بھی قربان کر دون، اور پھر تیسری زندگی ملے، اور اس کو بھی مین خدا کی راہ مین نثار کر دون[1]" ذرا ان فقرون پر ایک بار اور نگاہ ڈال

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد،

لیجیے، ان مین یہ نہین ہے کہ مین دوسرے کو مار ڈالون، بلکہ یہ ہے کہ حق کے راستہ مین مین مارا جاؤن اور پھر زندگی ملے، پھر مارا جاؤن، پھر زندگی ملے اور پھر مارا جاؤن،

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را	ہر زمان از غیب جانِ دیگر است

دائمی جہاد — یہ تو وہ جہاد ہے جس کا موقع ہر مسلمان کو پیش نہین آتا، اور جس کو آتا بھی ہے تو عمر مین ایک آدھ ہی دفعہ آتا ہے، مگر حق کی راہ مین دائمی جہاد وہ جہاد ہے جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آسکتا ہے، اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر امتی پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبون کی مدد، زیردستون کی امداد، سیہ کارون کی ہدایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامتِ عدل، ردِّ ظلم، اور احکامِ الٰہی کی تعمیل مین ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے، یہانتک کہ اس کی زندگی کی ہر جنبش و سکون، ایک جہاد بنجائے، اور اسکی پوری زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئے، سورۂ آلِ عمران کی جس مین جہاد کے مسلسل احکام ہین آخری آیت ہے،

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (آل عمران - ۲۰۰)	اے ایمان والو! مشکلات مین ثابت قدم رہو، اور مقابلہ مین مضبوطی دکھاؤ، اور کام مین لگے رہو، اور خدا سے ڈرو تاکہ تم مراد کو پہنچو،

یہی وہ جہادِ محمدی ہے، جو مسلمانون کی کامیابی کی کنجی اور فتح و فیروزی کا نشان ہے،

عباداتِ قلبی

یہ اسلام کے اُن عبادات کا بیان تھا، جو جسمانی و مالی کہلاتی ہین، گوکہ دل کے اخلاص کا شمول ان مین بھی ہے، لیکن اسلام مین بعض ایسی عبادات بھی ہین، جنکا تعلق تمامتر قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتون سے ہی، پہلے معلوم ہوچکا ہی، کہ اسلام مین ہر نیکی کا کام عبادت ہے اس لئے تمام امورِ خیر خواہ وہ جسمانی یا مالی یا قلبی ہون عبادات کے اندر داخل ہین، فقہا نے صرف جسمانی و مالی عبادات سے بحث کی ہی لیکن حضرات صوفیہ نے جسمانی و مالی عبادات کیساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کرلیا ہی، اصل یہ ہی کہ فقہاء نے اپنا فرضِ منصب صرف جسمانی اور مالی فریضون تک محدود رکھا ہے، اور صوفیہ نے اُن سارے فریضون کو یکجا کیا ہے، جن سے اسلام نے انسان کے قلب و روح کی درستی کا کام لیا ہے، پیشِ نظر تصنیف نہ تو فقہ کی کوئی کتاب ہی اور نہ تصوف کی، اس کا مقصود اُن فرائض کو بتانا ہے جن کی تاکید و توصیف قرآنِ پاک نے بار بار کی ہے، اور اسی تاکید و توصیف سے ہم کو اسلام مین ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے،

اس قسم کے چند فرائض جنکا مرتبہ عباداتِ پنجگانہ کے بعد قرآنِ پاک مین سب سے زیادہ

نظر آتا ہے، تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر اور شکر ہیں، یہ وہ فرائض ہیں، جنکا تعلق انسان کے قلب سے ہے، اور اسی لئے ان کا نام "قلبی عبادات" رکھا جاسکتا ہے، یہ وہ فرائض یا قلبی عبادات ہیں جو اسلام کی روح اور ہمارے تمام اعمال کا اصلی جوہر ہیں جن کے الگ کر دینے سے وہ عبادات بیجگانہ بھی جنپر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے، جسد بے روح بنجاتے ہیں، یہ بات گو یہاں بے محل ہے، مگر کہنے کے قابل ہے، کہ فقہ اور تصوف کی ایک دوسرے سے علٰحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک شے بے روح اور دوسری طرف اعمالِ تصوف کو آزاد اور بے قید کر دیا ہے،

ہر اچھے کام کے کرنے، اور برائی سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل میں خیر و شر کی تمیز کے لئے خلش ہو، یہ **تقویٰ** ہے، پھر اس کام کو خدائے واحد کی رضامندی کے سوا ہر غرض و غایت سے پاک رکھا جائے، یہ **اخلاص** ہے، پھر اُس کام کے کرنے میں صرف خدا کی نصرت پر بھروسہ ہے، یہ **توکل** ہے، اُس کام میں رکاوٹیں اور دقتیں پیش آئیں، یا نتیجہ مناسبِ حال برآمد نہ ہو تو دل کو مضبوط رکھا جائے، اور خدا سے آس نہ توڑی جائے، اور اس راہ میں اپنے برا چاہنے والوں کا بھی برا نہ چاہا جائے، یہ **صبر** ہے، اور اگر کامیابی کی نعمت ملے تو اُس پر مغرور ہونے کے بجائے اس کو خدا کا فضل و کرم سمجھا جائے، اور جسم و جان و زبان سے اُسکا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور زیادہ انہماک صرف کیا جائے، یہ **شکر** ہے،

ذیل کی سطروں میں اسی اجمال کی تفصیل آتی ہے،

تقویٰ

تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے | اگر محمد رسول اللہ صلعم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک

لفظ مین کرنا چاہین تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہین، اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب مین اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے، قرآن پاک نے اپنی دوسری ہی سورہ مین یہ اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہین جو تقویٰ والے ہین،

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ، (بقرہ-۱) — یہ کتاب تقویٰ والون کو راہ دکھاتی ہے

اسلام کی ساری عبادتون کا منشا اسی تقویٰ کا حصول ہے،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، (بقرہ-۳) — اے لوگو اپنے اس پروردگار کی جس نے تم کو اور تمہارے پہلون کو پیدا کیا عبادت کرو، تا کہ تم تقویٰ پاؤ،

روزہ سے بھی یہی مقصد ہے،

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، (بقرہ ۲۳-۲۳) — تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگون پر فرض کیا گیا تھا، تا کہ تم تقویٰ حاصل کرو،

حج کا منشا بھی یہی ہے،

وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ، (حج-۴) — اور جو اللہ کے شعائر (حج کے ارکان ومقامات) کی عزت کرتا ہے، تو یہ دلون کے تقویٰ سے ہے،

قربانی بھی اسی غرض سے ہے،

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ، (حج - ۵)

خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، لیکن تمہارا تقویٰ اس کو پہنچتا ہے،

ایک مسلمان کی پیشانی جس جگہ خدا کے لئے جھکتی ہے، اس کی بنیاد بھی تقویٰ پر ہونی چاہیے،

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَہٗ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰہِ، (توبہ ۱۳)

جس نے اپنی عمارت خدا سے تقویٰ پر کھڑی کی،

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی (توبہ - ۱۳)

البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر قائم کی گئی،

حج کے سفر اور زندگی کے مرحلہ میں راستہ کا توشہ مال و دولت اور ساز و سامان سے زیادہ تقویٰ ہے،

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی، (بقرہ - ۲۵)

اور سفر میں زادِ راہ لے کر چلو، اور سب سے اچھا زادِ راہ تقویٰ ہے،

ہمارے زیب و زینت کا سامان ظاہری لباس سے بڑھ کر تقویٰ کا لباس ہے،

وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ (اعراف ۳)

اور تقویٰ کا لباس، وہ سب سے اچھا ہے

اسلام کا تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہے،

وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی، (بقرہ - ۳۱)

اور معاف کر دینا تقویٰ سے قریب تر ہے،

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (مائدہ۔۲)	انصاف کرنا تقوی سے قریب تر ہے
وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ	اور اگر صبر کرو، اور تقوی کرو، تو یہ بڑی ہمت
ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ، (آل عمران۔۱۹)	کی بات ہے،
وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ،	اور تقوی کرو، اور لوگون کے درمیان
(بقرہ۔۲۸)	صلح کراؤ،
وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ	اور اگر اچھے کام کرو، اور تقوی کرو، تو اللہ
اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا، (نساء۔۱۹)	تمھارے کامون سے خبردار ہے،

اہل تقوی تمام اخروی نعمتون کے مستحق ہیں آخرت کی ہر قسم کی نعمتین ان ہی تقوی والون کا حصہ ہے،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ،	بے شبہہ تقوی والے امن وامان کی
(دخان۔۳)	جگہ مین ہون گے،
اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ	بے شک تقوی والے باغون میں اور
(طور۔۱)	نعمت مین ہون گے،
اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ	شک نہین کہ تقوی والے باغون
عُيُوْنٍ، (ذاریات۔۱)	مین اور چشمون مین ہون گے،
اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ	بلاشبہہ تقوی والے باغون مین اور
نَهَرٍ، (قمر۔۱)	نہرون مین ہونگے،
اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّ	بلاشبہہ تقوی والے سایون مین

وَّعُیُوۡنٍ ، (مرسلات - ۱)	اور چشموں میں ہوں گے ،
اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ	یقیناً تقویٰ والوں کے لئے اُن کے پروردگار
جَنّٰتِ النَّعِیۡمِ ، (ن - ۲)	کے پاس نعمت کے باغ ہیں ،
اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ مَفَازًا ، (نباء - ۲)	بے شبہہ تقویٰ والوں کیلئے کامیابی ہے ،
اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ لَحُسۡنَ مَاٰبٍ ، (صٓ - ۴)	لاریب تقویٰ والوں کے لئے بازگشت کی اچھائی ہے ،

کامیابی اہل تقویٰ کے لئے ہے ، گو بظاہر ابتدا میں اہلِ تقویٰ کو کسی قدر مصیبتیں اور بلائیں پیش آئیں ، یا بہت سی حرام اور مشتبہ لیکن بظاہر بہت سی عمدہ چیزوں سے محروم ہونا پڑے ، ظاہری کامیابی کی بہت سی ناجائز کوششوں اور ناروا راستوں سے پرہیز کرنا پڑے ، اور اس سے یہ سمجھا جائے کہ اُن کو مال و دولت ، عزت و شہرت اور جاہ و منصب سے محرومی رہی ، لیکن دنیا کے تنگ نظر صرف فوری اور عاجل کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں ، اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسی دنیا کے ظاہری ثمروں کی بنا پر کام کے اچھے برے نتیجوں کا فیصلہ کر لینا چاہیے ، حالانکہ جو جتنا دوربین ہے ، اسی قدر وہ اپنے کام کے فوری نہیں بلکہ آخری نتیجہ پر نگاہ رکھتا ہے ، حقیقی دوربین اور عاقبت اندیش وہ ہیں ، جو کام کی اچھائی برائی کا فیصلہ دنیا کے ظاہری چند روزہ اور فوری فائدہ کے لحاظ سے نہیں ، بلکہ آخرت کے دائمی اور دیرپا فائدہ کی بنا پر کرتے ہیں ، اور جب ان کی نظر آخرت کے ثمروں پر رہتی ہے ، تو دنیا بھی اُن کی بنجاتی ہے ، اور یہاں اور وہاں دونوں جگہ کامیابی اور فوز و فلاح اُن ہی کی قسمت میں ہوتی ہے ، فرمایا ،

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، (اعراف ۱۵)	اور آخری انجام تقویٰ والون کیلئے ہے
اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ، (ھود ۴)	بے شبہہ انجام کار تقویٰ والون کیلئے ہے
وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ، (زخرف ۳)	اور آخرت تیرے پروردگار کے نزدیک تقویٰ والون کے لئے ہے،
وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (طٰہٰ ۸)	اور انجام کار تقویٰ کے لئے ہے،

اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہین یہی متقی اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے سزاوار ہین جب وہ ہر کام مین خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہین، اور اپنے کسی کام کا بدلہ کسی انسان سے تعریف، یا انعام یا ہردلعزیزی کی صورت مین نہین چاہتے، تو اللہ تعالیٰ اُن کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے، اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندون مین بھی اُن کے ساتھ عقیدت، محبت اور ہردلعزیزی پیدا ہوتی ہے،

اِنْ اَوْلِيَاۤؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ، (انفال)	تقویٰ والے ہی خدا کے دوست ہین
فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ، (آل عمران)	تو اللہ بے شک تقویٰ والون کو پیار کرتا ہے،
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ، (توبہ ۱)	اللہ بلاشبہہ تقویٰ والون کو پیار کرتا ہے
وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ، (جاثیہ ۲)	اور اللہ تقویٰ والون کا دوست ہے

معیتِ الٰہی سے سرفراز ہین یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معیت کے شرف سے ممتاز اور اس کی نصرت و مدد سے سرفراز ہوتے ہین، اور جس کے ساتھ اللہ ہو اس کو کون شکست دے سکتا ہے،

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ	اور جان لو کہ بے شبہ اللہ تقویٰ والوں
(بقرہ-۲۴)	کے ساتھ ہے،
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ	اور یقین مانو کہ لاریب اللہ تقویٰ
(توبہ-۱۶-۵)	والوں کے ساتھ ہے،

قبولیت اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے، ایک کام ہزاروں اغراض اور سیکڑوں مقاصد کو سامنے رکھکر کیا جا سکتا ہے، مگر ان میں اللہ تعالیٰ صرف اُن ہی کے کاموں کی پیشکش کو قبول فرماتا ہے، جو تقویٰ کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے ہیں، فرمایا،

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ	اللہ تو تقویٰ والوں ہی سے قبول
(مائدہ-۵)	فرماتا ہے،

اسی لئے اُن ہی کے کاموں کو دنیا میں بھی بقا، قیام اور ہر دلعزیزی نصیب ہوتی ہے اور آخرت میں بھی،

تقویٰ والے کون ہیں یہ جان لینے کے بعد کہ تقویٰ ہی اسلام کی تعلیم کی اصلی غایت، اور وہی سارے اسلامی تعلیمات کی رُوح ہے، اور دین و دنیا کی تمام نعمتیں اہلِ تقویٰ ہی کے لئے ہیں، یہ جاننا ہے کہ تقویٰ والے کون ہیں، قرآن پاک نے اس سوال کا بھی جواب دیدیا ہے، چنانچہ اس کا مختصر جواب تو وہ ہے، جو سورۂ زمر میں ہے،

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ	اور جو سچائی لے کر آیا، اور اس کو سچ مانا
صَدَّقَ بِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ	وہی لوگ ہیں تقویٰ والے، ان کیلئے

الْمُتَّقُوْنَ، لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ جَزٰٓٓؤُا | ان کے رب کے پاس وہ ہے جو وہ چاہین، یہ ہے بدلہ نیکی والون کا،

یعنی تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ اور کام کے ہر پہلو مین سچائی سے آگہ آئے اور اس ابدی سچائی کو سچ مانے، وہ کسی کام مین ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت، اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہین، بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے، اور خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے بال بھر ہٹنا نہین چاہتا، لیکن اہلِ تقویٰ کا پورا حلیہ سورہ بقرہ مین ہے،

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ	لیکن نیکی یہ ہے کہ جو خدا پر اور پچھلے دن
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ	پر اور فرشتون پر اور کتاب پر اور پیغمبرون
وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى	پر ایمان لایا، اور اپنا مال اس کی محبت
الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى	پر رشتہ دارون، یتیمون، مسکینون
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ	مسافر اور مانگنے والون کو اور گردنون
السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَ	کے آزاد کرانے مین دیا، اور نماز کو برپا
فِي الرِّقَابِ ج وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ	کیا، اور زکوٰۃ ادا کی، اور جو وعدہ کرکے
وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ج وَالْمُوْفُوْنَ	اپنے وعدہ کو ایفا کرنے والے ہین،
بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ج	اور سختی، تکلیف، اور لڑائی مین صبر
وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ	کرنے والے ہین، یہی وہ ہین، جو

وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (بقرہ-۲۲) سچے ٹھہرے، اور یہی تقویٰ والے ہین،

ان آیتون مین تقویٰ والون کا نہ صرف عام حلیہ، بلکہ ایک ایک خط و خال نمایان کردیا گیا، اور بتادیا گیا ہے، کہ یہی خدا کی نگاہ مین سچے ٹھہرنے والے اور تقویٰ والے ہین،

تقویٰ کی حقیقت کیا ہے

تقویٰ اصل مین وَقْوٰی ہے، عربی زبان مین اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہین لیکن وحی محمدیؐ کی اصطلاح مین یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کرکے دل مین خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کردیتی ہے، دوسرے لفظون مین ہم یون کہہ سکتے ہین کہ وہ ضمیر کے اُس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام مین خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، یہ بات کہ تقویٰ اصل مین دل کی اس کیفیت کا نام ہے، قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکانِ حج کے بیان کے موقع پر ہے،

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ، (حج-۴) اور جو شعائر الٰہی کی تعظیم کرتا ہے تو وہ دلون کے تقویٰ سے ہے،

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کا اصلی تعلق دل سے ہے، اور وہ سلبی کیفیت (بچنا) کے بجائے ایجابی اور ثبوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے، وہ امورِ خیر کی طرف دلون مین تحریک پیدا، اور شعائر الٰہی کی تعظیم سے اُن کو معمور کرتا ہے، ایک اور آیت کریمہ مین ارشاد ہے،

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ	بے شک جو لوگ رسول اللہ کے
عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ	سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں،
الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ	وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ
لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ	نے تقوی کے واسطے جانچا ہے، انکو
عَظِيْمٌ، (حجرات - ۱)	معافی ہے اور بڑا بدلہ،

اس آیت میں بھی تقوی کا مرکز دل ہی کو قرار دیا ہے، اور بتایا ہے کہ رسول کی تعظیم کا احساس تقوی سے پیدا ہوتا ہے، ایک اور تیسری آیت میں تقوی کے فطری الہام ہونے کی طرف اشارہ ہے،

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا،	تو ہر نفس میں اس کا فجور اور اس کا
(الشمس - ۱)	تقوی الہام کر دیا،

فجور تو ظاہر ہے کہ گنہگاری اور نافرمانی کی جڑ ہے، ٹھیک اسی طرح تقوی تمام نیکیوں کی بنیاد، اور اصل الاصول ہے، اور دونوں بندہ کو فطرۃً ودیعت ہیں، اب بندہ اپنے عمل اور کوشش سے ایک کو چھوڑتا اور دوسرے کو اختیار کرتا ہے، مگر بہرحال یہ دونوں الہام ربانی ہیں اور سب کو معلوم ہے کہ الہام کا ربانی مرکز دل ہے، اس لئے یہی تقوی کا مقام ہے،

تقوی کا لفظ جس طرح اس دلی کیفیت پر بولا جاتا ہے، اس کیفیت کے اثر اور نتیجہ پر بھی اطلاق پاتا ہے، صحابہؓ نے کفار کے اشتعال دلانے، اور ان سے بدلہ لینے پر پوری قوت رکھنے کے باوجود حدیبیہ کی صلح کو تسلیم کر لیا، تو اللہ تعالی نے ان کی اس مستحسن روش کو تقوی فرمایا،

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا، (فتح-۳)

اور جب کفار نے اپنے دلون مین پچ رکھی، نادانی کی پچ، تو اللہ نے اپنا چین اپنے رسول پر اور مسلمانون پر اُتارا، اور اُن کو تقویٰ کی بات پر لگا رکھا، اور وہی تھے اس کے لائق، اور اس کے اہل،

یہان جنگ و خونریزی سے احتراز، خانہ کعبہ کے ادب، اور کفار قریش کی جاہلانہ عصبیت سے چشم پوشی کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک اور دوسری آیت مین دشمنون کے ساتھ ایفائے عہد اور حتی الامکان جنگ سے پرہیز کرنے والون کو متقی یعنی تقویٰ والے فرمایا ہے، اور ان کے ساتھ اپنی محبت ظاہر فرمائی ہے،

فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ، (توبہ-۱)

تو تم ان کے عہد کو اُن کی مقررہ مدت تک پورا کرو، خدا تقویٰ والون کو پیار کرتا ہے،

فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ، (توبہ-۲)

تو وہ جب تک تم سے سیدھے رہین تم بھی اُن کے ساتھ سیدھے رہو، خدا تقویٰ والون کو پیار کرتا ہے،

جس طرح انسان کا فجور، بری تعلیم، بری صحبت اور برے کامون کی مشق اور کثرت سے

بڑھتا جاتا ہے، اس طرح اچھے کاموں کے شوق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے اور اس کی قلبی کیفیت مین ترقی ہوتی ہے،

وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ	جو لوگ راہ پر آئے، خدا نے اُن کی
هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ	سوجھ اور بڑھائی اور اُن کو اُن کا
(محمد - ۲)	تقویٰ عنایت کیا،

اس سے عیان ہے کہ "تقویٰ" ایک ایجابی اور ثبوتی کیفیت ہے، جو انسان کو خدا عنایت فرماتا ہے، اور جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہدایت پر ہدایت، اور فطری تقویٰ پر مزید دولتِ تقویٰ مرحمت ہوتی ہے،

تقویٰ کی یہ حقیقت کہ وہ دل کی خاص کیفیت کا نام ہے، ایک صحیح حدیث سے تصریحاً معلوم ہوتی ہے، صحابہ کے مجمع مین ارشاد فرمایا،

التقویٰ ھٰھُنا، (مسلم)	تقویٰ یہان ہے،

اور یہ کہکر دل کی طرف اشارہ فرمایا، جس سے بے شک و شبہہ یہ واضح ہوجاتا ہے کہ تقویٰ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے، جو تمام نیکیون کی محرک ہے، اور وہی مذہب کی جان اور دینداری کی رُوح ہے، اور یہی سبب ہے، کہ وہ قرآنِ پاک کی رہنمائی کی غایت، ساری ربانی عبادتون کا مقصد، اور تمام اخلاقی تعلیمون کا ماحصل قرار پایا،

اسلام مین برتری کا معیار

اسلام مین تقویٰ کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اثر یہ ہے کہ تعلیمِ محمدی نے نسل، رنگ، وطن، خاندان، دولت، حسب، نسب، غرض نوعِ انسانی کے ان

صدہا خود ساختہ اعزازی مرتبون کو مٹا کر صرف ایک ہی امتیازی معیار قائم کر دیا، جس کا نام تقویٰ ہے، اور جو ساری نیکیون کی جان ہے، اور اس لئے وہی معیاری امتیاز بننے کے لائق ہے، چنانچہ قرآنِ پاک نے بہ آوازِ بلند یہ اعلان کیا،

جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (حجرات-۲)

ہم نے تم کو مختلف خاندان اور قبیلے صرف اس لئے بنایا کہ باہم شناخت ہو سکے، تم مین سے خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے، جو تم مین سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے،

اس اعلان کو آنحضرت صلعم نے ان دو مختصر لفظون مین ادا فرمایا، الکرمُ التقوی، یعنی بزرگی و شرافت تقویٰ کا نام ہے، اور اسی کے لئے حجۃ الوداع کے اعلانِ عام مین پکار کر فرمایا کہ "عرب کو عجم پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہین، برتر وہ ہے، جس مین سب سے زیادہ تقویٰ ہو"



اخلاص

مُخلِصِینَ الدِّین ۔ (بینہ)

مذہب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو مخاطب کرتا ہے، اس کا سارا کاروبار صرف اسی ایک مضغۂ گوشت سے وابستہ ہے، عقائد ہوں یا عبادات' اخلاق ہوں یا معاملات'' انسانی اعمال کے ہر گوشہ میں اس کی نظر اسی ایک آئینہ پر رہتی ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت صلعم نے ایک مشہور حدیث میں یوں ظاہر فرمایا ہے،

الا وان فی الجسد مضغۃً	ہشیار رہو کہ بدن میں گوشت کا ایک
اذا صلحت صلح الجسد کلہ	ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہو تو سارا
واذا فسدت فسد الجسم کلہ	بدن درست ہوتا ہے، اور وہ خراب
الا وھی القلب[1] ،	ہو تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے'
	ہشیار رہو کہ وہ دل ہے،

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان باب من استبرء لدینہ، وصحیح مسلم باب اخذ الحلال وترک الشبہات،

دل ہی کی تحریک انسان کے ہر اچھے اور برے فعل کی بنیاد اور اساس ہے، اس لئے مذہب کی ہر عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے، اس کا محرک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو اور نہ اس سے مقصود ریا و نمائش، جلب منفعت طلب شہرت یا طلب معاوضہ وغیرہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے، رسولؐ کو حکم ہوتا ہے،

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ	تو اللہ کی عبادت کر خالص کرتے ہوئے
الدِّيْنَ، اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ	اطاعت گذاری کو اسی کے لئے ہشیار
الْخَالِصُ ط (زمر-۱)	کہ اللہ ہی کے لئے ہے خالص اطاعت گذاری

مقصود یہ ہے کہ خدا کی اطاعت گذاری میں، خدا کے سوا کسی اور چیز کو اس کا شریک نہ بنایا جائے، وہ چیز خواہ پتھر یا مٹی کی مورت، یا آسمان و زمین کی کوئی مخلوق، یا دل کا تراشا ہوا کوئی باطل مقصود ہو، اسی لئے قرآن پاک نے انسانی اعمال کی نفسانی غرض و غایت کو بھی بت پرستی قرار دیا ہے، فرمایا

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ	کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی
هَوٰىهُ، (فرقان-۴)	خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے،

چنانچہ اسلام کی یہ اہم ترین تعلیم ہے کہ انسان کا کام ہر قسم کی ظاہری و باطنی بت پرستی سے پاک ہو، رسول کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے،

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ	کہہ دے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں

مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ، وَاُمِرْتُ	اطاعت گذاری کو اللہ کے لئے خالص
لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ	کرکے اس کی عبادت کرون، اور
قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ	مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مین پہلا فرمانبردار
رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ، قُلِ	ہوؤن، کہدے کہ مین ڈرتا ہون اگر اپنے
اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ	پروردگار کی نافرمانی کرون، بڑے
فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ	دن کے عذاب سے، کہدے کہ اللہ ہی
دُوْنِهٖ (زمر-۲)	کی عبادت کرتا ہون، اپنی اطاعت گذاری
	کو اس کے لئے خالص کرکے تو تم (اے
	کفار) خدا کو چھوڑ کر جسکی عبادت چاہے کرو

قرآنِ پاک کے سات موقعون پر یہ آیت ہے،

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ، اطاعت گذاری کو خدا کیلئے خالص کرکے

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت اور عمل کا پہلا رکن یہ ہے کہ وہ خالص خدا کے لئے ہو، یعنی اس مین کسی ظاہری و باطنی بت پرستی، اور خواہشِ نفسانی کو دخل نہ ہو، اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى، (لیل-۱) یعنی خدائے برتر کی ذات کی خوشنودی کے سوا کوئی اور غرض نہ ہو،

انبیاء علیہم السّلام نے اپنی دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ مین ہمیشہ یہ اعلان کیا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہین، اس سے ہم کو کوئی دنیاوی مزد، اور ذاتی معاوضہ مطلوب نہین،

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اور مین اس پر کوئی مزدوری تم سے

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ	نہین چاہتا، میری مزدوری تو ہی
(شعراء - ۶ - ۷ - ۸ - ۹ - ۱۰)	پر ہے، جو ساری دنیا کا پروردگار ہے

حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے بھی یہی فرمایا گیا،

یٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مَالًا	اے میری قوم! مین تم سے اس پر
اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ،	دولت کا خواہان نہین، میری مزدوری
(ھود - ۳)	تو خدا ہی پر ہے،

خود ہمارے رسول صلعم کو یہ کہدینے کا فرمان ہوا مین تم سے اپنے لئے کوئی مزد و اجرت نہین چاہتا، اگر چاہتا بھی ہون تو تمھارے ہی لئے،

قُلْ مَا سَاَلْتُکُمْ مِّنْ اَجْرٍ	کہدے کہ مین نے تم سے جو اجرت
فَھُوَ لَکُمْ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی	چاہی تو وہ تمھارے ہی لئے، میری
اللّٰہِ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ	اجرت تو اللہ پر ہے، وہ ہر بات پر
(سبا - ۶)	گواہ ہے،

یعنی وہ ہر بات کا عالم اور نیتون سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ میری ہر کوشش بے غرض، اور صرف خدا کے لئے ہے، دوسری جگہ فرمایا،

لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا	مین اس پر تم سے کوئی مزدوری نہین
الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی، (شوریٰ - ۳)	چاہتا، مگر قرابت دارون مین محبت رکھنا

یعنی رسول نے اپنی بے غرض کوششون سے امت کو جو دینی و دنیاوی فائدے پہنچائے اسکے لئے

وہ تم سے کسی ذاتی منفعت کا خواہان نہین، اگر وہ اس کے معاوضہ مین کچھ چاہتا ہے تو یہ ہے کہ قرابت دارون کا حق ادا کرو، اور آپس مین محبت رکھو،

اسی قسم کی بات ایک اور آیت مین ظاہر کیگئی ہے،

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ	کہدے کہ مین تمھاری اس رہنمائی پر
اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ	تم سے کوئی معاوضہ نہین مانگتا مگر
اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا،	یہی کہ جو چاہے اپنے پروردگار کی
(فرقان - ۵)	طرف راستہ پکڑے،

یعنی میری اس محنت کی مزدوری یہی ہے کہ تم مین سے کچھ لوگ حق کو قبول کرلین،

دنیا مین بھی اخلاص ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے، کوئی بظاہر نیکی کا کتنا ہی بڑا کام کرے لیکن اسکی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض، یا محض دکھاوا اور نمایش تھا، تو اس کام کی قدر و قیمت فوراً نگاہون سے گر جائیگی، اسی طرح روحانی عالم مین بھی خدا کی نگاہ مین اس چیز کی کوئی قدر نہین جو اس کی بارگاہِ بے نیاز کے علاوہ کسی اور کیلئے پیش کی گئی ہو، مقصود اس سے یہ ہے کہ نیکی کا ہر کام دنیاوی لحاظ سے بے غرض و بے منت اور بلا خیال مزد و اجرت اور تحسین و شہرت کی طلب سے بالاتر ہو، یہ تحسین و شہرت کا معاوضہ بھی دین تو الگ رہا دنیا بھی اُن ہی کو ادا کرتی ہے، جن کی نسبت اس کو یقین ہوتا ہے کہ انھون نے اپنا کام ان ہی شرائط کے ساتھ انجام دیا ہے،

ہم جو کام بھی کرتے ہین اس کی دو شکلین پیدا ہوتی ہین، ایک مادّی جو ہمارے ظاہری

جسمانی اعضا کی حرکت و جنبش سے پیدا ہوتی ہے، دوسری روحانی، جسکا ہیولیٰ ہمارے دل کے ارادہ و نیت، اور کام کی اندرونی غرض و غایت سے تیار ہوتا ہے، کام کی بقا اور برکت دین اور دنیا دونون مین اسی روحانی پیکر کے حسن و قبح اور ضعف و قوت کی بنا پر ہوتی ہے، انسانی اعمال کی پوری تاریخ اس دعویٰ کے ثبوت مین ہے، اسی لئے اس اخلاص کے بغیر اسلام مین نہ تو عبادت قبول ہوتی ہے، اور نہ اخلاق و معاملات عبادت کا درجہ پاتے ہین، اس لئے ضرورت ہے کہ ہر کام کے شروع کرتے وقت ہم اپنی نیت کو ہر غیر مخلصانہ غرض و غایت سے بالا، اور ہر دنیاوی مزد و اجرت سے پاک رکھین، توراۃ اور قرآن دونون مین ہابیل اور قابیل آدم کے دو بیٹون کا قصہ ہے، دونون نے خدا کے حضور مین اپنی اپنی پیداوار کی قربانیان پیش کین، خدا نے اُن مین سے صرف ایک کی قربانی قبول کی، اور اسی کی زبان سے اپنا یہ ابدی اصول بھی ظاہر فرما دیا،

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (مائدہ - ۵) — خدا تو متقیون ہی سے قبول کرتا ہے،

متقی بھی وہی ہوتے ہین، جو دل کے اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کے لئے کام کرتے ہین، ان ہی کا کام قبول ہوتا ہے، اور اُن کو دین و دنیا مین فوز و فلاح بخشا جاتا ہے، ان کو خدا کے یہان محبوبیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے، اور دنیا مین اُن کو ہر دلعزیزی ملتی ہے، ان کے کامون کو شہرت نصیب ہوتی ہے، اور ان کے کارنامون کو زندگی بخشی جاتی ہے، وہ جماعتون اور قومون کے محسن ہوتے ہین، لوگ اُن کے ان کامون سے نسلاً بعد نسلٍ فیضیاب ہوتے ہین، اور اُن کے لئے رحمت کی دعائین مانگتے ہین، حضرت موسیٰؑ کے عہد مین فرعونیون کو ایک پیغمبر اور جادوگر کے درمیان کوئی فرق نظر نہین آتا تھا، کہ ان دونون سے انھون نے عجائب و غرائب

امور کا یکسان مشاہدہ کیا، خدا نے فرمایا ان دونون کے عجائب وغرائب مین ظاہری نہین باطنی صورت کا فرق ہے، ایک کے کام کی غرض صرف تماشا اور بازیگری ہے، اور دوسرے کا نتیجہ ایک پوری قوم کی اخلاقی وروحانی زندگی کا انقلاب ہے، اسی لئے یہ فیصلہ ہے کہ

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ، (طٰہٰ - ۳) اور جادوگر جدھر سے بھی آئے فلاح نہین پائے گا،

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ مصر کے جادوگرون کے حیرت انگیز کرتب صرف کہانی بنکر رہ گئے اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزات نے ایک نئی قوم، ایک نئی شریعت، ایک نئی زندگی، ایک نئی سلطنت پیدا کی، جو مدتون تک دنیا مین قائم رہی،

غرض عمل کا اصلی پیکر وہی ہے، جو دل کے کارخانہ مین تیار ہوتا ہے، اسی لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر کام سے پہلے دل کی نیت کا جائزہ لے لیا جائے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ خود بخود حل ہو جائیگا کہ اسلام نے ہر عبادت کے صحیح ہونے کے لئے ارادہ اور نیت کو کیون ضروری قرار دیا ہے،



توکّل

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران-١٠٧)

توکّل قرآن پاک کی اصطلاح کا اہم لفظ ہے، عام لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے لئے جدّ و جہد اور کوشش نہ کیجائے، بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں توڑ کے کسی حجرہ یا خانقاہ مین بیٹھ رہا جائے، اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کرے گا، یعنی تقدیر مین جو کچھ ہے وہ ہو رہے گا، اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہین، لیکن یہ سراسر وہم ہے، اور مذہبی اپاہجون کا دل خوش کن فلسفہ ہے، جس کو اسلام سے ذرّہ بھر بھی تعلق نہین،

توکّل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہین، اور اصطلاح مین خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہین، لیکن کس بات مین بھروسہ کرنا کسی کام کے کرنے مین یا نہ کرنے مین؟ جھوٹے صوفیون نے ترکِ عمل، اسباب و تدابیر سے بے پروائی اور خود کام نہ کرکے دوسرون کے سہارے جینے کا نام توکل رکھا ہے، حالانکہ توکل نام ہے کسی کام کو پورے ارادہ و عزم اور تدبیر و کوشش کے ساتھ ہی انجام دینے اور یہ یقین رکھنے کا کہ اگر اس کام مین بھلائی ہے، تو اللہ تعالیٰ اس مین ضرور

ہم کو کامیاب فرمائے گا،

اگر تدبیر اور جد وجہد و کوشش کا ترک ہی توکل ہوتا، تو دنیا مین لوگون کے سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ پیغمبرون کو مبعوث نہ کرتا، اور نہ ان کو اپنی تبلیغ رسالت کے لئے جد وجہد اور سعی و سرگرمی کی تاکید فرماتا، اور نہ اس راہ مین جان ومال کی قربانی کا حکم دیتا، نہ بدر و اُحد اور خندق و حنین مین سوارون، تیراندازون، زرہ پوشون، اور تیغ آزماؤن کی ضرورت پڑتی، اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ کے پاس جا جا کر حق کی دعوت کا پیغام سنانے کی حاجت ہوتی،

توکل مسلمانون کی کامیابی کا اہم راز ہے، حکم ہوتا ہے کہ جب لڑائی یا کوئی اور مشکل کام پیش آئے، تو سب سے پہلے اس کے متعلق لوگون سے مشورہ لے لو، مشورہ کے بعد جب رائے ایک نقطہ پر ٹھہر جائے تو اس کے انجام دینے کا عزم کر لو، اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرنا شروع کر دو، اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو، کہ وہ تمھارے کام کا حسب خواہ نتیجہ پیدا کرے گا، اگر ایسا نتیجہ نہ نکلے تو اس کو خدا کی حکمت و مصلحت اور مشیئت سمجھو، اور اس سے مایوس اور بودے نہ ہو، اور جب نتیجہ خاطر خواہ نکلے تو یہ غرور نہ ہو کہ یہ تمھاری تدبیر اور جد وجہد کا نتیجہ اور اثر ہے، بلکہ یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ کا تم پر فضل و کرم ہوا، اور اُسی نے تم کو کامیاب اور بامراد کیا، آل عمران مین ہے،

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ج	اور کام (یا لڑائی) مین اُن سے مشورہ
فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى	لے لو، پھر جب پکّا ارادہ کر لو تو اللہ
اللَّهِ ط إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ	پر بھروسہ رکھو، بے شک اللہ (اللہ)

اِنْ یَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ	بھروسہ رکھنے والون کو پیار کرتا ہے
لَكُمْ وَاِنْ یَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ	اگر اللہ تمھارا مددگار ہو تو کوئی تم پہ
ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ	غالب نہ آسکے گا، اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ	تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمھاری
	مدد کر سکے، اور اللہ ہی پر چاہئے کہ
(آل عمران - ۱۷)	ایمان والے بھروسہ رکھیں،

ان آیات نے توکّل کی پوری اہمیت اور حقیقت ظاہر کر دی، کہ توکل بے دست و پائی اور ترکِ عمل کا نہین، بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم و ارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر اور نتیجہ کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا مددگار رہے تو کوئی ہم کو ناکام نہین کر سکتا، اور اگر وہی نہ چاہے تو کسی کی کوشش اور مددکارآمد نہین ہوسکتی اس لئے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے کام مین خدا پر بھروسہ رکھے،

منافق اسلام اور مسلمانون کے خلاف سازشین اور راتون کو جوڑ توڑ کرتے ہین، حکم ہوتا ہے کہ ان کی ان مخالفانہ چالون کی پروا نہ کرو، اور خدا پر بھروسہ رکھو، وہی تمھارے کامون کو بنائیگا

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ	تو ان منافقون سے درگذر کر اور
عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا	خدا پر بھروسہ رکھ، اور اللہ ہے کام
(نساء - ۱۱)	بنانے والا،

آغازِ اسلام کے شروع مین تین برس کی مخفی دعوت کے بعد جب اسلام کی علانیہ دعوت

کا حکم ہوتا ہے، تو مخالفون کی کثرت، اور دشمنون کی قوت سے بے خوف ہونے کی تعلیم دیجاتی ہے، اور فرمایا جاتا ہے کہ ان مشکلات کی پروا کئے بغیر خدا پر توکل اور بھروسہ کرکے کام شروع کردو،

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ.

اور اپنے قریبی رشتہ دارون کو ہشیار کر، اور مومنوں مین سے جو تیری پیروی کرے اس کے لئے اپنی (شفقت) کا بازو جھکا، پھر اگر وہ تیرا کہا نہ مانین تو کہدے کہ مین تمہارے کامون سے الگ ہون، اور اس غالب رحمت والے پر بھروسہ رکھ جو تجھکو دیکھتا ہے جب تو (رات کو) اٹھتا ہے، اور نمازیون مین تیری آمدورفت کو ملاحظہ (کرتا ہے)

(شعراء - ۱۱)

دشمنون کے نرغہ مین ہونے کے باوجود آنحضرت صلعم تنہائی مین راتون کو اٹھ اٹھ کر عبادت گذار مسلمانون کو دیکھتے پھرتے تھے، یہ جرأت اور بے خوفی اسی توکل کا نتیجہ تھی، مشکلات مین اسی توکل اور اللہ پر اعتماد کی تعلیم مسلمانون کو دی گئی ہے، احزاب مین منافقون اور کافرون کی مخالفانہ کوششون سے بے پروا ہو کر اپنے کام مین لگے رہنے کا جہان حکم دیا گیا ہے، وہان اسی توکل کا سبق پڑھایا گیا ہے،

يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ	اے پیغمبر خدا سے ڈر، اور کافرون اور
الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ	منافقون کا کہا نہ مان، بے شک اللہ
كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى	جاننے والا اور حکمت والا ہے، اور جو
اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ	تیرے پاس تیرے پروردگار کی طرف
كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا	سے وحی کیجاتی ہے، اس کے پیچھے چل،
وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ	بیشک خدا تمھارے کامون سے خبردار
وَكِيْلًا ،	ہے، اور اللہ پر بھروسہ رکھ، اور اللہ
(احزاب – ۱)	کام بنانے کو کافی ہے،

کفار سے مسلسل لڑائیون کے پیش آنے کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر اب بھی یہ لوگ صلح کی طرف جھکین تو تم بھی جھک جاؤ، اور مصالحت کر لو، اور یہ خیال نہ کرو کہ یہ بدعہد کہین دھوکا نہ دین، خدا پر بھروسہ رکھو تو اُن کے فریب کا داؤ کامیاب نہ ہوگا،

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا	اور اگر وہ صلح کے لیے جھکین تو تو بھی
وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ	جھک جا، اور خدا پر بھروسہ رکھ، بیشک
الْعَلِيْمُ وَاِنْ يُّرِيْدُوْۤا اَنْ	وہ سننے والا اور جاننے والا ہے، اور
يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ	اگر وہ تجھے دھوکا دینا چاہین تو کچھ پروا
اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ	نہین کہ تجھے اللہ کافی ہے، اُسی نے
وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ، (انفال – ۸)	تجھکو اپنی اور مسلمانون کی نصرت سے تیری مدد کی

یہود جن کو اپنی دولت، ثروت اور علم پر ناز تھا، ان سے بھی بے خوف وخطر ہو کر اللہ کے بھروسہ پر مسلمانوں کو حق کی تائید کے لئے کھڑے ہوجانے کا حکم ہوتا ہے،

اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَقُصُّ عَلٰی	بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اکثر
بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَکْثَرَ الَّذِیْ	وہ باتین ظاہر کردیتا ہے، جن مین وہ
ھُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ وَاِنَّهٗ	مختلف ہین، اور بیشک یہ قرآن مسلمانو
لَھُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔	کے لئے ہدایت اور رحمت ہے، بیشک
اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَھُمْ	تیرا پروردگار ان کے درمیان اپنے
بِحُکْمِهٖ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْعَلِیْمُ	حکم سے فیصلہ کردے گا، اور وہی
فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ اِنَّكَ عَلَی	غالب اور جاننے والا ہے، تو تو خدا
الْحَقِّ الْمُبِیْنِ، (نمل-۶)	پر بھروسہ رکھ بیشک تو کھلے حق پر ہے

اسلام کی تبلیغ اور دعوت کی مشکلون مین بھی خدا ہی کے اعتماد اور بھروسہ پر کام کرنے کی ہدایت ہے، کہ وہ ایسی طاقت ہے جس کو زوال نہین، اور ایسی ہستی ہے جس کو فنا نہین، فرمایا،

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ	اور مین نے تو (اے رسول) تجھے خوشخبری
نَذِیْرًا، قُلْ مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ	سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر
مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ	بھیجا ہے، کہدے کہ مین تم سے اسکے
یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا ٥	سوا (اپنے کام کی) کوئی مزدوری نہین
وَتَوَکَّلْ عَلَی الْحَیِّ الَّذِیْ	مانگتا کہ جو چاہے اپنے پروردگار کا راستہ

لَا یَمُوْتُ، قبول کرے، اور اس زندہ رہنے والے

(فرقان - ۵) پر بھروسہ کر جس کو موت نہین،

رسول کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم اپنا کام کئے جاؤ، مخالفین کی پروانہ کرو، اور خدا پر بھروسہ رکھو جس کے سوا کوئی دوسرا با اختیار نہین،

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ — تو اگر یہ (مخالفین) کہا نہ مانین، تو (ان سے)

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ — کہدو کہ مجھے اللہ بس ہے نہین کوئی

وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ، — معبود، لیکن وہی، اسی پر مین نے بھروسہ

(توبہ - ۱۶) — کیا، وہ بڑے تخت کا مالک ہے،

آپس کے اختلافات مین اللہ کا فیصلہ چاہئے اس حالت مین بھی، اسی پر بھروسہ ہے،

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ — اور جس چیز مین تم مین راے کا اختلاف

فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ — ہے، تو اس کا فیصلہ خدا کی طرف ہے

رَبِّیْ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَیْهِ — وہی اللہ ہے میرا پروردگار، اسی پر

اُنِیْبُ، — مین بھروسہ کرتا ہون، اور اسی کی طرف

(شوریٰ - ۲) — رجوع کرتا ہون،

رسول کو خدا کی آیتین پڑھ کر اپنی نادان قوم کو سنانے کا حکم ہوتا ہے، اور تسلّی دیجاتی ہے کہ اُن کے کفر و نافرمانی کی پروانہ کرو، اور اپنی کامیابی کے لئے خدا پر بھروسہ رکھو،

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِیْٓ اُمَّةٍ — ایسا ہی ہم نے تجھے اس قوم مین بھیجا ہے

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا أُمَمٌ	جس سے پہلے بہت سی قومین گذر چکین،
لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا	تا کہ تو ان کو وہ پیام سنائے جو ہمنے
إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَٰنِ	تجھ پر وحی کیا ہے، اور وہ رحمان کے
قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ	ماننے سے انکار کرتے ہین، کہدے کہ وُہ
عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ	میرا پروردگار ہے کوئی معبود نہین
	لیکن وہی، اسی پر مین نے بھروسہ کیا اور
(رعد - ۴)	اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے،

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم پر ہمیشہ ایک مسلمان کو بھروسہ رکھنا چاہیئے، اور گمراہون کی ہدایت کا فرض ادا کرنے کے بعد اُن کی شرارتون سے پراگندہ خاطر نہ ہونا چاہیئے، کفار کو یہ آیت سنا دینی چاہیئے،

قُلْ هُوَ الرَّحْمَٰنُ آمَنَّا بِهِ وَ	کہدے وہی ہے رحم والا ہم اُس پر
عَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا فَسَتَعْلَمُونَ	ایمان لائے، اور اسی پر بھروسہ کیا،
مَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ،	تو تم جان لوگے کہ کون کھلی گمراہی
(الملک - ۲)	مین ہے،

جس طرح ہمارے رسولؐ کو اور عام مسلمانون کو ہر قسم کی مصیبتون، مخالفتون، اور مشکلون مین خدا پر توکل اور اعتماد رکھنے کی ہدایت بار بار ہوئی ہے، آپ سے پہلے پیغمبرون کو بھی اس قسم کے موقعون پر اسی کی تعلیم دی گئی ہے، اور خود اولوالعزم رسولون کی زبانون سے عملاً اس تعلیم

کا اعلان ہوتا رہا ہے، حضرت نوح علیہ السلام جب تن تنہا سا لہا سال تک کافرون کے نرغہ مین پھنسے رہے، تو انھون نے پوری بلند آہنگی کے ساتھ اپنے دشمنون کو یہ اعلان فرمادیا،

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ	(اے پیغمبر!) ان کو نوح کا حال سُنا
قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنْ كَانَ	جب اس نے اپنی قوم سے کہا اے
كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذْكِيرِي	میرے لوگو! اگر میرا رہنا اور اللہ کی نشانیون
بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ	کے ساتھ میرا نصیحت کرنا، تم پر شاق
فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ	گذرتا ہے، تو اللہ پر مین نے بھروسہ
ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ	کرلیا ہے، تو تم اپنی تدبیر کو اور اپنے
غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُونِ	شریکون کو خوب مضبوط کرلو، پھر تم
	پر تمھاری تدبیر چھپی نہ رہے، پھر اسکو
(یونس - ۸)	مجھ پر پورا کرلو، اور مجھے مہلت نہ دو،

غور کیجئے کہ حضرت نوحؑ نے دشمنون کے ہر قسم کے مکر و فریب، سازش اور لڑائی جھگڑے کے مقابلہ مین استقلال اور عزیمت کے ساتھ خدا پر توکل اور اعتماد کا اظہار کس پیغمبرانہ شان سے فرما رہے ہین، حضرت ہود علیہ السّلام کو اُن کی قوم جب اپنے دیوتاؤن کے قہر اور غضب سے ڈراتی ہے، تو وہ جواب مین فرماتے ہین،

إِنِّي أُشْهِدُ اللَّهَ وَاشْهَدُوا	مین اللہ کو گواہ کرتا ہون، اور تم بھی
أَنِّي بَرِيءٌ مِمَّا تُشْرِكُونَ مِنْ	گواہ رہو کہ ان سے بیزار ہون جنکو

دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا
ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ، اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ
عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ،
(هود-۵)

تم خدا کے سوا شریک ٹھہراتے ہو، پھر
تم سب مل کر میرے ساتھ داؤ کرلو،
پھر مجھے مہلت نہ دو، مین نے اللہ پہ
جو میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہے
بھروسہ کرلیا ہے،

حضرت شعیب علیہ السّلام اپنی قوم سے کہتے ہین کہ مجھے تمہاری مخالفتون کی پروا نہین، مجھے جو اصلاح کا کام کرنا ہے، وہ کرونگا، میرا تکیہ خدا پر ہے،

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا
اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا
بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ
اِلَيْهِ اُنِيْبُ، (هود-۸)

مین تو جب تک مجھ مین طاقت ہے
کام سدھارنا چاہتا ہون، میری توفیق
اللہ ہی سے ہے، اسی پر مین نے بھروسہ
کیا ہے، اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہون

ان پیغمبرون کی اس استقامت، صبر اور توکل کے واقعات سنانے کے بعد رسول اللہ صلعم کو تسلّی دی جاتی ہے کہ آپ کو بھی اپنے کامون کے مشکلات مین اسی طرح خدا پر توکل کرنا چاہیے،

قُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ
اِنَّا عٰمِلُوْنَ، وَانْتَظِرُوْا

کہدو ان سے جو ایمان نہین لاتے
کہ تم اپنی جگہ کام کرو، ہم بھی کرتے
ہین، اور تم بھی (نتیجہ کا) انتظار کرو،

إِنَّا مُنْتَظِرُونَ، وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ، فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ، (ھود - ۱۰)

ہم بھی کرتے ہین، اور اللہ ہی کے قبضہ مین ہے آسمانون کا اور زمین کا چھپا بھید، اور اسی کی طرف سارے کامون کا فیصلہ لوٹایا جاتا ہے، پھر اُس کی عبادت کر، اور اس پر بھروسہ کر،

مسلمانون کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے پیروون کا نمونہ پیش کیا جارہا ہے، کہ وہ صرف خدا کے بھروسہ پر عزیز و قریب سب کو چھوڑ کر الگ ہوگئے اور خدا کی راہ مین کسی کی دوستی اور محبت کی پروا نہ کی،

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرٰهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءٰؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهُ إِلَّا قَوْلَ إِبْرٰهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ

تمھارے لئے ابراہیم اور اُن کے ساتھیون مین پیروی کا اچھا نمونہ ہے، جب انھون نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور خدا کے سوا جن کو تم پوجتے ہو اُن سے بیزار ہین، ہم نے تمھارے مسلک کا انکار کر دیا، اور ہم مین اور تم مین دشمنی اور نفرت ہمیشہ کے لئے کھل گئی، جب تک تم ایک خدا پر ایمان نہ لے آؤ، مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے

وَمَآ اُغْنِیْ عَنْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ	یہ کہنا کہ میں تمہارے لئے خدا سے دعا
مِنْ شَیْءٍ ۚ رَبَّنَا عَلَیْکَ تَوَکَّلْنَا	کروں گا، اور مجھے خدا کے کام میں کوئی
وَاِلَیْکَ اَنَبْنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ	اختیار نہیں، اے ہمارے پروردگار
	تجھی پر ہم نے بھروسہ کیا، اور تیری ہی
	طرف ہم نے رجوع کیا، اور تیرے ہی
(ممتحنہ - ۱)	پاس لوٹ کر جانا ہے،

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے عزیز بیٹوں کو مصر بھیجتے ہیں لیکن فرطِ محبت سے ڈرتے ہیں کہ یوسف کی طرح اُن کو بھی کوئی مصیبت نہ پیش آئے، بیٹوں کو کہتے ہیں کہ تم سب شہر کے ایک دروازے سے نہیں، بلکہ متفرق دروازوں سے اندر جانا، اس ظاہری تدبیر کے بعد خیال آتا ہے کہ کارسازِ حقیقی تو خدا ہے، ان تدبیروں سے اس کا حکم ٹل تھوڑا ہی سکتا ہے اس لئے بھروسہ تدبیر پر نہیں، بلکہ خدا کی کارسازی ہے،

وَقَالَ یٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا	اور (یعقوب نے) کہا، اے میرے بیٹو!
مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا	ایک دروازہ سے نہ جانا، بلکہ الگ
مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَآ	الگ دروازوں سے جانا، اور میں
اُغْنِیْ عَنْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ	تم کو خدا سے ذرا بھی بچا نہیں سکتا
شَیْءٍ ؕ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ عَلَیْهِ	فیصلہ اللہ ہی کا ہے، اسی پر میں نے
تَوَکَّلْتُ ۚ وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَکَّلِ	بھروسہ کیا، اور اسی پر چاہیئے کہ بھروسہ

الْمُتَوَكِّلُوْنَ، (یوسف -۸) کرنے والے بھروسہ کریں،

حضرت یعقوب علیہ السّلام کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ظاہری تدبیر شانِ توکل کے منافی نہیں،

حضرت شعیب علیہ السّلام کی دعوت کے جواب میں جب اُن کی قوم ان کو زبردستی بت پرست بنجانے پر مجبور کرتی ہے، ورنہ ان کو گھر سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتی ہے، تو اس کے جواب میں وہ پوری استقامت کے ساتھ فرماتے ہیں،

قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا	اگر ہم پھر تمھارے مذہب میں آجائیں
اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِکُمْ بَعْدَ	جب ہم کو خدا اس سے بچا چکا، تو ہم
اِذْ نَجّٰنَا اللّٰہُ مِنْہَا وَمَا یَکُوْنُ	نے خدا پر جھوٹ باندھا، اور یہ ہم سے
لَنَا اَنْ نَّعُوْدَ فِیْہَا اِلَّآ اَنْ	نہیں ہو سکتا کہ ہم پھر اس میں لوٹکر
یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا	جائیں، مگر یہ کہ ہمارا پروردگار خدا ہی
کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا عَلَی اللّٰہِ	چاہے، ہمارا پروردگار اپنے علم سے ہر
تَوَکَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ	چیز کو سمائے ہے، ہم نے خدا پر بھروسہ
قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ	کیا، اے ہمارے پروردگار ہمارے
الْفٰتِحِیْنَ،	اور ہماری قوم کے بیچ میں تو حق کا
	فیصلہ کر دے، اور تو ہی سب سے بہتر فیصلہ والا ہے
(اعراف -۱۱)	کرنے والوں میں سے بہتر فیصلہ کرنے

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دل بادل لشکر اور شاہانہ زور و قوت کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کو خدا ہی پر توکل کی تعلیم دی فرمایا،

يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ، (یونس - ۹)	اے میرے لوگو! اگر تم خدا پر ایمان لاچکے ہو، تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم فرمانبردار ہو،

ان کی قوم نے بھی پوری ایمانی جرأت کے ساتھ جواب دیا،

عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (یونس - ۹)	ہم نے خدا ہی پر بھروسہ کیا، ہمارے پروردگار ہم کو ظالم قوم کے لئے آزمایش نہ بنا،

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہر تدبیر کو جس طرح کامیاب بنایا، اور ان کو اپنی خاص خاص نوازشوں سے جس طرح سرفراز کیا، اس سے ہر شخص واقف ہے، یہ سب کچھ ان کے اسی توکل کے صدقہ میں ہوا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اپنا یہ اصول ہی ظاہر فرما دیا ہے،

مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ، (طلاق - ۱)	جو خدا پر بھروسہ کرے گا تو وہ اسکو کافی ہے،

یہ آیتِ پاک خانگی و معاشرتی مشکلات کے موقع کی ہے، کہ اگر میاں بیوی میں نباہ کسی طرح نہ ہو سکے، اور دونوں میں قطعی علیحدگی (طلاق) ہو جائے تو پھر عورت کو اس سے ڈرنا

نہ چاہئے کہ ہمارا سامان کیا ہوگا، اور ہم کہاں سے کھائیں گے؟ ع

خدا خود میر سامان ست ارباب توکّل را

توکل کے متعلق قرآن پاک کی جس قدر آیتیں ہیں، وہ ایک ایک کرکے آپ کے سامنے ہیں، ہر ایک پر غور کی نظر ڈالئے کہ ان میں سے کوئی بھی ان معنوں میں ہے، جن میں ہم اپنی جہالت سے اس کو سمجھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا مفہوم یہ ہے کہ ہم مشکلات کے ہجوم، موانع کی کثرت، اور پر زور مخالفوں کی تدبیروں سے نڈر ہو کر استحکام، عزم اور استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہ کر خدا کی مدد سے کام کے حسب خواہ نتیجہ پیدا ہونے کا دل میں یقین رکھیں،

احادیث میں ہے کہ ایک بدوی اونٹ پر سوار ہو کر آنحضرت صلعم کی خدمت میں آیا، اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ! میں اونٹ کو یونہی چھوڑ کر خدا پر توکل کروں، (کہ میرا اونٹ مجھ کو مل جائے گا) یا اس کو باندھ کر، ارشاد ہوا، اس کو باندھ کر خدا پر توکل کرو،[1] اسی واقعہ کو مولانا رومی نے اس مصرع میں ادا کیا ہے،

ع بر توکّل زانوے اشتر بہ بند

یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی نہیں تاہم حقیقت کے رو سے اس کا مفہوم قرآن پاک کے عین منشا کے مطابق ہے،

---

[1] یہ حدیث بلفظ اعقلها وتوکل ترمذی (آخر ابواب القیامۃ صفحہ ۴۱۲) میں اور قیّدہ وتوکل شعب الایمان بیہقی میں اور قیّدها وتوکّل خطیب کی رواۃ مالک اور ابن عساکر میں ہے، (کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۲۳ حیدرآباد،)

بعض لوگ تعویذ گنڈا، غیر شرعی[1] جھاڑ پھونک، ٹوٹکے اور منتر پر یقین رکھتے ہیں، اور سمجھتے ہین کہ مادی اسباب و تدابیر کو چھوڑ کر ان چیزون سے مطلب برآری کرنا ہی توکل ہے، جاہلیت کے وہم پرست بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے، لیکن آنحضرت صلعم نے اُن کے اس خیال کی تردید کر دی، اور فرمایا کہ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ میری امت سے ستر ہزار اشخاص حساب کتاب کے بغیر جنت مین داخل کر دیئے جائین گے، یہ وہ ہون گے جو تعویذ گنڈا نہین کرتے، جو بدشگونی کے قائل نہین، جو داغ نہین کرتے، بلکہ اپنے پروردگار پر توکل اور اعتماد رکھتے ہین[2]، ایک دوسری حدیث مین ارشاد فرمایا کہ "جو دغواتا اور تعویذ گنڈا کراتا ہے وہ توکل سے محروم ہے[3]"، اس سے مقصود نفس تدبیر کی ممانعت نہین، بلکہ جاہلانہ اوہام کی بیخ کنی ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "اگر تم خدا پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو خدا تم کو ویسے روزی پہنچاتا جیسے پرندون کو پہنچاتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے ہین، اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہین[4]"، اس حدیث سے بھی مقصود ترکِ عمل اور ترکِ تدبیر نہین، کیونکہ پرندون کو اُن کے گھونسلون مین بیٹھا کر یہ روزی نہین پہنچائی جاتی ہے، بلکہ ان کو بھی اڑکر کھیتون اور باغون مین جانے اور رزق تلاش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ خدا پر توکل اور اعتماد سے محروم ہین وہ

---

[1] شرعی کلمات حقیقت مین اللہ تعالیٰ سے دعائین ہین، اور اس کے کلام پاک سے تبرک حاصل کرنا ہے، لیکن آیات اور دعاؤن کا لکھ کر بدن مین لٹکانا یا گھول کر پینا، یا خاص قیود کے ساتھ اعداد مین ان کو لکھنا ثابت نہین [2] صحیح بخاری کتاب الطب باب من لم یرق، و کتاب الرقاق و صحیح مسلم کتاب الایمان، جاہلیت مین اکثر بیماریون کا علاج آگ سے داغ کر کرتے تھے، [3] جامع ترمذی باب ماجاء فی کراہیۃ الرقی، اصل الفاظ یہ ہین، من اکتوی او استرقی فقد بریٔ من التوکل، [4] جامع ترمذی ابواب الزہد صفحہ ۳۸۸ و حاکم،

روزی کے لئے دلتنگ اور کبیدہ خاطر ہوتے ہین، اور اس کے حصول کے لئے ہر قسم کی بدی اور برائی کا ارتکاب کرتے ہین، حالانکہ انھین اگر یہ یقین ہو کہ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا، (ھود-۱)

اور زمین مین کوئی رینگنے والا نہین لیکن اسکی روزی خدا کے ذمہ ہے،

تو وہ اُس کے لئے چوری، ڈاکہ، قتل، بے ایمانی، اور خیانت وغیرہ کے مرتکب نہ ہوتے اور نہ اُن کو دلتنگی اور مایوسی ہوا کرتی، بلکہ صحیح طور سے وہ کوشش کرتے اور روزی پاتے، ان حدیثون کا یہی مفہوم ہے جو قرآن پاک کی اس آیت مین ادا ہوا ہے،

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا، (طلاق-۱)

اور جو کوئی اللہ سے ڈرے، وہ اُسکے لئے مشکل سے نکلنے کا راستہ کر دیگا، اور اسکو وہان سے روزی دیگا جہان سے اسکو گمان نہ ہوگا، اور جو اللہ پر بھروسہ کریگا تو وہ اسکو بس ہے، بیشک اللہ اپنے ارادہ کو پہنچکر رہتا ہے، اس نے ہر چیز کیلئے

اوپر کی تفصیلون سے ہویدا ہے کہ توکل جس قلبی یقین کا نام ہے، اسی کے قریب قریب آجکل کے اخلاقیات مین "خود اعتمادی" کا لفظ بولا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہین جنمین یہ جوہر پایا جاتا ہے لیکن اس خود اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غرور اور فریبِ نفس کے گڈھے اور غار بھی ہین، اس لئے اسلام نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے "خدا اعتمادی" کا نظریہ پیش کیا ہے، جو ان خطرون سے محفوظ ہے،

صبر

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (احقاف)

صبر کی حقیقت پر عوام کی غلط فہمی نے تو برتو پردے ڈال رکھے ہیں، وہ اُن کے نزدیک بے بسی و بیکسی کی تصویر ہے، اور اس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لے سکنا ہیں، لیکن کیا واقعہ یہی ہے؟

صبر کے لغوی معنی "صبر" کے لغوی معنی "روکنے" اور "سہارنے" کے ہیں، یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا، اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا، اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے، یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدم کے ہیں، حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کے قصہ میں ایک ہی آیت میں تین جگہ یہ لفظ آیا ہے، اور ہر جگہ یہی معنی مراد ہیں، حضرت خضرؑ کہتے ہیں،

إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا — تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے، اور

وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ، (کہف - ۹)	کیسے اُس بات پر صبر کر سکتے ہو جس کا علم تمھین نہین ،

حضرت موسیٰؑ جواب مین فرماتے ہین ،

سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا (کہف - ۹)	اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائین گے ،

اس صبر سے مقصود لاعلمی کی حالت مین غیر معمولی واقعات کے پیش آنے سے دل مین اضطراب اور بیچینی کا پیدا نہ ہونا ہے ،

کفار اپنے پیغمبرون کے سمجھانے بجھانے کے باوجود پوری تندہی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی بت پرستی پر قائم رہتے ہین، تو اس کی حکایت اُن کی زبان سے قرآن یون کرتا ہے،

اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ، (فرقان - ۴)	یہ شخص (پیغمبری کا مدعی) تو ہم کو اپنے خداؤن (بتون) سے ہٹا ہی چکا تھا اگر ہم اُن پر صابر (ثابت) نہ رہتے،

یعنی اگر ہم اپنے مذہب پر مضبوط اور ثابت قدم نہ رہتے،

یہی مفہوم ایک اور آیت مین ہے، کفار آپس مین کہتے ہین ،

اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ، (ص - ۱)	کہ چلو اور اپنے خداؤن پر صبر کرو، (یعنی مضبوطی کیساتھ قائم رہو،)

عرب گنوار آنحضرت صلعم کے حجرہ کے سامنے آکر بدتمیزی سے آپ کو پکارتے تھے

ان سے کہا گیا کہ اتنی گھبراہٹ کیا تھی، ذرا ٹھہر جاتے،

وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ	اور اگر وہ ذرا صبر کرتے (یعنی ٹھہر جاتے)
اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ،	یہانتک کہ تم (اے رسول) نکل کر
(حجرات - ۱)	اُن کے پاس آتے تو ان کیلئے بہتر تھا

قرآن پاک میں صبر کا لفظ اسی ایک معنی میں مستعمل ہوا ہے، گو حالات کے تغیر سے اسکے مفہوم میں کہیں کہیں ذرا ذرا فرق پیدا ہو گیا ہے، با اِیں ہمہ ان سب کا مرجع ایک ہی ہے، یعنی ثابت قدمی اور استقامت، صبر کے یہ مختلف مفہوم جنمیں قرآن پاک نے اس کو استعمال کیا ہے، حسب ذیل ہیں،

وقت مناسب کا انتظار کرنا

پہلا یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا، آنحضرت صلعم نے جب شروع میں لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام کی تبلیغ پیش کی تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپ کی مخالفت میں سرگرم جولان ہو گیا، ہر طرف سے عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے، اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتیں اور رکاوٹیں پیش کیجانے لگیں، تو اس وقت بشریت کے اقتضا سے آپ کو اضطراب ہوا، اور کامیابی کی منزل دور نظر آنے لگی، اس وقت تسلی کا یہ پیام آیا کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہیں، آپ مستعدی سے اپنے کام میں لگے رہیں، خدا آپ کا نگہبان ہے، خدا کا فیصلہ اپنے وقت پر آئے گا، فرمایا،

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ	(اے رسول) تو اپنے پروردگار کے

فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا ،	فیصلہ کا ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، کیونکہ
(طور-۲)	تو ہماری آنکھون کے سامنے ہے ،
فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ	تو ثابت قدم رہ کر منتظر رہو، یہانتک کے
بَيْنَنَا ، (اعراف-۱۱)	خدا ہمارے درمیان فیصلہ کرے ،
وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ وَهُوَ	اور ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، یہانتک
خَيْرُ الْحَاكِمِيْنَ ،	کہ خدا فیصلہ کرے، وہ سب سے فیصلہ
(یونس-۱۱)	کرنے والون مین بہتر ہے ،
فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ	ثابت قدم رہ کر وقت کا منتظر رہ، بےشبہہ
(هود-۴)	آخر کار کامیابی پرہیزگارون ہی کی ہے ،

اس انتظار کی کشمکش کی حالت مین جب ایک طرف حق کی بیکسی، بیچارگی اور بےبسی پاؤن کو ڈگمگا رہی ہو، اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش اور ہنگامی غلبہ دلون کو کمزور کر رہا ہو، حق پر قائم رہ کر اس کی کامیابی کی پوری امید رکھنی چاہیے ،

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ	ثابت قدمی کے ساتھ منتظر رہ بیشک
(روم-۶ مومن-۶و۸)	خدا کا وعدہ سچا ہے ،

ایسا نہ ہو کہ وعدۂ الٰہی کے ظہور مین اگر ذرا دیر ہو تو مشکلات سے گھبرا کر حق کا ساتھ چھوڑ دو اور باطل کے گروہ مین مل جاؤ ،

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ	اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی

مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا،	سے منتظر رہ، اور ان (مخالفین میں)
(دھر - ۲)	سے کسی گنہگار یا کافر کا کہنا مان لے

آنحضرت صلعم کو حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ سنایا گیا کہ اُن کو خیال ہوا کہ اُن کی نافرمان قوم پر عذاب آنے مین تاخیر ہورہی ہے، اس لئے وہ بھاگ کھڑے ہوئے، حالانکہ ان کی قوم دل مین مسلمان ہوچکی تھی، اس لئے وہ عذاب اس سے ٹل گیا تھا، ارشاد ہوا کہ اے پیغمبر ان طرح تیرے ہاتھ سے صبر کا سررشتہ چھوٹنے نہ پائے،

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ	اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی
كَصَاحِبِ الْحُوْتِ،	کے ساتھ انتظار کر، اور مچھلی والے
(ن - ۲)	(یونس) کی طرح نہ ہو،

بے قرار نہونا صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے، کہ مصیبتون اور تکلیفون مین اضطراب اور بیقراری نہ ہو، بلکہ اُن کو خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی جھیلا جائے، اور یہ یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود ان کو دور فرما دے گا، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگون کی مدح فرمائی،

وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَا اَصَابَهُمْ، (حج - ۵)	اور جو مصیبت مین صبر کرین،

حضرت یعقوب علیہ السلام بیٹون سے یہ جھوٹی خبر سن کر کہ بھیڑیے نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کھا لیا، فرماتے ہین،

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ	بلکہ تمھارے دلون نے ایک بات

أَمْرًا، فَصَبْرٌ جَمِيلٌ، وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (یوسف-۲)

گھڑلی ہے، تو بہتر صبر ہے، اور خدا سے اس پر مدد چاہی جاتی ہے، جو تم بیان کرتے ہو،

پھر اپنے دوسرے بیٹے کے مصر میں روک لئے جانے کا حال سنکر کہتے ہیں،

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا (یوسف-۱۰)

بلکہ تمہارے دلوں نے گھڑلیا ہے تو بہتر صبر ہے، عنقریب خدا اُن سب کو ساتھ لائیگا،

حضرت ایوب علیہ السلام نے جسمانی اور مالی مصیبتوں کو جس رضا وتسلیم کے ساتھ پامردی سے برداشت کیا، اس کی مدح خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی،

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ، (ص-۴)

ہم نے بے شک ایوب کو صابر پایا کیسا اچھا بندہ، وہ خدا کی طرف رجوع ہونے والا تھا،

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اپنے شفیق اور مہربان باپ کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ کر فرماتے ہیں،

يَآ اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ، (صافات-۳)

اے باپ جو تجھے کہا جاتا ہے، وہ کرگذر، خدا نے چاہا تو مجھے صابروں میں سے پائے گا،

مشکلات کو خاطر مین نہ لانا

صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے، کہ منزلِ مقصود کی راہ مین جو مشکلین اور خطرے پیش آئین، دشمن جو تکلیفین پہنچائین، اور مخالفین جو طعن و طنز کرین، ان مین کسی چیز کو خاطر مین نہ لایا جائے، اور ان سے بددل اور پست ہمت ہونے کے بجائے اور زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو، بڑے بڑے کام کرنے والون کی راہ مین یہ روڑے اکثر اٹکائے گئے، مگر انھون نے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے، آنحضرت صلعم کو اسی لئے دوسری وحی مین جب تبلیغ اور دعوت کا حکم ہوا، تو ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آپ کو باخبر کردیا گیا،

يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ	اے چادر پوش! اٹھ اور لوگون کو
..... وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ	ہشیار کر، . . . . اور اپنے پروردگار
(مدثر-۱)	کے لئے پامردی (صبر) کر،

اس قسم کے مواقع اکثر انبیا علیہم السّلام کو پیش آئے، چنانچہ خود آنحضرت صلعم کو نبوت کی اس اعلیٰ مثال کی پیروی کا حکم ہوا،

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ	(اے محمد!) تو بھی اسی طرح پامردی
مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ	کر جس طرح پختہ ارادہ والے پیغمبرون
لَهُمْ ،	نے کی، اور ان (مخالفون) کے لئے
(احقاف-۴)	جلدی نہ کر،

امر بالمعروف

حضرت لقمانؑ کی زبان سے بیٹے کو یہ نصیحت سنائی گئی کہ حق کی دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف

اور نہی عن المنکر کا فرض پوری استواری سے ادا کر اور اس راہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں انکا مردانہ وار مقابلہ کر،

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ — نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور

الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ — جو مصیبت پیش آئے اس کو برداشت

إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (لقمان ۲) — کر، یہ بڑی پختہ باتوں میں سے ہے۔

کفار عذاب الٰہی کے جلد نہ آنے، یا حق کی ظاہری بیکسی و بے بسی کے سبب سے آنحضرت صلعم کو اپنے دلدوز طعنوں سے تکلیفیں پہنچاتے تھے، حکم ہوا کہ ان طعنوں کی پروا نہ کر، اور نہ ان سے دل کو اداس کر، بلکہ اپنے دھن میں لگا رہ، اور دیکھ کہ تجھ سے پہلے پیغمبروں نے کیا کیا،

اصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاذْكُرْ — ان کے کئے پر صبر کر، اور ہمارے بندے

عَبْدَنَا دَاوُودَ (ص-۲) — داؤد کو یاد کر،

اس قوتِ صبر کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ خدا سے لو لگائی جائے، اور اس کی طاقت پر بھروسہ کیا جائے،

فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ — تو ان کے کئے پر صبر کر، اور صبح شام اپنے

بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ (طہ ۸ و ق ۳) پروردگار کی حمد کر،

نہ صرف یہ کہ مخالفوں کے اس طعن و طنز کا دھیان نہ کیا جائے، بلکہ اس کے جواب میں ان سے لطف و مروت برتا جائے، فرمایا،

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ — ان کے کہے پر صبر کر، اور ان سے خوبصورتی

هَجْرًا جَمِیْلًا ۔ (مزمل-۱) سے الگ ہو جا،

درگذر کرنا صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنے والون کی برائی کو نظر انداز، اور جو بدخواہی سے پیش آئے، اور تکلیفین دے، اس کے قصور کو معاف کیا جائے یعنی تحمل اور برداشت مین اخلاقی پامردی دکھائی جائے، قرآن پاک کی کئی آیتون مین صبر اس مفہوم مین استعمال ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے،

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا	اور اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو
عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ	تکلیف دی گئی، اور البتہ اگر صبر (برداشت)
خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ، وَاصْبِرْ وَمَا	کرو تو صبر کرنے والون کے لئے یہ بہتر
صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ	ہے، اور تو صبر کر، اور تیرا صبر کرنا نہین
عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ	لیکن خدا کی مدد سے، اور ان کا غم نہ
مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ، (نحل-۱۶)	کر، اور نہ ان کی سازشون سے دلتنگ ہو

یہ صبر کی وہ قسم ہے جو اخلاقی حیثیت سے بہت بڑی بہادری ہے، مسلمانون کو اس بہادری کی تعلیم بار بار دی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ یہ صبر و برداشت کمزوری سے یا دشمن کے خوف سے، یا کسی اور سبب سے نہ ہو، بلکہ صرف خدا کے لئے ہو،

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ	اور جنھون نے اپنے پروردگار کی ذات
رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ	کے لئے صبر کیا، اور نماز کھڑی کی، اور
اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا	جو ہم نے اُن کو روزی دی اس مین سے

عَلَانِیَةً وَّیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ	چھپے اور علانیہ (راہِ خدا مین) خرچ کیا
السَّیِّئَةَ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عُقْبَی	اور برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہین، ان
الدَّارِ۔ (رعد-۳)	کے لئے آخرت کا انجام ہے،

فرشتے اُن کو مبارک باد دینگے اور کہین گے،

سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ	تم پر سلامتی ہو کیونکہ تم نے صبر کیا تھا تو
فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ۔ (رعد ۳)	آخرت کا انجام کیا اچھا ہوا،

ایک خاص بات اس آیت مین خیال کرنے کے لائق ہے، کہ اس کے شروع مین چند نیکیون کا ذکر ہے، صبر، نماز، خیرات، برائی کی جگہ بھلائی، مگر فرشتون نے اس مومن کے جس خاص وصف پر اس کو سلامتی کی دعا دی، وہ صرف صبر یعنی برداشت کی صفت ہے، کیونکہ یہی اصل ہے جس مین یہ جوہر ہوگا وہ عبادات کی تکلیف بھی اٹھائے گا، مصیبتون کو بھی جھیلے گا، اور دشمنون کی بدی کا جواب نیکی سے بھی دیگا، چنانچہ ایک اور آیت مین اس کی تشریح بھی کر دی گئی ہے کہ درگذر اور بدی کے بدلہ نیکی کی صفت اس مین ہوگی جسمین صبر ہوگا،

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا	بھلائی اور برائی برابر نہین، برائی کا
السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ	جواب اچھائی سے دو، تو یکبارگی
فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ	جس کے اور تمھارے درمیان دشمنی
عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ	ہے، وہ قریبی دوست سا ہو جائیگا
وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا	اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرتے

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ	ہیں، اور یہ اسی کو ملتی ہے جو بڑی
(فصلت-۵)	قسمت والا ہے،

جو لوگوں پر ظلم کرتے پھرتے ہیں، اور ملک میں ناحق فساد برپا کرتے رہتے ہیں، ان پر خدا کا عذاب ہوگا، اس لئے ایک صاحبِ عزم مسلمان کا فرض یہ ہے کہ دوسرے اس پر ظلم کریں تو بہادری سے اس کو برداشت کرے، اور معاف کردے، فرمایا،

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ	راستہ ان ہی پر ہے جو لوگوں پر ظلم
يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ	کرتے ہیں، اور ملک میں ناحق فساد
فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ	کرتے ہیں، یہی ہیں جن کے لئے پُردرد
لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَلَمَنْ	عذاب ہے، اور البتہ جس نے برداشت
صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ	کیا، اور بخش دیا، بے شک یہ بڑی
عَزْمِ الْاُمُوْرِ، (شوریٰ-۴)	ہمت کا کام ہے،

ثابت قدمی صبر کا پانچواں اہم مفہوم لڑائی پیش آجانے کی صورت میں میدانِ جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی ہے، قرآنِ پاک نے اس لفظ کو اس مفہوم میں بارہا استعمال کیا ہے، اور ایسے لوگوں کو جو اس وصف سے متصف ہوئے، صادق القول اور راستباز ٹھہرایا ہے، کہ انھوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا پورا کیا، فرمایا،

وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ	اور صبر کرنے والے (ثابت قدمی
وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ	دکھانے والے) مصیبت میں اور

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا	نقصان مین اور لڑائی کے وقت،
وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ،(بقرہ-۲۲)	وہی ہین جو سچ بولے، اور وہی پرہیزگار ہے،

اگر لڑائی آپڑے تو اس مین کامیابی کی چار شرطین ہین، خدا کی یاد، امام وقت کی اطاعت آپس مین اتحاد و موافقت، اور میدانِ جنگ مین بہادرانہ صبر و استقامت،

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمْ	اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ
فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْکُرُوا اللّٰہَ	مقابل ہو، تو ثابت قدم رہو، اور
کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ، وَ	اللہ کو بہت یاد کرو، تاکہ فلاح پاؤ،
اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا	اور خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری
تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ	کرو، اور آپس مین جھگڑو نہین، ورنہ
رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ	تم سست ہو جاؤ گے اور تمھاری
مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ،	ہوا اکھڑ جائے گی، اور صبر دکھاؤ،
(انفال-۶)	بیشک اللہ صبر کرنے والون کے ساتھ ہے

حق کے مددگارون کی ظاہری قلّتِ تعداد کی تلافی اسی صبر و ثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے تاریخ کی نظر سے یہ مشاہدے اکثر گذرے ہین کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادرون نے فوج کی فوج کو شکست دے دی ہے، اسلام نے یہ نکتہ اسی وقت اپنے جان نثارون کو سکھا دیا تھا جب ان کی تعداد تھوڑی اور دشمنون کی بڑی تھی،

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ	اے پیغمبر! ایمان والون کو دشمنون

عَلَى الْقِتَالِ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ	کی لڑائی پر ابھارو، اگر بیس صبر والے
عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا	(ثابت قدم) ہون تو دو سو پر غالب
مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ	ہون گے، اور اگر سو ہون تو کافرون
مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ	مین سے ہزار پر غالب ہون گے کیونکہ
كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ	وہ لوگ سمجھتے نہین، اب اللہ نے تم سے
اَلْآنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ	تخفیف کر دی، اور اس کو معلوم ہے
وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِنْ	کہ تم مین کمزوری ہے، تو اگر سو صبر والے
يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ	(ثابت قدم) ہون تو دو سو پر غالب
يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ	ہون گے، اور اگر ہزار (صبر والے)
مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ	ہون تو دو ہزار پر خدا کے حکم سے غالب
بِإِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ	ہون گے، اور اللہ صبر کرنے والون
الصَّابِرِينَ ، (انفال - ۹)	(ثابت قدمون) کے ساتھ ہے،

میدانِ کارزار مین مسلمانون کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تعدادی قلت کی پروا نہ کرین، اور صبر و ثبات کے ساتھ اپنے سے دوچند کا مقابلہ کرین، اور تسلی دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان ہی لوگون کے ساتھ ہوتی ہے، جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہین، حضرت طالوت اور جالوت کے قصہ مین بھی اسی نکتہ کو ان لفظون مین ادا کیا گیا ہے،

قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ	طالوت کے ساتھیون نے کہا کہ آج

بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالَ الَّذِیْنَ	ہم مین جالوت اور اُس کی فوج کے مقابلہ
یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ	کی طاقت نہین، انھون نے جن کو خیال
كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ	تھا کہ خدا سے ملنا ہے، یہ کہا کہ بسا اوقات
فِئَةً كَثِیْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ	تھوڑی تعداد کے لوگ خدا کے حکم سے
اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ، وَلَمَّا بَرَزُوْا	بڑی تعداد کے لوگون پر غالب آئے
لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ	ہین، اور خدا صبر و ثبات دکھانے
اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ	والون کے ساتھ ہے، اور جب یہ
اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ	جالوت اور اسکی فوج کے مقابلہ مین
الْكٰفِرِیْنَ ،	آئے، تو بولے اے ہمارے پروردگار
	ہم پر صبر بہا، اور ہم کو ثابت قدمی بخش
(بقرہ - ۳۲)	اور ان کافرون کے مقابلہ مین ہم کو

اللہ تعالیٰ نے کمزور اور قلیل التعداد مسلمانون کی کامیابی کی بھی یہی شرط رکھی ہے، اور بتا دیا ہے کہ خدا اُن ہی کا ہے، جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہین، اور خدا کے بھروسہ پر مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہین،

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا	پھر تیرا پروردگار ان کے لیے ہے جنھون نے
مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا	ایذا پانے کے بعد گھر بار چھوڑا، پھر لڑتے رہے
وَصَبَرُوْٓا ، (نحل - ۱۴)	اور صبر و ثبات کیساتھ ٹھہرے رہے"

دنیا کی سلطنت وحکومت ملنے کے لئے بھی اسی صبر واستقامت کے جوہر پیدا کرنے کی ضرورت ہے، بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکلنے کے بعد اطراف ملک کے کفار سے جب مقابلہ آپڑا، تو حضرت موسیٰ نے ان کو پہلا سبق یہ سکھایا،

قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا	موسیٰ نے اپنے لوگون سے کہا کہ خدا
بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ	سے مدد چاہو، اور صبر واستقامت
لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ	سے کام لو، بیشک زمین خدا کی ہے
عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ	وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندون
	مین سے اس کا مالک بناتا ہے، اور
(اعراف - ۱۵)	انجام پرہیزگارون کے لئے ہے،

چنانچہ بنی اسرائیل مصر وشام وکنعان کی آس پاس بسنے والی بت پرست قومون سے تعداد مین بہت کم تھے، لیکن جب انھون نے ہمت دکھائی، اور بہادرانہ استقامت اور صبر اور ثابت قدمی سے مقابلے کئے تو ان کی ساری مشکلین حل ہوگئین، اور کثیر التعداد دشمنون کے نرغہ مین پھنسے رہنے کے باوجود ایک مدت تک خود مختار سلطنت پر قابض اور دوسری قومون پر حکومت کرتے رہے، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس کامیابی کا راز اسی ایک لفظ صبر مین ظاہر کیا ہے، فرمایا

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ	اور ان لوگون کو جو کمزور سمجھے جاتے
كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ	تھے، اس زمین کی وراثت بخشی جسمین

الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا	ہم نے برکت نازل کی ہے، اور تیرے
فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ	پروردگار کی اچھی بات بنی اسرائیل
الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ	کے حق مین اُن کے صبر و ثبات کے
بِمَا صَبَرُوا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ	سبب سے پوری ہوئی، اور ہم نے فرعون
يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا	اور اس کی قوم کے کامون کو اور
كَانُوا يَعْرِشُونَ ۔ (اعراف-۱۶)	تعمیرون کو برباد کر دیا،

اس سے ظاہر ہوا کہ بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم فرعون جیسی طاقت کے سامنے اسلئے سربلند ہوئی کہ ان نے صبر اور ثابت قدمی سے کام لیا، اور اسی کے نتیجہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کو شام کی بابرکت زمین کی حکومت عطا فرمائی، چنانچہ اسی کی تصریح اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے موقع پر فرمائی،

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً	اور بنی اسرائیل مین سے ہم نے ایسے
يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا	پیشوا بنائے، جو ہمارے حکم سے راہ
وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ،	دکھاتے تھے، جب انھون نے
(سجدہ ۲۱-۳)	صبر کیا اور ہمارے حکمون پر یقین

آیتِ بالا نے بنی اسرائیل کی گذشتہ پیشوائی کے دو سبب بیان کئے ہین، ایک احکامِ الٰہی پر یقین، اور دوسرے ان احکام کی بجاآوری مین صبر اور ثباتِ قدم، یہی دو باتین دنیا کی ہر قوم کی ترقی کا سنگِ بنیاد ہین، پہلے اپنے اصول کے صحیح ہونے کا بشدّت یقین، اور پھر اُن اصول کی تعمیل مین ہر قسم کی تکلیفون اور مصیبتون کو خوشی خوشی جھیل لینا،

غزوۂ احد میں مسلمانوں کو فتح نہیں ہوتی، بلکہ ستر مسلمان خاک وخون میں لتھڑ کر راہِ خدا میں جانیں دیتے ہیں بعض مسلمانوں میں اس سے افسردگی پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اُن کے اس حزن وملال کے ازالہ کے لئے پچھلے پیغمبروں کی زندگی کی روداد اُن کو سناتا ہے،

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ	اور کتنے پیغمبر ہیں جن کے ساتھ ہوکر
رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا	بہت سے خدا کے طالب لڑے ہیں
لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	پھر خدا کی راہ میں تکلیف اٹھاکر انھوں
وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ	نے ہمت نہیں ہاری، اور نہ ان کے
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ، وَ	دل بودے ہوئے، اور اللہ ثابت
مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا	رہنے والوں (صابرین) کو دوست
رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ	رکھتا ہے، اور وہ یہی کہتے رہے کہ
اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ	اے ہمارے پروردگار ہمارے
اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى	گناہوں کو اور کام میں ہماری زیادتی
الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ،	کو معاف کر، اور ہمارے قدم ثابت
(اٰل عمران - ۱۵)	رکھ، اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر

اس آیت پاک نے غلط فہمیوں کے اُن تو بر تو پردوں کو چاک کر دیا ہے جو صبر کی اصل حقیقت کے چہرہ پر پڑے ہیں، اور بتا دیا کہ صبر دل کی کمزوری، بےبسی کی خاموشی اور بیکسی کے مجبورانہ درگذر کا نہیں، بلکہ دل کی انتہائی قوت، ہمت کی بلندی، عزم کی استواری

اور مشکلات اور مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر مین نہ لانے کا نام ہے، ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثون کے پیش آجانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو، ہمت نہ ہارے اور اپنے مقصد پر جما رہے، اور خدا سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گذشتہ ناکامی کے قصور کو جو اسی کی کمی (ذنب) یا زیادتی (اسراف) سے سرزد ہوا ہے معاف فرمائے، اور اس کو مزید ثباتِ قدم عطا کرکے حق کے دشمنون پر کامیابی بخشے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے حصول کے لئے مسلمانون کو دو باتون کی تاکید فرمائی، ایک تو خدا کی طرف دل لگانا اور دوسرے مشکلات پر صبر و استقامت سے قابو پانا،

دنیا کی فتحیابی کے ساتھ آخرت کا عیش بھی جس کا نام جنت ہے اُن ہی کے حصہ مین ہے جن کو یہ پامردی، دل کی مضبوطی، اور حق پر ثباتِ قدم کی دولت ملی، حق کی راہ مین مشکلات کے پیش آنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اُن سے کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے، اور دونون الگ الگ معلوم ہونے لگتے ہین، چنانچہ فرمایا،

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ	کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت مین چلے جاؤگے،
وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا	اور ابھی اللہ نے (آزما کر) ان کو
مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ،	الگ نہین کر دیا جو لڑنے والے
(آل عمران - ۱۴)	ہین اور جو ثابت قدم (صابر) ہین،

ضبطِ نفس اشخاص اور قومون کی زندگی مین سب سے نازک موقع وہ آتا ہے، جب وہ کسی بڑی کامیابی یا ناکامی سے دوچار ہوتی ہین، اس وقت نفس پر قابو رکھنا، اور ضبط سے کام لینا مشکل

ہوتا ہے، مگر یہی ضبطِ نفس کا اصلی موقع ہوتا ہے، اور اسی سے اشخاص اور قوموں میں سنجیدگی، متانت، وقار، اور کیرکٹر کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے،

دنیا میں غم و مسرت اور رنج و راحت توام ہیں، ان دونوں موقعوں پر انسان کو ضبطِ نفس اور اپنے آپ پر قابو کی ضرورت ہے یعنی نفس پر اتنا قابو ہو کہ مسرت اور خوشی کے نشہ میں اس میں فخر و غرور پیدا نہ ہو، اور غم و تکلیف میں وہ اُداس اور بددل نہ ہو، دل کے ان دونوں عیبوں کا علاج صبر و ثبات اور ضبطِ نفس ہے، انسانی فطرت کے رازدار کا کہنا ہے،

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا	اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے
رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ	کسی مہربانی کا مزہ چکھائیں، پھر اس سے
اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ، وَلَئِنْ	اس کو اتار لیں تو وہ نا اُمید اور ناشکرا
اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ	ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی مصیبت کے
مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ	بعد اس کو نعمت کا مزہ چکھائیں، تو
السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ	کہتا ہے کہ برائیاں مجھ سے دور
فَخُوْرٌ، اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا	ہو گئیں، بے شک وہ شادان اور
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ	نازاں ہے، لیکن وہ جنھوں نے صبر
لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ	(یعنی نفس پر قابو) رکھا اور اچھے
(ھود - ۲)	کام کئے، یہ لوگ ہیں جن کے لئے
	معافی اور بڑا انعام ہے،

ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا	ہنگامی واقعات اور وقتی مشکلات پر صبر و پامردی سے بڑھکر ایک سخت کروہ صبر ہے جو کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی

سے ادا کرنے مین ظاہر ہوتا ہے، اسی لئے مذہبی فرائض و احکام کو جو بہر حال نفس پر سخت گذرتے ہین، عمر بھر پوری مضبوطی سے ادا کرتے رہنا بھی صبر ہے، ہر حال، اور ہر کام مین خدا کے حکم کی فرمانبرداری، اور عبودیت پر ثبات نفس انسانی کا سب سے بڑا امتحان ہے، اسی لئے حکم ہوا،

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمانون کا پروردگار، اور زمین کا
وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ	اور جوان دونون کے بیچ مین ہے
لِعِبَادَتِهٖ،	سب کا، تو اس کی بندگی کر، اور اسکی
(مریم۔۴)	بندگی پر ٹھہرا رہ (صبر کر)

ایک اور آیت مین نماز پڑھتے رہنے اور اپنے اہل و عیال پر بھی اس کی تاکید رکھنے کے سلسلہ مین ہے،

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ	اور اپنے گھر والون کو نماز کا حکم کر اور
وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا، (طٰہٰ۔۸)	آپ اس پر قائم رہ،

یعنی تمام عمر یہ فریضہ پابندی کے ساتھ ادا ہوتا رہے،

حسب ذیل آیتون مین غالباً صبر اسی مفہوم مین ہے، وہ لوگ جو خدا کے سامنے حاضری کے دن سے ڈرا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ اُن کو خوشخبری سناتا ہے،

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ	تو اللہ نے ان کو اس دن کی برائی سے

وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا	بچا لیا اور اُن کو ترو تازگی وشادمانی
وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً	سے ملایا، اور اُن کے صبر کرنے (یعنی
وَّحَرِيْرًا	احکامِ الٰہی پر ٹھہرے رہنے) کے
(دھر-۱)	سبب سے باغ اور ریشمی لباس بدلہ میں دیا

وہ لوگ جو خدا کی بارگاہ میں توبہ کریں، ایمان لائیں، نیک کام کریں، فریب کے کاموں میں شریک نہ ہوں، بیہودہ اور لغو کاموں کے سامنے سے ان کو گذرنا پڑے تو بزرگی کے رکھ رکھاؤ سے گذر جائیں، اور خدا کی باتوں کو سنکر اطاعت مندی سے اس کو قبول کریں اور اپنی اولاد کی بہتری اور پیشوائی کی دعائیں مانگیں، اُن کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم کی یہ بشارت سناتا ہے

أُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ	ان کو بہشت کا جھروکہ بدلہ میں ملیگا
بِمَا صَبَرُوْا، (فرقان-۶)	کہ وہ صبر کرتے رہے،

ان دونوں آیتوں میں صبر کا مفہوم یہی ہے کہ نیک کاموں کو بار خاطر، خلاف طبع اور تکلیف ومشقت ہونے کے باوجود خوشی خوشی عمر بھر کرتے رہے، اور بری باتوں سے باوجود اس کے کہ ان میں ظاہری خوشی اور آرام ہے، بچتے رہے، راتوں کو نرم بستروں سے اُٹھ کر خدا کے آگے سربسجود ہونا، صبح کو خوابِ سحر کی لذت سے کنارہ کش ہو کر دوگانہ ادا کرنا، الوانِ نعمت کی لذتوں سے محروم ہو کر روزے رکھنا، تکلیف ومشقت ہونے کے باوجود خطرناک موقعوں پر بھی سچائی سے باز نہ آنا، قبولِ حق کی راہ میں شدائد کو آرام وراحت جان کر جھیل لینا، سود کی دولت سے ہاتھ اٹھا لینا، حسن وجمال کی بے قید لذت سے متمتع نہ ہونا، غرض شریعت کے

احکام کی بجا آوری اور پھر اس پر عمر بھر استواری اور پائداری، صبر کی بہت ہی کڑی منزل ہے اور اسی لئے ایسے صابرون کی جزا بھی خدا کے ہان بھاری ہے،

ان آیاتِ پاک کی اس تشریح مین وہ حدیث یاد آتی ہے جسمین آنحضرت صلعم نے فرمایا،

حجبت (حُفّتِ) الجنّۃ بالمکارہ	جنت ناخوشی کے کامون، اور دوزخ
وحجبت (حفّتِ) النّارُ بالشہوات	نفسانی لذتون کے کامون سے ڈھانپی
(صحیح بخاری کتاب الرقاق وصحیح مسلم)	گئی ہے،

یعنی نیکی کے ان کامون کا کرنا جن کا معاوضہ جنت ہے، اس وقت دنیا مین نفس پر شاق گذرتا ہے اور گناہون کے وہ کام جن کی سزا دوزخ ہے، اس وقت دنیا مین بڑے پر لطف اور لذت بخش معلوم ہوتے ہین، اس عارضی وہنگامی ناخوشی یا خوشی کی پروا کئے بغیر احکام الٰہی کی پیروی کرنا بڑے صبر اور برداشت کا کام ہے، کسی قارون کے خزانہ مال و دولت کی فراوانی اور اسبابِ عیش کی ٹھاٹ کو دیکھ کر اگر کسی کے منھ مین پانی نہ بھر آئے، اور اس وقت بھی مالِ حرام کی کثرت کے لالچ کے بجائے مالِ حلال کی قلت کو صبر کر کے خوشی کے ساتھ برداشت کرلے، تو یہ بڑی قوت کا کام ہے، جو صرف صابرون کو ملی ہے،

حضرت موسیٰؑ کے زمانہ مین جو قارون تھا، اس کے مال و دولت کو دیکھ کر بہت سے ظاہر پرست لالچ مین پڑ گئے، لیکن جنہین صبر و برداشت کا جوہر تھا اُن کی چشم بینا اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی، اور اُن کو نظر آتا تھا کہ یہ فانی اور آنی جانی چیز کے دن کی ہے، خدا کی وہ دولت جو نکوکارون کو بہشت مین ملیگی، وہ لازوال، غیر فانی اور جاودانی ہے،

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ
مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ
عَظِيْمٍ، وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ
لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا
يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ،

(قصص - ۸)

جو لوگ حیات دنیاوی کے
خواہان تھے وہ بولے اے کاش ہمارے
پاس بھی وہ ہوتا جو قارون کو دیا گیا
وہ بڑا خوش قسمت ہے، اور جنھین علم
ملا تھا انھون نے کہا، تمھارا برا ہے
اللہ کی جزا ان کے لئے جو ایمان لایا
اور نیک کام کئے سب سے اچھی چیز
ہے، اور اس حقیقت کو وہی پا سکتے
ہین جو صابر ہین،

یہ اجر اور جزا بہتر سے بہتر ہوگی، کیونکہ یہ اس خزانے سے ملیگی جو لازوال اور باقی ہے،

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ
بَاقٍ، وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا
اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

(نحل - ۱۲)

جو تمھارے پاس ہے وہ چک جائیگا، اور
جو خدا کے پاس ہے وہ رہنے والا ہے
اور یقیناً ہم ان کو جنھون نے صبر کیا انکی
مزدوری ان کے بہتر کامون پر دینگے

ایک اور جگہ فرمایا کہ نمازین ادا کیا کرو، کہ نیکیان بدیون کو دھو دیتی ہین، اس پیغام مین نصیحت
قبول کرنے والون کے لئے نصیحت اور یاد دہانی ہے، اس کے بعد ہے،

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ

اور صبر کر کہ بے شبہہ اللہ نیک کام

اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ، (ھود - ۱۰)	کرنے والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا

صبر کے فضائل اور انعامات | یہ مزدوری کیا ہوگی؟ یہ حد اور شمار سے باہر ہوگی،

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ	صبر کرنے والوں کو تو اُن کی مزدوری
بِغَیْرِ حِسَابٍ ، (زمر - ۲)	بے حساب ملیگی،

جن محاسن اور محامد صفات، اور اعلیٰ اخلاق کا درجہ اس دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ اُن میں صبر و برداشت کا بھی شمار ہے،

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ	بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں
وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ	اور ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں اور
وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَ	بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے
الصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ	والی عورتیں، اور محنت سہنے والے مرد
وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَ	(صابرین) اور محنت سہنے والی عورتیں
الْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ	(صابرات)، اور (خدا کے سامنے) جھکنے
وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ	والے مرد اور جھکنے والی عورتیں اور
وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ	خیرات کرنے والے مرد اور خیرات
وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ وَ	کرنے والی عورتیں، اور روزہ دار
الْحٰفِظٰتِ وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ	مرد اور روزہ دار عورتیں، اور اپنی
کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰہُ	شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے

لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا

مرد اور حفاظت کرنے والی عورتین اور خدا کو بہت یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتین، اللہ نے اُن کیلیے تیار رکھی ہے معافی اور بڑی مزدوری،

(احزاب - ۵)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صبر کا مرتبہ بڑی بڑی نیکیون کے برابر ہے، اس سے انسان کی پچھلی غلطیان حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہین، اور وہ دین و دنیا کی بڑی سے بڑی مزدوری اُس کے معاوضہ مین ملتی ہے، یہی بشارت ایک اور آیت مین بھی ہے،

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ

(جنت اور خدا کی خوشنودی ان کو حاصل ہو گی) جو کہتے ہین کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لا چکے، ہمارے گناہون کو معاف کر اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، اور صبر کرنے والے (یعنی مشکلات کی محنت کو اٹھا لینے والے) اور سچ بولنے والے اور بندگی مین لگے رہنے والے اور (خدا کی راہ مین) خرچ کرنے والے اور پچھلی راتون کو خدا سے اپنے گناہون کی معافی مانگنے والے،

(آل عمران - ۲)

اس آیت مین ایک عجیب نکتہ ہے، اس خوش قسمت جماعت کے اوصاف کا آغاز بھی دعا سے اور خاتمہ بھی دعا پر ہے، اور ان دونون کے بیچ مین اُن کے چار اوصاف گنائے ہین، جن مین پہلا درجہ صبر یعنی محنت سہارنے، تکلیف جھیلنے، اور پامردی دکھانے کا ہے، دوسرا راستی اور راست بازی کا، تیسرا خدا کی بندگی وعبودیت کا، اور چوتھا راہِ خدا مین خرچ کرنے کا،

فتحِ مشکلات کی کنجی، صبر اور دعا

بعض آیتون مین ان تمام اوصاف کو صرف دو لفظون مین سمیٹ لیا گیا ہے، دعا، اور صبر، اور فرمایا گیا ہے کہ یہی دو چیزین مشکلات کے طلسم کی کنجی ہین،

یہود جو آنحضرت صلعم کے پیغام کو قبول نہین کرتے تھے، اس کے دو سبب تھے، ایک یہ کہ ان کے دلون مین گداز اور تاثر نہین رہا تھا، اور دوسرے یہ کہ پیغامِ حق قبول کرنے کے ساتھ اُن کو جو جانی ومالی دشواریان پیش آتین، یہ عیش وعشرت اور ناز ونعمت کے خوگر ہو کر، اُن کو برداشت نہین کرسکتے تھے، اسی لئے محمد رسول اللہ صلعم کی طبِ روحانی نے ان کی بیماری کے لئے یہ نسخہ تجویز کیا،

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ	اور صبر (محنت اٹھانے) اور دعا مانگنے
(بقرہ - ۵)	سے قوت پکڑو،

دعا سے اُن کے دل مین اثر، اور طبیعت مین گداز پیدا ہوگا اور صبر کی عادت سے قبولِ حق کی راہ کی مشکلین دور ہون گی، ہجرت کے بعد جب قریش نے مسلمانون کے برخلاف تلوار اٹھائین، اور مسلمانون کے ایمان کے لئے اخلاص کی ترازو مین تلنے کا وقت آیا تو یہ آیتین نازل ہوئین

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا	اے ایمان والو! صبر (ثابت قدمی)
بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ إِنَّ اللّٰهَ	اور دعا سے قوت پکڑو، بیشک اللہ

مَعَ الصّٰبِرِيْنَ، وَلَا تَقُوْلُوْا
لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ
لَّا تَشْعُرُوْنَ، وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ
بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ
نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ
وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ
الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ
قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ
اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ
رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ق وَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ، (البقرہ-۱۹)

صبر والون (ثابت قدم رہنے والون)
کے ساتھ ہے، اور جو خدا کی راہ مین مارے
جاتے ہین، ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ زندہ
ہین لیکن تم کو خبر نہین، اور ہم تم کو کسی
قدر خطرہ، اور بھوک اور مال و جان
اور پیداوار کے کچھ نقصان سے آزمائینگے
اور صبر والون (یعنی ثابت قدم رہنے
والون) کو خوشخبری سنادو، جن کو جب
کوئی مصیبت پیش آئے تو کہیں کہ ہم
اللہ کے ہین، اور ہم کو اللہ ہی کے پاس
لوٹ کر جانا ہے، یہ لوگ ہین، اُن پر
ان کے پروردگار کی شاباشین اور

مسلمانانِ ہند اور مصیبت کے ایام

ان آیات نے بتایا کہ مسلمانون کو کیونکر زندہ رہنا چاہیئے، جان و مال کی جو مصیبت پیش آئے اسکو صبر، ضبطِ نفس، اور ثابت قدمی سے برداشت کرین، اور یہ سمجھین کہ ہم خدا کے محکوم ہین، آخر بازگشت اسی کی طرف ہو گی، اس لیئے حق کی راہ مین مرنے اور مال و دولت کو لٹانے سے ہم کو دریغ نہ ہونا چاہیئے، اگر اس راہ مین موت بھی آجائے تو وہ حیاتِ جاوید کی بشارت ہی ہے،



وَکُنْ مِّنَ الشّٰکِرِیْنَ (اعراف - ۱۷)

لغت میں شکر کے اصلی معنی یہ ہیں کہ "جانور میں تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی تروتازگی پوری ہو اور دودھ زیادہ دے"۔ اس سے انسانوں کے محاورہ میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کر دے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے، یہ قدرشناسی تین طریقوں سے ہو سکتی ہے دل سے زبان سے اور ہاتھ پاؤں سے یعنی دل میں اس کی قدرشناسی کا جذبہ ہو زبان سے اس کے کاموں کا اقرار ہو اور ہاتھ پاؤں سے اس کے ان کاموں کے جواب میں ایسے افعال صادر ہوں جو کام کرنے والے کی بڑائی کو ظاہر کریں۔

شکر کی نسبت جس طرح بندوں کی طرف کیجاتی ہے، خدا نے قرآنِ پاک میں اپنی طرف بھی کی ہے، اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ذرا ذرا سے کاموں کی پوری قدر کرتا ہے، اور اُن کو ان کا پورا بدلہ عطا فرماتا ہے،

شکر کا الٹا کفر ہے، اس کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں، اور محاورہ میں کسی کے کام یا احسان

پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل سے اس کے اقرار، اور عمل سے اس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں اسی سے ہماری زبان میں "کفرانِ نعمت" کا لفظ استعمال میں ہے،

یہی کفر وہ لفظ ہے جس سے زیادہ کوئی برا لفظ اسلام کے لغت میں نہیں، اللہ پاک کے احسانوں اور نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا، زبان سے اُن کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا کفر ہے، جس کے مرتکب کا نام کافر ہے،

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح کفر اسلام کی نگاہ میں بدترین خصلت ہے، اس کے بالمقابل شکر سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے، قرآنِ پاک میں یہ دونوں لفظ اسی طرح ایک دوسرے کے بالمقابل بولے گئے ہیں،

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا	ہم نے انسان کو راستہ بتا دیا، (اب وہ)
شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ، (دھر-۱)	یا شکر گذار (شاکر) ہو، یا ناشکرا (کافر)
لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ	اگر تم نے شکر کیا تو ہم تمھیں بڑھائیں گے
وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ	اور اگر ناشکری (کفر) کی تو بیشک میرا
لَشَدِيْدٌ ، (ابراھیم-۲)	عذاب بہت سخت ہے،

اس تقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ تعالیٰ کے احسانوں اور نعمتوں کی ناقدری کر کے اس کی نافرمانی کا نام ہے، تو اس کے مقابلہ میں شکر کی حقیقت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے احکام کی اطاعت اور دل سے فرمانبرداری کیجائے حضرت ابراہیمؑ کی نسبت اللہ پاک کی شہادت ہے،

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً	دراصل ابراہیم دین کی راہ ڈالنے والا
قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا وَّلَمْ یَكُ	اور اللہ کا فرمانبردار، اس کو ایک ماننے
مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ	والا تھا اور شرک کرنے والون مین
اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ	سے نہ تھا، اللہ کے احسانون اور نعمتون
مُّسْتَقِیْمٍ ،	کا شکر گذار، اللہ نے اس کو چن لیا، اور
(نحل - ۱۶)	اس کو سیدھی راہ دکھائی ،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتون اور احسانون کی شکر گذاری یہ ہے کہ دین کی راہ اختیار کیجائے، احکامِ الٰہی کی پیروی کیجائے، اور شرک سے پرہیز کیا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا ہم کو قبول فرمائے گا اور ہر علم و عمل مین ہم کو سیدھی راہ دکھائے گا،

اس تفصیل سے پتہ چلا کہ شکر ایمان کی جڑ، دین کی اصل اور اطاعتِ الٰہی کی بنیاد ہے، یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر بندہ کے دل مین اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت پیدا ہونی چاہئے، اور اسی قدر و عظمت اور محبت کے قولی و عملی اظہار کا نام شکر ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

مَا یَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ	اگر تم شکر کرو، اور ایمان لاؤ تو خدا تم کو
شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ	عذاب دے کر کیا کرے گا، اور اللہ تو
شَاكِرًا عَلِیْمًا ، (نساء - ۲۱)	قدر پہچاننے والا اور علم رکھنے والا ہے،

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندون سے صرف دو باتین چاہتا ہے، شکر اور ایمان، ایمان کی حقیقت تو معلوم ہے، اب رہا شکر تو شریعت مین جو کچھ ہے وہ شکر کے دائرہ مین داخل ہے، ساری عبادتین

شکر ہیں، بندون کے ساتھ حسنِ سلوک اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے، دولتمند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ مین دیتا ہے، تو یہ دولت کا شکر ہے، صاحبِ علم اپنے علم سے بندگانِ الٰہی کو فائدہ پہنچاتا ہے تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے، طاقتور، کمزورون کی امداد اور اعانت کرتا ہے تو یہ بھی قوت وطاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے، الغرض شریعت کی اکثر باتین اسی ایک شکر کی تفصیلین ہین اسی لئے شیطان نے جب خدا سے یہ کہنا چاہا کہ تیرے اکثر بندے تیرے حکموں کے نافرمان ہونگے تو یہ کہا،

وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ۔ (اعراف-۲) اور تو ان مین سے اکثر کو شکر کرنے والا نہ پائے گا،

خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندون کو جزا دیتے ہوئے اسی لفظ سے یاد فرمایا،

وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ، (آل عمران) اور ہم شکر کرنے والے کو جزا دینگے،

پوری شریعت کا حکم اللہ تعالیٰ ان لفظون مین دیتا ہے،

بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ، وَكُنْ مِّنَ الشَّاكِرِينَ، (زمر-۷) بلکہ اللہ کی بندگی کر اور شکر گذارون مین سے ہو،

شکر کے اس جذبہ کو ہم کبھی زبان سے ادا کرتے ہین، کبھی اپنے ہاتھ پاؤن سے پورا کرتے ہین، کبھی اُس کا بدلہ دے کر اس قرض کو اُتارتے ہین، زبان سے اس فرض کے ادا کرنے کا نام اللہ تعالیٰ کے تعلق سے قرآن کی اصطلاح مین حمد ہے، جس کے مطالبہ سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے اور یہی سبب ہے کہ حمدِ الٰہی مین اللہ تعالیٰ کے اُن صفاتِ کاملہ کا ذکر ہوتا ہے جو ان احسانون

اور نعمتوں کی پہلی اور اصلی محرک ہیں، اور اسی لئے یہ کہنا چاہئے کہ جس طرح سارے قرآن کا نچوڑ سورۂ فاتحہ ہے، سورۂ فاتحہ کا نچوڑ خدا کی حمد ہے، اسی بنا پر قرآنِ پاک کا آغاز سورۂ فاتحہ سے، اور سورۂ فاتحہ کا آغاز الحمد سے ہے،

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، (فاتحہ-۱) سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے

جہان اور جہان میں جو کچھ رنگ برنگ کی مخلوقات اور عجائبات ہیں، سب کی پرورش، اور زندگی اور بقا، اسی ایک کا کام ہے، اسی کے سہارے وہ جی رہے ہیں، اور نکھر رہے ہیں، اس لئے حمد اسی ایک کی ہے، یہ تو دنیا کے نیرنگِ قدرت کا آغاز ہے، لیکن دنیا جب اپنی تمام منازلِ حیات کو طے کرکے فنا ہو چکے گی، اور یہ موجودہ زمین اور آسمان اپنا فرض ادا کرکے نئی زمین اور نئے آسمان کی صورت میں ظاہر ہو چکیں گے، پہلی دنیا کے عمل کے مطابق ہر شخص اس دوسری دنیا میں اپنی زندگی پا چکے گا، یعنی نیک اپنی نیکی کی جزا اور بد اپنی بدی کی سزا پا چکیں گے اور اہلِ جنت جنت میں اور اہلِ دوزخ دوزخ میں جا چکیں گے، تو وہ وقت ہوگا، جب دنیا اپنے اُس نظام یا دورہ کو پورا کر چکی ہوگی، جس کے لئے خدا نے اس کو بنایا تھا، اس وقت عالمِ امکان کے ہر گوشہ سے یہ سریلی آواز بلند ہوگی،

وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (زمر-۱) سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے

حمد کا ترانہ موجودہ دنیا کے ایک ایک ذرہ سے آج بھی بلند ہے،

لَہُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (روم-۲) اسی کی حمد آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے،

فرشتے بھی اسی حمد مین مشغول ہین،

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ	جو عرش کو اٹھائے ہین، اور جو اس کے
مَنْ حَوْلَہٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ	چارون طرف ہین وہ اپنے پروردگار
رَبِّھِمْ، (مومن-۱)	کے حمد کی تسبیح کرتے ہین،

بلکہ عرصۂ وجود کی ہر چیز اس کی حمد و تسبیح مین لگی ہوئی ہے،

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ	اور کوئی چیز نہین جو اس (خدا) کی حمد کی
(بنی اسرائیل-۵)	تسبیح نہ کرتی ہو،

یہی شکرانہ کی حمد و تسبیح ہے، جس کا مطالبہ انسانون سے ہے،

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ، (حجر، طٰہٰ، مومن، طور، فرقان)	اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر،

آنحضرت صلعم کے سنن اور شمائل مین ہر وقت اور ہر موقع کی اس کثرت سے جو دعائین ہین مثلاً کھانا کھانے کی، نئے کپڑے پہننے کی، سونے کی، سو کر جاگنے کی، نئے پھل کھانے کی، مسجد مین جانے کی، طہارت خانہ سے نکلنے کی، وغیرہ وغیرہ ان سب کا منشا اللہ تعالیٰ کی ان نعمتون کی حمد اور زبان سے اُس کا شکریہ ادا کرنا ہے، لیکن زبان کا یہ شکریہ دل کا ترجمان اور قلبی کیفیت کا بیان ہونا چاہئے،

اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو جسمانی نعمتین عنایت فرمائی ہین، اُن کا شکریہ یہ ہے، کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤن کو خدا کے حکمون کی تعمیل مین لگا رکھین، اور اُن سے اُن کی خدمت کرین جو اس جسمانی نعمت کے کسی جز سے محروم ہین، مثلاً جو اپاہج اور معذور ہون، بیمار ہون، کسی جسمانی قوت سے

محروم ہون، یا کسی عضو سے بیکار ہون، مالی نعمتون کا شکریہ یہ ہے کہ جو اس نعمت سے بے نصیب ہون، اُن کو اس سے حصہ دیا جائے، بھوکون کو کھانا کھلایا جائے، پیاسون کو پانی پلایا جائے، ننگون کو کپڑا پہنایا جائے، بے سرمایون کو سرمایہ دیا جائے،

قرآن پاک کی مختلف آیتون مین مختلف نعمتون کے ذکر کے بعد شکر الٰہی کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس لئے ہر آیت مین اس شکر کے ادا کرنے کی نوعیت اسی نعمت کے مناسب ہوگی، مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے،

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ	بڑی برکت اسکی ہے جس نے آسمان مین
بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا	برج بنائے، اور اس مین ایک چراغ
وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا، وَهُوَ الَّذِيْ	اور اجالا کرنے والا چاند رکھا اور اسی
جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً	نے رات اور دن بنایا کہ ایک کے بعد ایک
لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ	آتا ہے، اس کے واسطے جو دھیان رکھنا
شُكُوْرًا، (فرقان-۶)	یا شکر کرنا چاہے،

اس مین اپنی قدرت کی نعمتون کا ذکر کر کے شکر کی ہدایت ہے، یہ شکر اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس قدرت والے کی قدرت تسلیم کرین، اور دن کی روشنی اور چاند کے اجالے اور رات کے سکون مین ہم وہ فرض ادا کرین جس کے لئے یہ چیزین ہم کو بنا کر دی گئی ہین، دوسری آیتون مین ہے

..... الرَّحِيْمُ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ	بڑے رحم والا جس نے خوب بنائی جو چیز
كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ	بنائی، اور انسان کی پیدائش ایک گارے

الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ، ثُمَّ	سے شروع کی، پھر اس کی اولاد کو بے قدر
جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ	سے نچڑے ہوئے پانی سے بنایا، پھر
مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ ، ثُمَّ سَوَّاهُ	اس کو درست کیا، اور اس مین اپنی
وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ وَجَعَلَ	روح سے کچھ پھونکا، اور تمھارے
لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ	کان، اور آنکھین اور دل بنا دیئے
وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ (سجدہ ۱)	تم کم شکر کرتے ہو،
وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ	اور اللہ نے تم کو تمھاری ماؤن کے
أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا	پیٹوں سے باہر نکالا، تم کچھ جانتے نہ
وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ	تھے، اور تمھارے لئے کان اور
وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (نحل ۱۱)	آنکھین اور دل بنائے تاکہ تم شکر کرو

ان آیتون مین خلقتِ جسمانی کی نعمت کا بیان، اور اس پر شکر کرنے کی دعوت ہے، یعنی دل سے خدا کے ان احسانات کو مان کر اس کی ربوبیت و کبریائی اور یکتائی کو تسلیم کرین اور یہ سمجھین کہ جس نے یہ زندگی دی، اور اس زندگی مین ہم کو یون بنا دیا، وہ ہمارے مرنے کے بعد دوسری زندگی بھی ہم کو دے سکتا ہے، اور اس مین بھی ہم کو یہ کچھ عنایت کر سکتا ہے اور پھر ہاتھ پاؤن سے اور آنکھ کان سے اس کے ان احسانات کا جسمانی حق ادا کرین، بعض اور آیتون مین ہے،

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ	تو ان جانورون کے گوشت مین سے

وَالْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا	کچھ آپ کھاؤ، اور کچھ اُن کو کھلاؤ جو صبر
لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ،	سے بیٹھا ہے یا محتاجی سے بے قرار ہو،
	اسی طرح ہم نے وہ جانور تمھارے قابو
(حج - ۵)	مین دیے ہین، تاکہ تم شکر کرو،
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ	اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو روزی
طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا	دی پاک چیزون مین سے کھاؤ اور
لِلّٰهِ، (لبقرہ - ۲۱)	خدا کا شکر کرو،
فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا	تو خدا نے تم کو جو حلال اور پاک چیزین
طَيِّبًا وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ	روزی کین، اُن کو کھاؤ اور اس کی
اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ، (نحل - ۱۵)	نعمت کا شکر کرو، اگر تم اُسی کو پوجتے ہو،

یہ مالی نعمت کا بیان تھا، اس کا شکریہ بھی خدا کو مال کر پال کے ذریعہ ادا کرین،

دنیا مین شکریہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی محسن نے جس قسم کا احسان ہمارے ساتھ کیا ہو اسی قسم کا احسان ہم اس کے ساتھ کرین، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کے ساتھ اس قسم کا کوئی شکریہ ادا نہین کیا جا سکتا، اس تیسری قسم کے شکریہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جو احسان فرمایا ہو، اسی قسم کا احسان ہم اس کے بندون کے ساتھ کرین، اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کے ان لفظون مین ادا فرمایا ہے،

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ	اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی

اِلَیۡکَ، (قصص - ۸) کی تو بھی بھلائی کر،

اسی کا نام خدا کو قرضہ دینا بھی ہے، ظاہر ہے کہ خدا نعوذ باللہ محتاج نہیں، کہ اس کو کوئی قرضہ دے خدا کو قرض دینا یہی ہے کہ اس کے ضرورتمند بندون کو یا قابلِ ضرورت کامون مین روپیہ دیا جائے ارشاد ہوتا ہے،

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا، (بقرہ ۳۲ و حدید ۲) کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دیتا ہے،

وَاَقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا، (حدید ۲ و مزمل ۲) اور خدا کو قرض حسنہ دو،

اِنۡ تُقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا، (تغابن ۲) اگر خدا کو قرض حسنہ دوگے،

خدا کو قرضِ حسنہ دینے کی جو تفسیر اوپر کی گئی، اس کی روشنی مین اس حدیث کو پڑھنا چاہئے،

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ قیامت کے دن خدا فرمائے گا' اے آدم کے بیٹے! مین بیمار پڑا تو تُونے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ کہیگا، اے میرے پروردگار، تو تو جہان کا پروردگار ہے، مین تیری بیمار پرسی کیسے کرتا، فرمائیگا، کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا فلان بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی پرسش نہ کی، اور اگر کرتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا، پھر خدا فرمائیگا اے آدم کے بیٹے! مین نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے مجھے نہین کھلایا، بندہ عرض کرے گا اے میرے پروردگار! تو تو سارے جہان کا رب ہے، مین تجھے کیسے کھلاتا، فرمائے گا، تجھے معلوم نہ ہوا کہ میرے فلان بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے اس کو نہین کھلایا، اگر تو اس کو کھلاتا تو اسکا بدلہ آج میرے پاس پاتا، اے آدم کے بیٹے! مین نے تجھ سے پانی مانگا تو تو نے مجھے پانی نہین

پلایا، بندہ کہیگا، اے میرے پروردگار تو تو سارے عالم کا پروردگار ہے، مین تجھے کیسے پانی پلاتا، فرمائے گا، میرے فلان بندہ نے تجھ سے پانی مانگا، تو نے اس کو نہین پلایا، اگر تو اس کو پلاتا تو آج تو اس کو میرے پاس پاتا[1]"

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ خدا کی دی ہوئی نعمتون کا جانی اور مالی شکریہ ہم کو کس طرح ادا کرنا؟ اور اس کا قرض ہم کو کیونکر اتارنا چاہئے،

اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتون کے شکر ادا کرنے کا بار بار تقاضا اس لئے بھی کیا ہے کہ ہم یہ نہ سمجھنے لگین کہ خدا کے فضل و کرم کے سوا ہم ان نعمتون کا کوئی استحقاق خود بھی رکھتے تھے، حالانکہ اُن کے لئے نہ کوئی ہمارا خاندانی استحقاق تھا، نہ کوئی ہمارا ذاتی علمی یا عملی، جو کچھ ملا اس کے فضل و کرم سے ملا اور جو کچھ ملیگا وہ اسی کی عطا اور بخشش ہوگی، انسان اپنی روز مرہ کی متواتر بخششون کو جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہین، دیکھ کر، اور اُن کے دیکھنے کا عادی ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ کی یہ کوئی بخشش نہین، بلکہ فطرت کی عام بخشش ہے، جس کے شکریہ کی کوئی ضرورت نہین، مگر خوب سمجھنا چاہئے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے کفر اور الحاد کی کونپلین نکلتی ہین، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک مین اپنی ایک ایک عنایت اور بخشش کو گنوایا ہے، اور اس پر شکر ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے، تاکہ ربوبیتِ الٰہی کا یقین اس کے ایمان کے بیج کو سیراب کرے اور بارآور بنائے،

دولت و نعمت پانے کے بعد انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ عام انسانون سے کوئی بلند تر ہی اور جو اُس کو ملا ہے وہ اس کا خاندانی حق تھا، یا اس کے یہ ذاتی علم و ہنر کا نتیجہ تھا، جیسا کہ قارون نے

---

[1] صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض،

کہا تھا یہی غرور ہے، جو ترقی کر کے بخل اور ظلم کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی، اور ارشاد ہوا،

وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ، (حدید-۳)	(اور تاکہ) جو خدا نے تم کو دیا، اس پر اتراؤ نہیں، اور اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا، جو خود کنجوس ہیں، اور لوگوں کو بھی کنجوس بننے کو کہتے ہیں، اور جو (اللہ کی بات سے) منھ موڑے گا، (تو اللہ کو کیا پروا) وہ تو دولت سے بھرپور اور حمد (یعنی حسن و خوبی) سے مالا مال ہے،

وہ اپنی ذات سے نہ تو انسانوں کی دولت کا بھوکا ہے، کہ وہ تو غنی ہے، اور نہ اُن کے شکرانہ کی حمد کا ترسا ہے کہ وہ تو حمید یعنی حمد سے بھرا ہوا ہے،

خدا نے انسانوں پر جو توبرتو نعمتیں اتاری ہیں، اور اپنی لگاتار بخششوں سے ان کو جو نوازا ہے، اس سے یہی مقصود ہے کہ وہ اپنے اس محسن کی قدر پہچانے، اس کے مرتبہ کو جانے، اس کے حق کو مانے، اور اس کی نعمت و بخشش کا مناسب شکر اپنے جان و مال و دل سے ادا کرے،

وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ، (انفال-۳)	اور اُس نے تم کو پاک چیزیں روزی دیں تاکہ تم شکر کرو،

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

(نحل ۔ ۲)

اور اسی نے سمندر کو تمہارے بس میں کر دیا کہ تم اس سے تازہ گوشت (مچھلی) کھاؤ اور اس سے آرائش کی وہ چیز نکالو جس کو تم پہنتے ہو، (یعنی موتی) اور تم جہازوں کو دیکھتے ہو کہ وہ اس میں پانی کو پھاڑتے رہتے ہیں، اور تاکہ تم خدا کی مہربانی ڈھونڈو اور تاکہ شکر کرو،

كَذٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ، (حج ۔ ۵)

اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے بس میں کر دیا کہ تم شکر کرو،

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ،

(قصص ۔ ۷)

اور اس کی رحمت سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے رات اور دن بنایا کہ تم (رات کو) آرام اور (دن کو) اس کے فضل و کرم کی تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو،

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ ان ساری نعمتوں کا منشا یہ ہے کہ بندہ اپنے آقا کو پہچانے اور دل سے اس کے احسان کو مانے، لیکن گنہگار انسان کا کیا حال ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ (یونس-۶)

اللہ نے انسانون پر بڑے بڑے فضل کئے، لیکن ان مین سے بہت کم شکر کرتے ہین،

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (اعراف-۱)

اور ہم نے تم کو زمین مین قوت بخشی، اور اس مین تمھارے لئے بسر اوقات کے بہت سے ذریعے بنائے، تم بہت کم شکر کرتے ہو،

ایک موقع پر تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس ناشکری پر پُر محبت غضب کا اظہار بھی فرمایا،

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ، (عبس-۱) مارے جائیو، انسان کتنا بڑا ناشکرا ہے"

شکر کے باب مین ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہین کہ ہم نے زبان سے الحمد للہ پڑھ دیا، تو مالک کا شکر ادا ہو گیا، حالانکہ یہ صحیح نہین ہے شکر در اصل دل کے اُس لطیف احساس کا نام ہے، جس کے سبب سے ہم اپنے محسن سے محبت رکھتے ہین، ہر موقع پر اس کے احسان کا اعتراف کرتے ہین، اور اُس کے لئے سراپا سپاس بنتے ہین، اور کوشش کرتے ہین کہ ہم اس کو خوش رکھ سکین اور اس کی فرمائشون کو پورا کرتے رہین، اگر ہم صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کرین لیکن دل مین احسان مندی اور منت پذیری کا کوئی اثر اور کیف نہ ہو، اور اس اثر اور کیف کے مطابق ہمارا عمل نہ ہو، تو ہم اس محسن کی احسانمندی کے اظہار مین جھوٹے ہین، اور وہ شکر خدا کی بارگاہ مین قبول نہین، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو اپنے پے در پے احسانات

سے جس طرح نوازا، اس کے بیان کرنے کے بعد اُن کو خطاب کرکے فرماتا ہے،

اِعْمَلُوْٓا آلَ دَاوٗدَ شُکْرًا ،	اے داؤد کے گھر والو، شکر ادا کرنے
(سبا-۲)	کے لئے نیک عمل کرو،

اس آیت پاک نے بتایا کہ شکر کا اثر زبان تک محدود نہ ہو، بلکہ عمل سے بھی ظاہر ہونا چاہیئے، اسی لئے حضرت سلیمانؑ خدا سے دعا کرتے ہین،

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ	اے میرے پروردگار، مجھے نصیب کر
نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ	کہ مین تیرے اُس احسان کا جو تو نے
وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ	مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا ہے
صَالِحًا تَرْضٰهُ ،	شکر کرون اور وہ نیک کام کرون
(نمل-۲)	جو تجھے پسند ہو،

اس دعا مین بھی یہ اشارہ ہے کہ شکر مین شکر کے دلی جذبہ کے ساتھ اسی کے مطابق اور مناسب نیک عمل بھی ہو،

دل مین یہ بات آتی ہے کہ خدا نے اپنے شکر گذار بندون کے حق مین جو یہ فرمایا ہے کہ وہ جیسے جیسے شکر کرتے جائین گے مین اُن کے لئے اپنی نعمتون کی تعداد اور کیفیت بھی بڑھاتا جاؤنگا اس کی تاویل یہ ہے کہ بندہ جیسے جیسے مالک کے شکر کے لئے اپنے عمل مین سرگرم ہوتا جاتا ہے اس کی طرف سے شکرانہ عمل کی ہر نئی سرگرمی کے جواب مین اس کو نئی نئی نعمتین اور عنایتین ہوتی جاتی ہین، اسی لئے فرمایا،

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ	اگر تم شکر ادا کروگے تو مین تم کو اور بڑھاؤنگا،
وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ (ابراہیم-۲)	اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب بڑا ہی سخت ہے،
كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَنْ شَكَرَ (قمر-۲)	ہم اسی طرح اسکو جزا دیتے ہین جس نے شکر کیا،
وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ ۔ (آل عمران-۱۵)	اور ہم شکر کرنے والوں کو جزا دینگے،

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے دل مین ایک شکری کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دین و دنیا مین بھلائی کے لئے اس کو کسی اور تنبیہ کی ضرورت نہ ہو، وہ خدا کی نعمتون کی قدر جانکر اس کو مانیگا اور اس کے حکمون پر چلے گا اور اس کے بندون کے ساتھ شکرانہ مین بھلائی کرے گا، اور خود بندون کے احسانات کے جواب مین بھی ان کے ساتھ نیکی اور خیرخواہی کرے گا، بلکہ آنحضرت صلعم نے خود آپس مین ایک انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ شکرگذاری کے جذبہ کو اللہ تعالیٰ کے احسانات کی شکرگذاری کا معیار مقرر فرمایا ہے، ارشاد ہوا مَنْ لَّا يَشْكُرِ النَّاسَ لَا يَشْكُرِ اللهَ (ترمذی کتاب البرّ والصلۃ) یعنی جو انسانون کا شکر ادا نہ کرے گا، وہ خدا کا بھی شکر ادا نہ کرے گا، اس حدیث کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ جو انسانون کے احسانون کا شکریہ ادا نہ کرے گا تو خدا بھی اپنے احسانون کا شکریہ اس سے قبول نہ فرمائے گا،

خاتمہ

کتاب کی پانچوین جلد جو عبادات کے مباحث پر مشتمل تھی ختم ہوگئی، ان صفحات مین آنحضرت صلعم کی اُن تعلیمات کا بیان تھا جو عبادات کے باب مین آپنے فرمائی ہین، ان تعلیمات کے ایک ایک حرف پر غور کیجئے کہ انھون نے وہم پرستیون اور غلط فہمیون کے کتنے تو بر تو پردے چاک کر دیئے اور عبادت جو ہر مذہب کا اہم جز رہے، اس کی حقیقت کتنی واضح کردی، عبادات کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھائے، اور آپنے وہ انسانون کو بتائے، وہ کتنے مکمل اور ان مین کا ایک ایک آئین آپ کے عمل اور قول کی سند سے کس قدر متعین اور مفصل اور دین و دنیا کی مصلحتون اور فائدون پر مشتمل ہے اور آپنے اُن کے ذریعہ انسانی دلون کی کمزوریون اور روح کی بیماریون کا کس طرح علاج فرمایا ہے،

آنحضرت صلعم کے پیغمبرانہ امتیازات کی کوئی حد نہین ہے، اور ان ہی مین سے ایک یہ ہے کہ آپکی ہر تعلیم جس مین عبادت بھی داخل ہے، عملاً صاف، واضح اور متعین ہے، اور زمانۂ مابعد مین انسانی تاویلات کی آمیزش اور قیاس آرائیون سے مبرا ہے، اور اس کا اس طرح ہونا اس لئے ضروری تھا کہ اس پیم

نوعِ انسان کی پیغمبرانہ تعلیم کے درس کا خاتمہ ہوا ہے، اس لئے اس کے ہر پہلو کو ایسا واضح ہونا چاہئے تھا کہ وہ پھر کسی پیغمبر کی آمد اور تشریح و توضیح کی محتاج نہ رہے، نبوت و رسالت کے آخری معلّم نے (خدا اُن پر اپنی رحمتیں اور برکتیں اتارے) اس فرض کو اس خوبی سے انجام دیا جس سے زیادہ کا تصور نہیں ہوسکتا،

صلوات اللہ علیہ وبرکاتہ،

مغفرت کا طلبگار

سید سلیمان ندوی

۱۲ر جمادی الثانی ۱۳۵۴ھ



سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جسکا نام سرعنوان ہی مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کیساتھ مرتب کیا گیا ہی،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہی جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہی، دوسرے حصہ میں تکمیل دین تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہی، تیسرے حصہ میں آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہی، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہی جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہی، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہی جو آپکے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کیگئی ہی کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں جو آپکے ہاتھ میں ہی عبادات کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہی، اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہی،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلاں ستے تقطیع خورد صہ روپیہ حصہ سوم تقطیع کلاں سے روللعہ تقطیع خورد معہ روصہ، حصہ چہارم تقطیع کلاں مے روسے تقطیع خورد معہ روصہ، حصہ پنجم تقطیع کلاں صہ روللعہ تقطیع خورد صہ، روپیہ

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

(طابع و ناشر محمد اویس وارثی)